جدید اردو افسانے
ترتیب
مشرف عالم ذوقی

جدید اردو افسانے

آدان پردان

جدید اردو افسانے

ترتیب

مشرف عالم ذوقی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ISBN 978-81-237-5313-3

پہلا اردو ایڈیشن: 2008 (ساکا 1929)

Jadeed Urdu Afsane (Urdu)

قیمت: 110.00

ناشر: ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

نہرو بھون، 5، انسٹیٹیوشنل ایریا، فیس-II

وسنت کنج، نئی دہلی 110070

فہرست

پیش لفظ

سب سے پہلے نیشنل بک ٹرسٹ کا شکریہ ادا کروں، جس نے اردو کی نئی کہانیوں کے انتخاب کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ یقیناً، یہ ایک ایسا مشکل ترین کام تھا، جس سے گزرنا لوہے کے چنے چبانا تھا۔ اس سے پہلے بھی اردو میں منتخب افسانوں کے نام پر درجنوں کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں لیکن افسانوں کے انتخاب میں، جس کتاب کی پزیرائی سب سے زیادہ ہوئی، اُس کا سہرا اطہر پرویز (علیگ) کے سر بندھا۔

یہ میری جانب سے ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔ میں نہیں جانتا، میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ کام پوری ذمہ داری سے ادا کیا ہے، یعنی جس یقین کے ساتھ مجھے یہ کام سونپا گیا۔

1970 کے بعد اردو کہانی میں جو نئے موڑ آئے، میں اُسے ترقی پسند تحریک سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہوں کیونکہ نئے لکھاڑی اپنی اپنی شناخت کے لئے ادب کی نئی نئی زمینیں تلاش کر رہے تھے۔ یہ وہ عہد تھا، جب اردو ادب میں ایک ساتھ کئی تحریکیں شامل ہو گئی تھیں۔ کوئی ترقی پسندی سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ لوگوں نے نعرہ بلند کیا کہ اب پریم چند کو ریجکٹ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ کچھ لوگ جدیدیت کے دھارے کی طرف مڑ گئے — کچھ روایتی اسلوب پر قائم تھے۔ کچھ 'اساطیر' میں اُلجھ گئے تو کچھ تجریدی کہانیوں میں، نئی کہانیوں کا عکس تلاش کر رہے تھے۔ بہر کیف، یہ کہنا حقیقت پر مبنی نہیں ہوگا، کہ اس 'توڑ پھوڑ' سے ادب کا زیاں ہوا۔ بلکہ میں تو یہ مانتا ہوں کہ اس سے اردو ادب کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا— 1970 کے بعد کئی اہم نام ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس انتخاب کے سفر کی شروعات ذکیہ مشہدی کی کہانی سے کی گئی ہے اردو کہانی آج کہاں ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ مجموعے میں شامل کہانیوں کے حوالے سے اس کی ایک مختصر سی جھلک آپ کو دکھاتا چلوں۔

بات اُداس کرنے والی ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔ ہندوستان میں اردو فکشن کا زوال

آچکا ہے۔ جو افسانہ نگار 'قد آور' بنا کر اردو کے نقادوں کے ذریعے پیش کئے گئے، اصل میں وہ اتنے پستہ قد ہیں کہ اُن کے ادب پر بات کرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اردو فکشن کو زوال کے نزدیک پہنچانے کا سہرا، ایسے ادیب اور مدیر حضرات کے سر بھی جاتا ہے جن کے بارے میں یہ رائے عام ہے کہ 24 گھنٹے میں 20 گھنٹے وہ صرف پڑھنے اور لکھنے میں گزارا کرتے ہیں۔ سچ جانئے کہ آپ تیس مار خاں کیوں نہ ہوں، لیکن آپ فکشن کے معیار کا کوئی 'ذاتی پیمانہ' ایجاد نہیں کر سکتے — ہمارے یہاں اس 'ذاتی پیمانے' نے پہلے لکھنے والوں کی غیرت خریدی پھر اردو فکشن کو ہی سرِ بازار ننگا کر دیا۔ المیہ یہ بھی ہے کہ 2000 کے بعد اردو میں نئی نسل کا دور تک پتہ نہیں ہے اور نئے لکھنے والے ہندی اور دوسری صوبائی یا علاقائی زبانوں کی طرف رجوع کر چکے ہیں۔

• پاکستان میں رہنے والوں کو میری اس بات پر حیرت ہوسکتی ہے، لیکن نئی نسل کا گم ہو جانا ہندوستان میں اردو زبان کے لئے اب ایک بھیانک سچ بن چکا ہے۔ بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی — ایک بانسری والا ہے، جو بانسری بجاتا ہوا، گاؤں کے سارے چوہوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ بانسری والا دوبارہ آتا ہے۔ بانسری بجاتا ہے۔ اس بار اس کے پیچھے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی فوج ہوتی ہے۔ وہ ان بچوں کے ساتھ پہاڑی کے عقب میں اُتر کر غائب ہو جاتا ہے۔

اس قصے کو اردو کے ساتھ جوڑیئے تو بانسری والا پہلے اردو زبان کو لے گیا اور اس کے بعد نئی نسل کو — تقسیم کے ناسور نے اردو کو بھی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ شیریں زبان اردو روزی روٹی، روزگار سے اپنا رشتہ منقطع کر کے حاشیہ پر پھینک دی گئی۔ اردو روز بروز اپنوں سے دور ہوتی چلی گئی۔ آزادی کے 60 برسوں میں یہ زبان ہندوستان میں صرف اپنا مرثیہ لکھنے کے لئے زندہ رہ گئی تھی، یا دوسرے لفظوں میں — اردو شاعری، یا پھر کسی حد تک فلموں کی زبان بن گئی تھی — لیکن دیکھتے ہی دیکھتے فلمی زبان کا چلن بھی بدلا — پہلے ہندوستانی زبان اور اب کا نئے، کمپنی، سے منا بھائی ایم بی بی ایس، تک ایک ٹھیٹ دیسی زبان — اور ایسی نازک صورت حال میں اردو، اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے جدوجہد کرتی رہی اور اس مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں یہ آج بھی زندہ ہے تو یہ کم بڑی سچائی نہیں ہے۔

لیکن کیا اتنا کافی ہے کہ ایک بڑی زبان نے کسی طرح سسکتے سسکتے اپنے آپ کو زندہ

رکھا ہے۔ ایک تلخ سچائی یہ ہے کہ 1990 کے بعد اردو میں نئی نسل کے آنے کی رفتار رُک گئی ہے۔ فکشن کے نئے دستخط ادب میں ناپید ہیں۔ پرانے دستخط اور کم و بیش جنہیں آج بھی نوجوان قلم کار کہہ کر پیش کیا جارہا ہے، ان میں سے زیادہ تر لوگ پچاس نہیں بلکہ ساٹھ سے زیادہ عمر گزار چکے ہیں۔ تادم تحریر میں خود بھی عمر کی بیالیس بہاروں اور بیالیس خزاؤں کا حساب لے چکا ہوں اور آپ جانئے، کہ منٹو تو اس عمر میں اپنے شاہکار چھوڑ کر رخصتی کا پروانہ بھی لے کر آ گیا تھا — اردو ادب میں اس سے زیادہ تاریکی کا، اس سے قبل کبھی احساس نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے 60 برسوں میں اردو مسلسل اپنی شناخت کے لئے لڑتی رہی۔ تقسیم، فرقہ وارانہ فساد اور گجرات سے پیدا شدہ سچ، اسی شناخت کی شاخیں تھیں۔ عرصہ پہلے 'شفق' نے اسی موضوع کو لے کر ایک کہانی لکھی تھی — شناخت۔ یہ آزادی کے بعد اُبھرے ہولناک سچ سے پیدا ہونے والی کہانی تھی۔

آزادی کے بعد کا ہندوستان، فساد اور دنگوں کی نئی نئی کہانیاں رقم کر رہا تھا۔ اردو افسانہ نگار خوفزدہ تھا۔ 1936 کی ترقی پسندی کے اظہار میں دقت پیش آرہی تھی — زمین گرم اور بارودی ہو چکی تھی۔ 'انگارے' کا عہد ختم ہو چکا تھا۔ ڈرے سہمے تخلیق کار نے لکھنا چاہا تو جدیدیت کے علاوہ کوئی روشنائی میسر نہ تھی۔ آپ مانیں نہ مانیں، نقاد تسلیم کریں نہ کریں لیکن جدیدیت کی پیدائش اسی پُرآشوب موسم میں ہوئی تھی۔ خوف کی سرزمین، وحشت کے سائے، دہشت کا پس منظر: کل ملا کر مجموعی فضاء ایسی تھی کہ تحریر پر نئے اور جدید الفاظ حاوی ہوتے چلے گئے۔ یعنی جدیدیت ایک ایسے خوفناک اندھیرے سے برآمد ہوئی، جہاں ڈر تھا — کہ لفظوں کو زبان مل گئی تو اپنی آزادی کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نئے ماحول میں اردو لکھنے والوں کے معنی بھی بدلے تھے۔ نئے ماحول میں سیکولرزم اور لبرلزم کی ہوا اس شدت سے چلی کہ پتہ بھی نہیں چلا — تب تک نئی آزادی میں پرورش پانے والی نئی تہذیب کے بطن سے خوفزدہ علامتیں جنم لے چکی تھیں۔

دیکھا جائے تو یہ اردو کا سنہرا عہد تھا۔ اردو تحریر میں 'مسائل' کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ لکھنے والوں کا ایک لمبا قافلہ تھا۔ لکھنے والوں پر یعنی جدیدیوں پر سب سے بڑا الزام یہ بھی لگایا گیا کہ قاری گم ہو گیا — لیکن اردو قاری کے گم ہونے کے باوجود لکھنے والوں کی قطار میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس عہد نے کئی بڑے نام دیئے۔

1980 کے بعد بیانیہ کی واپسی کا ڈھول زور زور سے پیٹا گیا۔ ایک بار پھر ملک کے حالات بدل چکے تھے۔ ادب تو سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ بدلے ہوئے حالات کا تقاضہ تھا کہ جدیدیت کے خول سے باہر نکلا جائے اور ایک بار پھر ترقی پسند لفظوں پر بھروسہ کیا جائے۔ 80 کے بعد کا ادب اسی نفرت کی آندھی سے وجود میں آیا تھا۔ پاکستان، ہجرت اور فرقہ وارانہ فساد اور ان سے پستے ہوئے عوام پر عبدالصمد کا ناول ''دوگز زمین''، ''خوابوں کا سویرا'' ذوقی کا 'بیان'، 'مسلمان'، حسین الحق کا 'فرات' سامنے آچکے تھے۔ 90 اور 95 تک ان موضوعات پر اور بھی کئی کچی پکی تحریریں سامنے آئیں، لیکن ایک حقیقت اور بھی تھی کہ یہ تمام لکھنے والے وہی تھے جو ایک لمبے عرصے سے ادب لکھنے میں مصروف تھے۔ لیکن سوال تھا کہ نئی نسل کہاں ہے؟ کیونکہ اُس وقت تک مرحوم انور خاں، سلام بن رزّاق، علی امام نقوی، شوکت حیات، شفق جیسے تمام افسانہ نگاروں کو نوجوان افسانہ نگار کے نام سے ہی یاد کیا جارہا تھا۔

لکھنے والے اپنے عہد کے مسائل اور فرقہ وارانہ فسادات سے بھی متاثر تھے۔ پرانی الفی کے ختم ہوتے ہوتے مسلمان دہشت اور آتنک واد کا استعارہ بن چکا تھا۔ نئی نسل ہندوستان میں اپنا ملک، اپنی زمین تلاش کررہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے صورت حال مکمل طور پر بدل گئی۔ اردو میں لکھنے والا ادیب ذاتی انتشار اور بے چینی سے الگ اپنی شناخت اور حب الوطنی کے جذبے میں غوطہ زن تھا۔ اپنا ملک جیسے گھنے کہرے میں گم ہوگیا تھا۔ اسلامی دہشت پسندی کا شورزوروں پر تھا۔ لکھنے والا اسی سیاسی منظرنامہ کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہوا اپنی تحریر کو دھاردار اور بامعنی بنانے میں مصروف تھا۔ کبھی ادب کمزور پڑا، کبھی قلم اور اسی کے ساتھ اردو میں نئی نسل کا آنا بند ہوگیا۔ زیب اختر، شبین حیات، ترنم ریاض، صغیر رحمانی، غزال ضیغم، دیکھتے ہی دیکھتے لکھنے والوں کا ایک مختصر سا کارواں ہندی کی طرف ہجرت کرگیا۔ یہ لکھنے کی مجبوری سے زیادہ اپنی بات زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی مجبوری بھی تھی۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اب بھی خوش فہمیوں کے جنگل میں جی رہے ہیں کہ زبان مری نہیں ہے۔ لیکن سوال ہے زبان ہے کہاں؟ اردو محض چند اخبار اور چند اردو رسائل کے سہارے زندہ ہے۔ اس زبان میں لکھنے والا کسی روزگار کی امید نہیں کرسکتا۔ اپنے لفظوں کی قیمت نہیں وصول کرسکتا۔ لیکن ایک حقیقت اور بھی ہے۔ گہری ناامیدی، نہ ختم ہونے والی

تاریکی کے باوجود، ہم نے امید اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ ہماری امید کا مرکز ہے عام آدمی جو کسی بھی مذہب کسی بھی علاقے اور کسی بھی زبان کا ہو سکتا ہے۔ ''شیریں زباں۔ اس زبان کو مرنا نہیں چاہئے — '' دوسری اہم بات یہ کہ اردو کو ہندی جیسی راشٹریہ زبان اور ہندی کے تمام لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہے۔ وہ لوگ ہماری زبان کے لئے مسلسل اپنی طرف سے کوئی نہ کوئی جنگ لڑتے رہتے ہیں۔

اب ذرا اردو کی سیاسی صورتحال سے باہر نکل کر کہانی کی طرف واپس آتے ہیں۔ 1990 سے 2007 کا سفر، اردو کہانی کے لئے ایک 'تاریخی سفر' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ملک کی صورتحال کے بد سے بدتر ہونے کے ساتھ ساتھ، اردو کہانی بھی ڈری اور سہمی نظر آنے لگی تھی۔

اردو کبھی بھی تقسیم کی ذمہ دار نہیں رہی۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد اردو پر فرقہ واریت کا الزام بھی لگا اور اردو کو تقسیم کی ذمہ دار آنکھوں سے بھی دیکھا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شیریں زبان اردو، روزی روٹی سے کاٹ کر حاشیے پر ڈھکیل دی گئی۔ 60 برسوں کے سیاسی منظر نامے میں یہ زبان ایک ڈری سہمی ہوئی زبان بن گئی۔ رتھ یاتراؤں، بابری مسجد شہادت سے لے کر گجرات قتل عام سے پیدا شدہ بھیانک صورتِ حال کا جائزہ لیجئے تو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا۔ رتن سنگھ اور جوگندر پال جیسے سینئر افسانہ نگاروں کا تذکرہ چھوڑیے تو زیادہ تر افسانہ نگاروں کے افسانے کے 'مسلمان' کردار اس قدر خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے کہ نئی کہانی کو لے کر از سرِ نو گفتگو کی ضرورت محسوس ہوئی۔

آپ کو تعجب ہوگا، تقسیم کے وقت اردو تو بالکل نہیں ڈری تھی — بقول کرشن چندر، پیشاور ایکسپریس یا اُس وقت کی زیادہ تر کہانیوں کا جائزہ لیجئے — 'ہندوؤں نے اتنا مارا۔ مسلمانوں نے اتنا مارا — ' اتنے مسلمانوں سے کٹی ہوئی ریل امرتسر اسٹیشن پر رُکی، تو دوسری جگہ یہی باتیں ہندوؤں کے بارے میں لکھی جا رہی تھیں۔

ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے والی کہانیاں بھی تھیں یعنی ایک دوسرے پر کٹر پن کا الزام لگانا۔ زخمی حالات یا مسائل سے آنکھیں بند کر لینے کی کارروائی — بربریت اور ہر طرح کے ظلم کی عکاسی کے باوجود اُس وقت کی کہانیاں خوفزدہ نہیں تھیں۔ یعنی پندرہ برسوں کا عرصہ اردو افسانہ نگاروں کے لئے ایسا بدترین عرصہ رہا ہے، جس کی نظیر ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔

افسانہ نگار تو خوفزدہ تھا ہی، ساتھ ہی اردو افسانہ نگاروں کی کہانیاں بھی خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

ساجد کی 'پناہ' سلام کی 'اندیشہ'، اشرف کی 'آدمی' شوکت حیات کی 'گنبد کے کبوتر'، ولی محمد چودھری کی 'دُھند میں گھر امکان'، علی امام نقوی کی 'ڈونگر باڑی کے گدھ'، خالد جاوید کی 'کوبڑا اور ہذیان'، طارق چھتاری کی 'باغ کا دروازہ' میں شامل زیادہ تر کہانیاں، احمد رشید کی 'وہ اور پرندہ' اسی طرح انجم عثمانی 'ابن کنول' امِ مبین، نور الحسنین، مظہر سلیم، اشتیاق سعید وغیرہ بھی ڈری سہمی کہانیوں کی 'جگالی' کر رہے تھے۔

کہانی کا خوفزدہ ہو جانا کسی بھی زبان کی تاریخ میں شاید پہلی بار ہوا تھا۔ یہ اردو میں ہوا جس کا ایک شاندار ماضی رہا تھا۔ چلئے ایک نظر 'داستانی عہد' پر بھی ڈالتے ہیں۔

اردو اپنے داستانی عہد سے ہی (1865 سے 1900) حال اور تاریخ دونوں ہی سے، ایک ساتھ روبرو ہوتی رہی۔ خواجہ ناصر فراق دہلوی کا زمانہ یاد کیجئے۔ 'لال قلعہ کی جھلک'، 'بیگموں کی چھیڑ چھاڑ' یا 'دِلّی کا اُجڑا ہوا لال قلعہ'، ان داستانوں کی زبان اور تاریخ کے چھینٹے تو دیکھیے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت، سلطنت اَودھ کی مغلیہ فوج کی کہانیاں 'گھنٹہ بیگ' کے نام سے لکھ رہے تھے اور 'دربار دہلی کی کنکوابازی' کے قصے سنا رہے تھے۔ میر باقر علی داستان گو سے اردو کی شروعاتی کہانیوں تک اپنے عہد اور حالات کی عکاسی ہوتی رہی۔ ان کہانیوں میں کہیں کہیں 1857ء کے غدر کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔

یہ تذکرے یوں ضروری تھے کہ اردو کہانیوں نے سامنے کے حالات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا۔ انگریزوں کے ظلم بڑھے، نفرت کی آندھیاں چلیں اور تقسیم کے سیاہ بادل لہرائے تو قلم کی نوک ذرا خاردار ہو گئی۔ عزیز احمد، قدرت اللہ شہاب، پریم ناتھ در، اُپیندر ناتھ اشک، راما نند ساگر، منٹو، احمد علی، عصمت چغتائی، اشفاق احمد، دیکھا جائے تو سارے ہی لہولہان تھے۔ تقسیم کی ہیبت ناکی، موت کی آندھی بن کر آئی تھی۔ سب سے بڑی بات 'قلم' ترقی پسند تھا۔ لکھنے والے، اپنے لکھنے پر محتاط تھے —

'خبردار! تحریر پر اثر نہیں پڑے۔'

شاید اسی لئے عزیز احمد کی 'کالی رات' ہو یا اشک کی 'ٹیبل لینڈ' شہاب کی 'یا خدا' ہو یا راما نند ساگر کی 'بھاگ ان بردہ فروشوں سے'، عصمت کی 'جڑیں' ہو یا منٹو کی 'کالی کہانیاں' سب کے موسم ایک تھے۔ سب کا درد ایک تھا۔ سب کی کہانیوں میں ہندو اور مسلمان ہلاک ہو رہے

تھے۔ لیکن سبھی کو راستے کی تلاش تھی۔ نفرتیں بھیانک نہیں ہوئی تھیں۔ کہانی خوفزدہ یا سہمی ہوئی نہیں تھی۔

فساد اس ملک کا چوتھا موسم رہا ہے۔ آزادی کے بعد بھی فساد ہوتا رہا۔ فرقہ وارانہ فساد، شیعہ سنی فساد — اردو قلم ایسے تمام حادثوں سے گزرتا رہا۔ ظاہر تھا، اپنے مسائل سے آنکھیں بند کر کے لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

بابری مسجد کی شہادت کے اردگرد حالت ذرا زہریلی ہوئی۔ حالات سازگار نہیں تھے۔ (یہ سب خود میری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے) بسوں میں اردو رسائل کو نفرت سے دیکھتی آنکھیں اردو شک کے دائرے میں تھی اور کہنا چاہئے، ان پندرہ سولہ برسوں میں یہ 'دائرے' کچھ زیادہ ہی سخت ہونے لگے۔ اردو نے ڈرنا شروع کر دیا تھا۔ اردو تخلیق کاروں نے ڈرنا شروع کر دیا اور ان سب سے زیادہ تکلیف دہ حقیقت یہ تھی کہ اردو کہانیوں نے ڈرنا شروع کر دیا تھا۔

"لڑکے کی مٹھی کا نشانہ اُسی کی طرف تھا۔ آخری لمحوں میں دوڑتے ہوئے اُس نے سوچا کہ بڑھ کر لڑکے کا ہاتھ تھام لے۔ رحم کی بھیک مانگے۔ اُس کو بتلائے کہ اُس کا تعلق مخالف جماعت سے نہیں ہے۔ اُس کا تعلق کسی شئے سے نہیں ہے۔ سوائے سانسوں کے — لیکن اس کا موقع نکل چکا ہے۔ بس سے اُس کے پرخچے اڑنے والے تھے۔"

—(شوکت حیات کی ایک کہانی سے)

زیب اختر، صغیر رحمانی اور شین حیات کی کہانیوں کا منظرنامہ بھی یہی ہے۔ خالد جاوید 'کوبڑا اور ہذیان' میں نئی علامتوں اور استعاروں کے ذریعے اسی دکھ یا بُرے موسم کا حال کہتے نظر آتے ہیں۔ ترنم ریاض گلوبل عہد کے خطرات کو محسوس کرتی ہوئی 'ساحلوں کے اُس طرف' جیسا شاہکار قلمبند کرتی ہیں۔ پھر اُنہی کے قلم سے اماں صاحب جیسی حسین اور بامعنی کہانی بھی جنم لیتی ہے۔ یعنی ایسی کہانیاں، بلامبالغہ جنہیں جھمپا لہری اور کرن دیسائی کی کہانیوں کے مقابلے فخر سے رکھا جاسکتا ہے۔ عذاب کے بُرے موسم کو خورشید اکرم بھی بھرپور توانائی کے ساتھ، اپنی کہانیوں حبس، مذبح کی بھیڑیں، میں فکر کی نئی آنچ کے ساتھ سامنے رکھتے ہیں۔ بیگ احساس کی زیادہ کہانیوں میں آج کے مسلمانوں کا درد جھانکتا ہے۔ بیگ احساس کی زیادہ تر کہانیاں ایسی دردمندی کی کہانیاں ہیں جن کے مطالعہ سے آج کے خطرناک ماحول میں سانس لیتے ہوئے مسلمانوں کا المیہ صاف طور پر نظر آجاتا ہے۔

علی امام نقوی کشمیر کو موضوع بنا کر 'بساط' جیسا ناول لکھتے ہوں یا سلام بن رزّاق 'شکستہ بتوں کے درمیان' یا 'شہر گریہ' جیسا افسانہ تحریر کرتے ہوں، سب جگہ یہی سہمے سہمے مسلمان آپ کے کردار ہیں۔ مظلوم، وقت کے ستائے ہوئے۔ 'دنگا سنسکرتی' اور گودھرا سے زخمی۔ سچ بولنے والے، کرشن جیسے لوگوں کی گنتی گنتے ہوئے۔ برکھادت اور راج دیپ سردیسائی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے — اسٹار پلس اور میڈیا کے کندھے سے خوش۔ اپنی 'موت' کچھ دن اور ٹالتے ہوئے۔ سہیل وحید، مظہر الزماں خاں، معین الدین جینا بڑے یا پھر انور قمر کی کہانی 'گردش زد' کا پُراسرار، خطرناک ماحول دیکھ لیجئے — آہستہ سُر میں کہنے والے طارق چھتاری جب 'باغ کا دروازہ' لکھتے ہیں، اس وقت بھی یہی ڈر ان کی کہانی کا 'محور' بن جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو کا سیاست سے بڑا عجیب رشتہ رہا ہے۔ شاید اسی لئے تقسیم کے وقت اردو بھی تقسیم کے لئے قصوروار ٹھہرائی گئی۔ اردو کے لئے اب ایک دوسرا مسئلہ پیش ہے — فساد اور گجرات کی کہانیوں سے اردو قلم کار باہر نکلنے کی تیاریاں تو کر رہا ہے مگر ایسا لگتا نہیں کہ مستقبل کے اندیشے اُسے اس دھند سے پوری طرح نکلنے میں کامیاب ہونے دیں گے۔ اردو کا قلم کار مختلف موضوعات کی دِشا میں بھٹک تو رہا ہے مگر یہ بھی دیکھنا ہے کہ قلم کار ہی کتنے بچے ہیں۔ ایک بھیانک صداقت اور ہے — اردو میں لکھنے والی ہندوؤں کی نسل اب پرانی پڑ چکی ہے۔ جوگندر پال، رتن سنگھ، آنند لہر جیسے نام کافی پرانے ہو چکے ہیں، اب ان کے بعد والی نسل اردو نہیں جانتی۔ کہتے ہیں زبان کسی مذہب، کسی قوم کی جاگیر نہیں ہوتی لیکن اردو کے ساتھ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ مسلمان ہی اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں اور ان میں سے ہی کچھ بچے ادب کے بحرِ ذخار میں کود پڑتے ہیں۔ اب مسلمان بھی نہیں پڑھتے اس لئے خوش فہمیاں بھی آہستہ آہستہ نا ختم ہونے والی دھند میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔

اردو فکشن کا نیا منظر نامہ تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناول لکھے تو جا رہے ہیں لیکن انتہائی غیر معیاری، جن پر گفتگو کرنا تضیع اوقات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ لیکن امید کا رشتہ ابھی ٹوٹا نہیں ہے۔ عبدالصمد، سلام بن رزّاق، علی امام نقوی، معین الدین جینا بڑے، بیگ احساس، خالد جاوید، خورشید اکرم، شوکت حیات، جابر حسین، غزال ضیغم، سہیل وحید، صغیر رحمانی، سید محمد اشرف، شموئل احمد، ترنم ریاض — یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم نے بڑی بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں۔ کاش! اشرف پھر سے ڈار سے بچھڑے اور لکڑ بگھّہ سریز، جیسی کہانیاں لکھنے لگیں — عبدالصمد سے ایک

بار پھر 'دوگز زمین' جیسے ناول کی امید ہے اور یقیناً یہ امید پوری ہوگی۔ سلام بن رزاق اور علی امام نقوی کی کہانیوں نے ہندی والوں کو بھی متوجہ کیا ہے۔ خالد جاوید اور صدیق عالم اپنی ہر نئی کہانی کے سامنے کامیابی کا ایک زینہ اور طے کیے جاتے ہیں۔ یعقوب یاور، سہیل وحید، یٰسین احمد کی کچھ کہانیوں نے تازگی کا احساس کرایا ہے۔ رفتار مدھم اور دھند تیز ہے۔ مایوسی کے گھنے جنگلوں کے درمیان امید کی شمع جلائے رکھنا ضروری ہے۔ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ۔

جو زرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

میں ہمیشہ سے آزادی کا قائل رہا۔ اس لیے ترتیب کے معاملے میں میں نے اسی آزادی کا فائدہ اٹھایا۔ کچھ کہانیاں تاخیر سے حاصل ہوئیں۔ اور میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا کہ اچھی تخلیق جس نمبر پر بھی ہو، اپنا لوہا منوا لیتی ہے۔ خاص کر انگریزی زبان میں شائع ہونے والے اس نوعیت کے مجموعے میں ترتیت اور عمر کا خیال تک نہیں رکھا جاتا۔

یہ انتخاب آپ کو کیسا لگا، آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

مشرف عالم ذوقی

D-304، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی ۔110031

فداعلی، کریلے اور اردو

— ذکیہ مشہدی

نوادرات کا وہ دلال پھر آیا تھا۔ سنگ مرمر کی جالی کے ڈیڑھ لاکھ لگایا گیا تھا۔ تفضل حسین راضی نہیں ہوئے۔ وہ ڈھائی سے نیچے اترنے کو تیار نہیں تھے۔ ابتدا تو چار سے کی تھی۔ عظمت رفتہ کے دام اب اور کتنے گریں گے۔

''ہائی پاپا!''

ان کی بڑی لڑکی سمیرہ ٹینس ریکٹ ہلا کر انہیں جدید سلام کرتی ہوئی گزر گئی۔ آج سنیچر کی شام ہے۔ سمیرہ ٹینس کھیلنے جاتی تھی اور وہاں سے سیدھی والدین کے یہاں آجایا کرتی تھی۔ اس کے شوہر اسی شہر میں کامیاب وکیل ہیں۔ دیر سویر وہ بھی آجائیں گے اور رات کا کھانا حسب دستور قدیم سب اکٹھے مل کر کھائیں گے۔ آج کل رونق میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سمیرہ کے دونوں بچے دلی سے گھر آئے ہوئے تھے جہاں وہ بورڈنگ اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ گرمی کی طویل چھٹیاں تھیں۔

''زینت آپ بڑی خوش قسمت ہیں۔'' سید تفضل حسین نے جو دوست احباب کے درمیان ٹوٹو حسین کہلاتے تھے اور اپنی اچھی صحت اور خوش وخرم زندگی کے سبب قابل رشک سمجھے جاتے تھے، بیوی کو مخاطب کر کے یہ جملہ کئی بار دہرایا تھا کیونکہ ان کی عمر کے زیادہ تر جوڑے انتہائی تنہا، بے زار اور بور ہو چکے تھے۔ خود ان کے اپنے دو بیٹے سات سمندر پار سے ٹیلی فون پر سنائی دینے والی آوازوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ پھر بھی زندگی میں چھل پہل پاتی تھی اور اس چھل پہل کا بڑا حصہ شہر میں سمیرہ کی موجودگی سے عبارت تھا۔ بڑھاپے میں میاں بیوی بالکل ہی اکیلے ہو جائیں تو یا تو ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے گزرتی ہے یا اس خوف میں کہ ایک مر گیا تو دوسرے کا کیا ہوگا۔ ویسے زینت حسین بھی ایک بڑی فعال خاتون تھیں۔ بہت سی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں جن میں اردو کی بقا وترویج کے لیے کام کر رہی ایک

انجمن کی سرپرستی بھی شامل تھی۔ انجمن ایک سنڈے اسکول چلاتی تھی جس میں بیک وقت پانچ سات طلبہ ضرور آجایا کرتے تھے۔ عموماً دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتے۔ انجمن کے اراکین پانچ دس پھر پکڑ لاتے۔ گرمی کی تعطیلات میں یہ تعداد کچھ بڑھ جاتی تھی اس طرح اوسط برقرار رہتا تھا۔ حال ہی میں ان لوگوں نے دکانوں، دوسری تنظیموں اور دفتروں وغیرہ کے بورڈ اور ناموں کی تختیاں اردو میں لگوانے کی مہم بھی چلائی تھی۔ اس میں زینت بیگم تندہی سے حصہ لے رہی تھیں۔ آج وہ ذرا دیر سے لوٹی تھیں اور منہ ہاتھ دھو کر سیدھی ڈائننگ روم میں آگئی تھیں۔

کھانے کی میز پر سمیرہ خانساماں کو چھیڑنے میں مصروف تھی جن کی بڑی روایتی چڑ تھی: کریلے، گرچہ وہ نہایت لذیذ قیمہ بھرے کریلے پکایا کرتے تھے۔

''ماشاء اللہ بال بچوں والی ہوگئیں سمیرہ بی بی۔ ہم اس ڈیوڑھی پر بڈھے ہو گئے مگر چھیڑنے سے باز نہیں آتیں۔'' فدا علی منمنائے۔

دونوں ٹین ایج بچے زور سے ہنسے۔ فدا علی کریلے۔ فدا علی کریلے۔ ارے ہم آپ کو چڑا نہیں رہے ہیں۔ ہم تو کریلے ادھر مانگ رہے ہیں۔

فدا علی کو معلوم ہے بچے کریلے قطعی نہیں کھاتے۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ اردو قطعی نہیں پڑھنا چاہتے، لاکھ بیگم صاحبہ کہیں۔ یوں تو سمیرہ بی بی نے ہی کون سی اردو پڑھ کے دی۔ مولوی صاحب رکھے گئے تو ان کی کرسی میں گوند انہوں نے لگایا۔ ڈونگے میں مینڈک کے بچے بند کر کے ڈونگا پیش کیا۔ مولوی صاحب کو ایک دن کھیر کھلائی گئی تو سمیرہ بی بی اور سیف بھیا نے ان سے کہا کہ کھیر بلی نے جوٹھی کر دی تھی اس لیے انہیں دی گئی ہے اور جو بھی ماسٹر صاحب اردو کے لیے رکھے گئے انہیں بھگا دیا۔ اب کبھی قرآن پڑھنا ہوتا ہے تو یا انگریزی ترجمہ پڑھتی ہیں یا ہندی۔ ارے فدا علی علم تو کسی بھی عمر میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ تم روز شام کو مجھ سے اردو پڑھا کرو۔ (انجمن کے اعداد و شمار میں اضافہ ہو جائے گا)

''ارے بھائی یہ انجمن محبان اردو کی طرف سے کارڈ آیا ہے۔ فراق پر سمینار کر رہے ہیں اور مشاعرہ۔''

تفضّل حسین کچھ دیر سے بانسری الگ ہی بجا رہے تھے۔

بے چارے محبان اپنے مستقل پروگراموں کے علاوہ کچھ اور بھی کرتے رہتے تھے۔ چھوٹے بڑے مشاعرے، سیمینار، جلسے۔ کبھی کبھی کسی کو پکڑ لاتے کہ اردو کے سیکولر کردار پر

تقریر کرے اور لوگوں کو یہ باور کرائے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور بدیسی تو قطعی نہیں۔ (''لے سنو! یہ بھی کوئی بتانے کی بات اے۔'' زینت کی ایک پنجابی دوست راجندر اہلوالیہ نے کہا تھا۔ راجندر غزلوں کی بڑی دلدادہ تھی۔ پنجابی نہ بولتی تو بڑی نفیس اردو بولتی۔ زینت کی انجمن کے پروگراموں میں ضرور آتی لیکن کلاس جوائن کرنے کو کہا تو کنی کاٹ گئی) پھر وہ بڑے طمطراق سے اپنی ان سرگرمیوں کی رپورٹ مقامی اردو اخباروں میں چھپوایا کرتے تھے۔ یہ اخبار تفضّل حسین کی قبیل کے لوگوں کے گھر عموماً مفت پہنچ جاتے تھے اور عموماً ایک نظر ڈالنے کے بعد ردی کی ٹوکری میں چلے جاتے تھے اور کبھی بغیر اس ایک نظر کے بھی۔ زینت کچھ استثنائی لوگوں میں سے تھیں۔ وہ اردو کے دو اخبارات قیمت دے کر منگاتی تھیں اور دوسرے لوگوں کو بھی ترغیب دیتی تھیں کہ وہ انہیں منگائیں۔ ''ارے بھائی اب اگر ہم بھی سرپرستی نہ کریں گے تو یہ بے چارے اخبار کہاں جائیں گے۔'' وہ انہیں پڑھتی بھی تھیں۔ کبھی کبھی ان میں ان کی جوانی کی تصویر کے ساتھ ان کی سماجی و ادبی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً معروف سماجی کارکن محترمہ زینت حسین نے فرمایا کہ...... زینت کے دونوں بیٹے جب یہاں تھے تو ممی کی اس احمقانہ فضول خرچی پر سخت ناراض ہوتے تھے۔

کئی بار تفضّل حسین نے بیوی کی حمایت کی تھی۔ ''صاحبزادے اپنی کمیونٹی کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے ملکی، سیاسی اور سماجی واقعات پر اپنی قوم کے ردعمل کا پتہ لگتا ہے۔ یہ چیزیں اکثر انگریزی اخبار کور نہیں کرتے اور پھر میاں اپنی زبان کو ان اخباروں نے زندہ رکھ رکھا ہے۔ دیہاتوں کے بہت سے خواندہ افراد انہیں پڑھتے ہیں۔ شہر کے کچھ مخصوص علاقوں میں بھی ان کی کھپت ہے۔'' نوجوان بیٹوں میں اپنی قوم اور زبان کے معاملات کی دلچسپی کا فقدان کیوں ہے اس کا تجزیہ تفضّل حسین نے نہیں کیا تھا۔ زبان اور قوم لازم وملزوم کیوں ہوگئی تھیں اس پر غور کرنے سے تو کچھ حاصل بھی نہیں تھا اس لیے کہ اب تو ہو ہی چکی تھیں محبان اردو خواہ کتنے ہی لوگوں کو بلا کر تقریریں کروائیں۔

''اے ہے فدا علی۔ تم بھی سٹھیا گئے ہو۔ کتنا کہا کہ نہ چڑو، ورنہ لوگ تمہیں چڑائیں گے۔ اب وہاں کہاں گھس گئے باورچی خانے میں۔ مٹھا کدھر ہے؟'' زینت نے پکار کر کہا۔

''کیوں بھائی چلوگے تم لوگ یا کوئی پروگرام ہے کل کا؟'' تفضّل حسین نے اس ساری ہڑبونگ میں آواز اونچی کر کے پوچھا۔

''چل سکتے ہیں۔ بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جائے گی۔'' علی نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

''فراق پر ہونے والے سیمینار میں کس سے ملیں گے آپ؟ زیادہ تر پاپا کے ساتھی ہوں گے یا کچھ چگی داڑھی گول ٹوپی والے مدرسہ نورالہدیٰ کے مولوی صاحبان۔ کتنے دن سے کہہ رہی ہوں کہ ساتھ چل کر پردے خرید لیجئے تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے ہیں۔'' شوہر کا جواب سنے بغیر سمیرہ نے ماں کو مخاطب کیا۔ ''آپ اس راجستھانی نمائش میں گئیں! راجستھان اور گجرات کے خانہ بدوشوں کی روایتی کڑھت کی بہت خوبصورت چیزیں آئی ہوئی ہیں۔ لکڑی کا سامان بھی ہے۔'' سمیرہ کو 'ایکٹنگ' کا اتنا ہی خبط تھا جتنا آج کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کے کسی بھی فرد کو۔ اس کا گھر مختلف ریاستوں کی روایتی آرائشی چیزوں، پردوں کشیدہ کاری اور فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔

سمیرہ خاموش ہو گئی۔ دل میں سوچا اب میں فراق کی ذاتی زندگی کے گوشوں میں جھانک کر کیا کروں گی۔ خیر پاپا کی دل شکنی نہ ہو۔ نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ ایسی ادب بے زار بھی نہیں ہوں۔ مشاعروں میں چلی ہی جاتی ہوں۔ مہدی حسن، غلام علی، نصرت فتح علی اور جگجیت سنگھ کے سارے کیسٹ میرے پاس موجود ہیں۔ ہاں اردو کو اوڑھنا بچھونا بناتی تو فری لانسنگ کر کے اتنا کما سکتی تھی کیا! شوہر سے الگ آج میری اپنی ہستی ہے اور آمدنی بھی۔ ویسے سارا کچھ دیا ہوا تو ممی پاپا کا ہی ہے۔ بڑے روایتی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود اعلیٰ درجے کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی۔ بڑے دور اندیش ہیں دونوں۔

زینت بیگم کی للکار پر فدا علی دوڑے چلے آئے تھے۔ نہایت ادب کے ساتھ انہوں نے کھانے کا آخری آئٹم پیش کیا۔ شاہی ٹکڑے۔ ''اب بیگم صاحبہ اس سے قبل کہ آپ کچھ بولیں ہم پہلے ہی بتا دیں کہ بھیا کی فرمائش پر بہت جلدی میں تیار کیے ہیں۔ ورنہ ہم تو 'پوٹین' بنانے جا رہے تھے۔ شاید شیرہ پوری طرح پیوست نہ ہوا ہو۔''

''شیرہ کیا نہ ہوا ہو؟'' فیض اور عالیہ نے بیک وقت پوچھا۔

''جذب نہ ہوا ہو کہہ رہے ہیں بھیا۔''

''ارے فدا علی۔ ایسی شیرے جیسی گاڑھی اردو مت بولا کیجئے۔ لایئے بڑھایئے قاب ادھر۔'' یہ علی تھے۔

''— نانی امی۔ ہمیں ایک ڈھیلا ٹپل اوور بن دیجیے جس میں کئی رنگوں سے جیومیٹریکل ڈیزائن بنے ہوئے ہوں۔''

زینت کا سولہ سالہ نواسہ فیض لاڈ سے کہہ رہا تھا۔ لان پر پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر زینت کی نٹنگ کی سبک سی ٹوکری رکھی ہوئی تھی جس سے رنگ برنگے اون کے لچھے جھانک رہے تھے۔ ایک غیر ملکی رسالہ بھی ان کے درمیان ٹھنسا ہوا تھا جس میں سوئٹر کے تازہ ترین ڈیزائن تھے۔ تپائی پر چائے کی ٹرے تھی۔ سامنے کرسی پر تفضل حسین جلوہ افروز تھے جنہوں نے اردو کا ایک خالص ادبی پرچہ کھول رکھا تھا۔

''یہ لیجئے زینت بیگم ایک اور نیا رسالہ۔''

''کیسا ہے؟''

''بہت اچھا۔ اس لیے بہت دن نہیں چلے گا۔''

''ان اردو والوں کو نہ اشتہار ملیں نہ قاری۔ چلیں گے کیا خاک۔''

''نانی امی۔ یہ اولمپک کا موٹف میرے سوئٹر میں ڈالئے گا۔'' نواسی نے فرمائش کی۔ وہ اس درمیان ڈیزائن بک اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی تھی۔ فیض نے نانا کے شانوں کے اوپر سے اچک کر اولمپک کا موٹف دیکھنا چاہا۔ اس کی نظریں رسالے کے سرورق پر چھپی بڑی سی تصویر پر پڑیں۔ ''یہ کون ہیں نانا ابی؟'' جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بہن کا منہ چڑایا۔ 'اولمپک کا موٹف سوئٹر پر بنوا کر اولمپک اسٹار ہی تو بن جاؤ گی'۔ دونوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ نکلے۔

تصویر علی سردار جعفری کی تھی۔

زینت اور تفضل حسین نے بیک وقت ٹھنڈی سانس لی۔ ایک دوسرے کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا۔ ان کے یہ بے حد عزیز 'گرینڈ چلڈرن' زیادہ تر انگریزی میں گفتگو کرتے تھے حتیٰ کہ نانی امی سے بھی۔ انہیں اطمینان تھا نانی اپنے وقت کی گریجویٹ ہیں۔ روانی سے بول نہ سکیں، سمجھتی تو آرام سے ہیں۔ اس لیے اردو بولنے کی ضرورت جسے وہ ہندی کہا کرتے تھے، بہت کم ہی پڑتی تھی، عموماً صرف فدا علی یا ویسے ہی کچھ دوسرے لوگوں سے بات کرتے وقت۔

تفضل حسین نے ہولے سے کہا: ''کیا آپ بھی یہی سوچ رہی ہیں زینت بیگم کہ غلطی ہم سے کہاں ہوئی ہے۔'' زینت کچھ نہیں بولیں۔ فراق والے سیمینار میں سمیرہ اور علی چلے تو گئے تھے واپس آ کر سمیرہ نے کہا۔ ''بہت چٹے۔''

''کیا مطلب؟'' زینت نے پوچھا۔

''ارے چٹ گئے مما اور کیا۔''

زینت کانوں سے ٹاپس اتارنے لگیں۔ ''جنے کیا کہہ رہی ہو۔'' حالانکہ مفہوم انہوں نے سمجھ لیا تھا لیکن انجان بن گئیں۔ علی کا کوئی کمنٹ نہیں تھا۔ داماد تھے اس لیے ساس سسر کا لحاظ کر رہے تھے۔ زینت نے ادبدا کر پوچھا تو بولے: ''ہاں امی بہت مزہ آیا۔ وشورنجن جی کی تقریر بڑی دلچسپ تھی۔ بڑی نفیس زبان بولتے ہیں۔''

بیڈروم میں سمیرہ نے کھنچائی کی۔ ''چاپلوس کہیں کے اور مکار بھی۔''

زینت فدا علی پر بہت ہی ناراض ہو رہی تھیں۔ ''کم بخت جھڑوس، گھنٹوں سے لا پتہ ہے۔ سودا لانے کو دے دیا بس ہو گئے غائب۔'' دراصل انہیں کہیں نکلنا تھا اور فدا علی ندارد تھے۔ سمیرہ اور علی تو اتوار کی شب کو چلے گئے تھے۔ بچوں کو زینت نے روک لیا تھا اس لیے بغیر کھانے کی ہدایات دیے باہر نہیں جانا چاہ رہی تھیں۔

''لگتا ہے بڑھاپے میں کہیں عشق لڑا رہا ہے صورت حرام۔''

سترہ سالہ عائشہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ممی کو ایتھنک چیزوں کا خبط ہے اور نانی امی کو ایتھنک الفاظ کا۔ زینت باوجود غصّے کے مسکراہٹ ضبط نہیں کر سکیں۔ اسی وقت دونوں شانوں سے زین کے بڑے بڑے مضبوط تھیلے لٹکائے ہانپتے کانپتے فدا علی نمودار ہوئے۔

''کہاں غارت ہو گئے تھے فدا علی۔ میں تو سمجھی تھی آج ضرور تم کسی موٹر ووٹر کے نیچے آ گئے۔''

''آ ہی جائیں تو بھلا ہو۔'' فدا علی بھی اپنی مالکن سے کم خراب موڈ میں نہیں تھے۔ ''گھنٹہ بھر سے سلمان میاں کی دکان پر کھڑے کھڑے، کھڑے کھڑے ــــ''

''کیوں اس سلمان کے بچے کا کیوں دماغ خراب ہوا۔''

''ارے بیگم صاحبہ آپ نے پرزہ دیا تھا اردو میں لکھ کے۔ کافی دیر وہ اس پھیرے میں رہے کہ کوئی اردو جاننے والا آئے تو پڑھوائیں۔ دسیوں گاہک آ کے نکل گئے۔ آخر کو خود ٹو، ٹو کر کے پڑھا۔ کچھ تو ہم نے بتایا اندازے سے کہ کیا لکھا ہوگا۔ کیا آنا ہے۔ ہم بہت بگڑے۔ سر وہ جب اتنا پڑھ ہی لیتے ہو تو پہلے کوشش کرتے۔ ناحق میں کھڑا رکھا۔''

زینت سخت حیران ہوئیں۔ ''پرچہ تو ہمیشہ اردو میں ہی جاتا رہا ہے۔''

''دکان پر بڑھو بیٹھتے تھے، وہ ٹہل گئے۔ وہی پڑھتے تھے اردو کا پرچہ۔ سلمان میاں نے کہلوایا ہے اگلی بار ہندی میں لکھ کر بھیجیں بیگم صاحب۔ نہیں تو پھر فون پر لکھوا دیں۔ دکان میں فون لگ گیا ہے۔ یہ لیجئے نمبر۔'' پچھلے دنوں زینت حیدر آباد گئی تھیں۔ وہاں دولہا میاں ایک اردو کا خط لیے گھوم رہے تھے۔ ایک دوست کی ماں نے نیک خواہشات بھیجی تھیں۔ ''آنٹی اسے پڑھ دیجئے۔''

''کیوں؟ تم خود کیوں نہیں پڑھ رہے؟''

''اردو ہمیں نہیں آتی۔''

''شرم آتی ہے کہ وہ بھی نہیں آتی؟''

دولہا میاں ہی ہی ہی کرتے ہوئے بھاگ نکلے۔ وہ پیشے سے انجینئر تھے۔ کونونٹ ایجوکیٹڈ بلکہ آج کل کی اشتہاری اصطلاح میں ''کونونٹڈ'' بھی نہیں تھے کہ منہ میں زبان انگریزی ہو۔ پھر بھی — زینت دوسرے ہی دن سلمان میاں کی دکان پر محبانِ اردو میں سے ایک محب کو لے کر پہنچ گئیں۔

''اگلی بار میں آؤں تو بورڈ پر ''انورادھا اسٹور'' اردو میں بھی لکھا ہوا ملے۔'' انہوں نے سلمان میاں سے ذرا اختیار کے ساتھ بات کی۔

''بیگم صاحبہ۔ ہم نے مصلحتاً نام رکھا انورادھا اسٹور۔ اب آپ اردو میں نام لکھوا کر ساری مصلحت کا پٹرا کرائیں گی۔''

''آپ کی مصلحت ہم سمجھ رہے ہیں۔ انورادھا بہت خوبصورت نام ہے۔ اپنی دھرتی سے جڑنا بہت خوبصورت بات ہے لیکن اپنی زبان کیوں بھول رہے ہیں آپ۔ تھوڑی سی مشق کر ڈالیے کہ اردو میں کوئی پرچہ آئے تو گاہک کھڑا نہ رہے۔ اور دکان کا بورڈ کل ہی — دیکھئے جو خرچ آئے گا وہ ہم دیں گے —''

''دیکھا جائے گا بیگم صاحبہ۔ آپ سامان کی فہرست پڑھئے۔''

''سامان تو کل ہی فدا علی لے گئے ہیں۔ یاد نہیں رہا کیا؟ ہم تو صرف یہی کہنے آئے تھے۔''

''صرف یہ کہنے؟'' حیرت سے سلمان میاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''خیر آپ نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ لیجئے الائچیاں۔'' ''شکریہ۔'' زینت نے الائچیاں لے لیں۔ ساتھی محبِ اردو نے کہا— ''زبان تو بڑی خوبصورت بولتے ہیں۔''

''ہاں زبان پر رہ جائے گی اردو۔ پرنٹ مر رہا ہے۔ سو دو سو برس بعد کچھ لوگ یوں ہی پڑھا کریں گے اسے جیسے پالی پڑھتے ہیں یا سنسکرت۔'' یکا یک زینت کو بڑی شرم اور خفت کا احساس ہوا۔ سمیرہ اور علی کی روزمرہ گفتگو اردو میں ہی ہوتی تھی۔ رسم الخط سے نابلد تو نہیں تھے لیکن روانی سے لکھنا پڑھنا بس میں نہیں تھا۔ ادب سے دلچسپی مشاعروں تک محدود تھی۔ سمیرہ مارے باندھے ساس کو اردو میں خط لکھ لیتی تھیں۔ وہ بھی اب فون پر گفتگو ہونے کی وجہ سے بہت کم ہو گیا تھا۔ ٹی وی نے پڑھنے کی عادت چھڑائی اور یہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں ٹیلی مواصلات کا سلسلہ بھی خط لکھنا چھڑا رہا ہے۔ عائشہ اور فیض ماں باپ سے چار جوتے آگے۔ یہ تو اردو بولتے ہی بہت کم ہیں۔ چراغ تلے اندھیرا۔ زینت نواسی نواسے کے پیچھے پڑ گئیں۔

''نانی اماں۔ پہلے تو آپ ایسا کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہندی، ارے اردو بولتے تو ہیں ہم۔''

''ذرا زیادہ بولا کرو۔ بلکہ گھر میں انگریزی بولنی ہی نہیں ہے۔ تم تو بس نمک مرچ کی طرح اردو چھڑکتے رہتے ہو۔''

''نانی اماں۔ آپ کی زندگی کے فنڈے کلیئر نہیں ہیں۔ یہ اچانک اردو کہاں سے سر پر سوار ہو گئی۔''

''ہاں نانی۔ ویسے زبان ہے بڑی فنڈو۔ ہمارے کلاس کے ساتھی اکثر کہتے ہیں اردو بول کے دکھاؤ۔ قوالی سناؤ۔ غزل سناؤ۔'' فیض نے کہا۔

''یہ کیا بکواس ہے فنڈے۔ فنڈو۔'' زینت ناراض ہو گئیں۔ ''کہاں سے سیکھتے ہو یہ سب؟''

''ہاہاہا۔'' عائشہ ہنسی۔ ''یہ تو ایسی ہی بکواس کرتا رہتا ہے اور کرے گا بھی کیا۔ خالی وقت میں یا پکچریں دیکھنا یا بندئیں تڑنا۔ عقل کہاں سے آئے گی۔''

''کیا ___؟''

''بندئیں تڑتا رہتا ہے نانی۔ سی۔ پی میں گھوم گھوم کے۔''

''جیسے تو نہیں تڑتی بندے۔''

''دماغ خراب ہے تم دونوں کا۔ کیا بک رہے ہو۔'' زینت سرخ ہو گئیں۔

''نانی اماں۔ ہم اردو بولتے ہیں تو آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔'' دونوں نے کورس میں کہا۔

''آج سے تمہاری پڑھائی شروع۔ آج تو میں خود پڑھاؤں گی اور پھر جلد ہی انتظام کرتی ہوں ٹیوٹر کا۔ اچھا ہاں۔'' وہ مڑیں۔ ''فدا علی کے پاس بیٹھ کر ذرا گپ کیا کرو۔ پھر بولو گے ایسی اردو جو سب کی سمجھ میں آئے۔''

''نانی اماں بے چاری سینائل (Senile) ہوتی جا رہی ہیں۔'' فیض نے عائشہ سے کہا۔ ''کہتی ہیں فدا علی کے ساتھ گپ ہانکو۔ ویسے فدا علی ہیں مزے دار۔ قصے خوب سناتے ہیں۔''

دلال پھر سر پر سوار ہو گیا تھا۔

''کیا کہتی ہو زینت بیگم۔ دے ہی دیں وہ جالیاں۔ آخر کس کام کی ہیں۔ مکان بھی ڈھے رہا ہے۔ اس کا بھی کیا کرنا ہے۔ اپنی زندگی میں بیچ باچ کے سب کا حصہ دے ڈالیں تو اچھا رہے گا۔''

''کتنی بار یہ سوال پوچھیں گے۔'' زینت نے رسان سے کہا۔ ''شاید آپ کا ارادہ ہی پختہ نہیں ہے۔ ارادہ پختہ ہو تو سارے کام چٹکیوں میں نبٹ جاتے ہیں۔ اب دیکھئے فیض اور عائشہ کے لیے ٹیوٹر آج تک نہیں مل سکا۔ چھٹیاں ختم ہونے کو ہیں۔''

تفضل حسین جلدی سے سٹک لیے۔ اس ہفتے انہوں نے سودا طے کر ہی لیا۔ گاؤں جا کر ٹوٹا پھوٹا بڑا سا مکان، جس میں دادا حضور نے سنگ مرمر کی نفیس جالیاں نصب کرائی تھیں، بھی تقریباً بیچ آئے۔ جالیاں تو پہلے ہی نکلوالی تھیں۔

تفضل حسین کے ساتھ فدا علی کا پوتا چلا آیا تھا۔ دراصل فدا علی پرانی رعیت میں سے تھے۔ اب رعیت نام کی تو کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی۔ پشتینی تعلقات اور دو بیگھہ زمین کے احسانات کی شرم تھی۔

''کیا میاں پڑھتے ہو؟'' زینت نے شفقت کے ساتھ نادر سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''آٹھویں میں ہیں۔''

''کہاں پڑھتے ہو؟''

''گاؤں میں مدرسہ ہے نہ؟ مولوی صاحب پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ لیں!'' اس نے میز پر پڑے اردو رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

زینت خوش ہو گئیں۔ آج تک ان کے نواسی نواسے میں سے کسی کو وہ رسالہ اٹھانے کی توفیق نہیں ہوئی تھی۔

''آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟'' وہ اس سے پوچھنے لگیں۔
''میٹرک کریں گے۔ پھر شہر آ کے نوکری ڈھونڈیں گے۔'' پندرہ سولہ سالہ لڑکے کے 'فنڈے' بالکل کلیئر تھے۔
''میٹرک کے بعد نوکری کہاں ملتی ہے میاں۔''
فداعلی کریلوں میں قیمہ بھرنے کے بعد دھاگا لپیٹ رہے تھے، بولے: ''بیگم صاحبہ ابھی لڑکا ہے۔ عقل کہاں سے آئے گی۔ وہ بھی گاؤں کا لڑکا۔ میٹرک کرلے گا تو ہم شہر لے آئیں گے۔ جی بچ گئے تو اسے آگے پڑھائیں گے۔ بی اے کرلیا تو پھر تو نوکری ملے گی نہ؟ ورنہ یہ بھی ہماری طرح قیمہ بھرے کریلے پکائے گا یا اپنے باپ کی طرح کلکتہ میں مزدوری کرے گا۔''
''اور بیگم صاحبہ —'' انہوں نے آگے کی بات کہی نہیں، صرف دل میں سوچی — ''اور جو کہیں واقعی ہمارے بھاگ جگے اور ہمارا پوتا شہر میں نوکر ہو گیا تو اس کے بچوں کو ہم شہر کے اچھے اسکول میں پڑھائیں گے۔ واہ میاں فداعلی۔ واہ۔ تم بچو گے یہ سب دیکھنے کو۔ ٹھیک ہے نہ بچیں۔ ہمارے خواب ہمارے پوتے کی آنکھوں میں تو ہوں گے۔ ہماری چوتھی پشت تو سدھرے گی۔ سمیرہ بی بی اور علی بھیا کی طرح۔ ان کے بچوں کی طرح۔''
زینت بچے سے مسرور لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ''میرے پاس اردو کی اور بہت سی کتابیں ہیں۔ وہ میں تمہیں دوں گی۔ مبارک ہیں تمہارے گاؤں کے مدرسے جنہوں نے اردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔''
فداعلی کریلوں کو کڑھائی میں جماتے ہوئے مستقبل میں ان اسکولوں کے خواب بُن رہے تھے جن میں اردو شاید کبھی نہیں پڑھائی جائے۔
آندھیاں ہمیشہ چراغوں کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

☆☆☆

استفراغ

— سلام بن رزّاق

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں جوں ہی جلسہ گاہ سے باہر نکلا کسی نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ میں مڑا۔ صفدر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میری طرف آرہا تھا۔

''بھئی، سب سے پہلے تو اس انعام کے لیے تمھیں مبارک باد۔''

اس نے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

''اور ہاں! تم جب بھی دلّی آتے ہو تو آکر چپ چاپ نکل جاتے ہو مگر اس بار میں تمھیں یوں ہی جانے نہیں دوں گا۔ ہم آج تمھارے انعام کو سیلی بریٹ کریں گے۔''

''بالکل۔'' میں نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

''تو پھر چلو۔ خواہ مخواہ دیر کرنے سے کیا فائدہ۔''

''کہاں؟''

''میرے گھر اور کہاں۔''

''ارے نہیں آپ کے گھر پھر کبھی آجاؤں گا۔''

''آج بہانہ نہیں چلے گا۔ چلو۔ بیٹھو۔''

اس نے بائک کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ صفدر بھائی، آج نہیں۔ کل چلیں گے، میں وعدہ کرتا ہوں۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بائک کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

میں نے زیادہ حیل و حجت کرنا فضول سمجھا اور چپ چاپ بائک پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ممبئی سے چلتے وقت دو ایک دوستوں نے تاکید کی تھی کہ دلی میں سب سے ملیو مگر صفدر سے بچ کر رہیو۔ اگر اتفاق سے مل بھی گیا تو کنی کاٹ جانا۔ خبردار اس کے ساتھ اس کے گھر تو ہرگز نہ جانا، ورنہ نتائج کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔

میں نے پوچھا بھی تھا۔ ''کس قسم کے نتائج؟''
مگر کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا اور اب اتفاق سے صفدر مل بھی گیا تھا اور اپنے گھر بھی لے جارہا تھا۔ مجھے قدرے بے چینی محسوس ہوئی مگر فرار کی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صفدر کی موٹر بائک تیزی سے اس کے گھر کی طرف جارہی تھی۔ صفدر زور زور سے کچھ بول بھی رہا تھا مگر موٹر بائک کی پھٹ پھٹ اور ٹریفک کے شور میں کچھ بھی صاف سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں بس 'ہوں، ہاں' کیے جارہا تھا۔ وہ بولتے بولتے زور زور سے ہنسنے بھی لگتا تھا تو میں بھی بغیر کچھ سمجھے سنے خواہ مخواہ اس کے ساتھ ہنسنے لگتا۔ میری ہنسی سے اسے اور ترغیب ملتی اور وہ مزید جوش وخروش سے بولنے لگتا۔ میں نے گھڑی دیکھی شام کے سات بج رہے تھے۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ میں نے کوٹ تو پہن رکھا تھا مگر کان بج ہوئے جارہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف دکانوں کے نیون سائن کی روشنیوں سے پورا علاقہ جگ مگ کررہا تھا۔ موٹر سائیکل ٹریفک کے بہاؤ میں تیرتی چلی جارہی تھی۔ ایک سگنل پر جب موٹر سائیکل رکی تو میں نے موقع غنیمت جان کر ایک بار پھر اس سے کہا۔
''صفدر بھائی! نو بجے ایک صاحب سے ملنے کا وعدہ ہے۔ وہ ہوٹل پر آنے والے ہیں میں نے ان کے لیے کوئی میسج بھی نہیں چھوڑا ہے۔ وہ بلاوجہ پریشان ہوں گے۔ آج مجھے جانے دیجیے۔ کل کی شام آپ جہاں کہیں گے میں چلوں گا۔ میں ابھی دو تین روز ہوں یہاں۔''
''یار تم خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہو۔ ارے گھر پہنچ کر ہوٹل میں فون کر لینا، کاؤنٹر پر میرے گھر کا فون نمبر اور ایڈریس دے دینا۔ جب وہ صاحب آئیں گے تو فون پر بات کر لینا۔ اگر وہ آنا چاہیں تو انھیں بھی میرے گھر پر بلا سکتے ہو۔''
نجات کی ایک موہوم سی امید بندھی تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔ گرین سگنل روشن ہو گیا اور رکی ہوئی گاڑیاں ہارن دیتیں چیختی چنگھاڑتیں دوبارہ روانہ ہو گئیں۔ صفدر کی موٹر سائیکل بھی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ اب چھٹکارے کی کوئی امید نہیں تھی، بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنے کی کوشش فضول تھی۔ بالآخر میں نے تھک کر اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کر دیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ یکلخت ذہنی تناؤ کم ہو گیا اور میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اب صفدر کا چیخ چیخ کر کچھ کہنا اور بات بات پر قہقہے لگانا اتنا گراں نہیں گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا لوگ آخر اس سے اس قدر بدکتے کیوں ہیں؟ اس میں بظاہر تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔

بس زیادہ بولتا ہے اور بات بے بات ہنستا ہے۔ خیر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس کے سبب کسی سے بدگمان ہوا جائے۔ ممبئی میں وہ شمس الاسلام کیا کم بولتا ہے۔ دنیا کا ایسا کون سا موضوع ہے جس پر وہ اظہار رائے نہیں کرسکتا۔ اس پر طرہ یہ کہ اونچا بھی سنتا ہے۔ دوران گفتگو اگر آپ کچھ بولنا چاہیں تو وہ اپنے دونوں کانوں کے پیچھے ہتھیلیاں رکھ کر آپ کی طرف اس قدر جھک آئے گا کہ اس کے سانسوں کی بدبو آپ اپنے چہرے پر محسوس کرسکتے ہیں۔ پھر دو چار جملوں کے بعد ہی آپ کا کوئی ادھورا فقرہ یا کوئی لفظ اچک لے گا اور آپ کی بات کاٹ کر دوبارہ بولنا شروع کردے گا۔ اس کے بہرے پن اور علاّمیت کے پیش نظر دوستوں میں املا کے تھوڑے تصرف کے ساتھ وہ 'بہرالعلوم' کے لقب سے مشہور ہوگیا ہے۔ آخر اسے بھی تو سب برداشت کرتے ہی ہیں۔ پھر صفدر میں ایسی کیا غیر معمولی برائی ہے کہ ہر کوئی اس سے گریزاں دکھائی دیتا ہے۔ اونہہ ہوگی کوئی بات۔ اب سابقہ پڑ ہی گیا ہے تو دیکھا جائے گا۔

موٹر سائیکل ایک پتلی سڑک پر مڑ رہی تھی۔ ٹریفک کا شور پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ صفدر کہہ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے تم پہلی بار آرہے ہو میرے گھر۔''

''غالباً۔'' میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم شاید آدرش نگر کالونی کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔''

''بالکل۔ ہم آدرش نگر میں داخل ہو چکے ہیں۔ بس اس کے اختتام پر ہماری کالونی بھارت نگر ہے۔ کیا اس طرف آئے ہو تم کبھی؟''

''ہاں، دو تین بار آدرش نگر آیا ہوں میں۔ یہاں ایک دوست رہتا ہے عادل عثمانی۔''

''وہ بلڈر؟''

''ہاں۔''

''تم سالے ایک ادیب تمھاری دوستی بلڈروں سے کیسے؟''

اس نے ایک استہزائیہ ہنسی کے ساتھ ریمارک دیا۔

مجھے اس کا یہ ریمارک ناگوار گزرا۔ ہم میں ایسی بے تکلفی نہیں تھی کہ وہ مجھے سالے کہہ کر مخاطب کرتا۔ تاہم میں ضبط کرگیا، پھر برا سا منہ بنا کر بولا۔

''میں انسان کو اس کے پیشے سے نہیں رویے سے پہچانتا ہوں۔''

''واہ، کیا کلاسیک جملہ ہے، خوب۔ اگرچہ تم نے مجھے منہ توڑ جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر میں تمھاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ موٹر سائکل ایک چھوٹے سے گیٹ کے سامنے آکر رُک گئی۔

''چلو اترو۔ یہی ہے فقیر کی کٹیا۔''

میں بائیک سے اتر گیا۔ سامنے دور تک دو رویہ قطاروں میں رو ہاؤسیس کا ایک سلسلہ سا چلا گیا تھا۔ ہم رو ہاؤس کا چھوٹا سا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ سامنے مکان کی پیشانی پر اردو میں لکھا تھا ''کٹیا محل'' ساتھ ہی اس کے نیچے انگریزی میں بھی درج تھا، Kutiya Mahal۔

مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مکان کا نام تو بڑا اچھا رکھا ہے۔ 'کٹیا محل' واہ!''

''یار میں لٹھ فقیر آدمی ہوں۔ فقیر کا ٹھکانہ کٹیا ہی تو ہو سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ اردو میں تو لوگ اسے 'کٹیا محل' پڑھیں گے مگر انگریزی میں اسے کوئی 'کتیا محل' بھی پڑھ سکتا ہے۔ یعنی کتیا محل۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ گردن اُٹھا کر گھر کا نام زیرلب دہرایا۔ ''سچ کہہ رہے ہو۔ میں نے اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔''

پھر ایک لمحہ رک کر بولا۔

''خیر۔ اب یہاں کوئی انگریز آنے سے تو رہا، جو کٹیا کو کتیا پڑھ سکتا ہے۔ البتہ اگر کوئی ہندوستانی کٹیا کو کتیا پڑھتا ہے تو سمجھ جانا چاہیے کہ اس کے ذہن میں کوئی کتا پن موجود ہے۔''

ساتھ ہی اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف کھینچتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ''چلو۔''

میں اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا۔ کمبخت نے میرا وار مجھی پر الٹا دیا تھا۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا غلطی میری ہی تھی۔ مذاق مذاق میں میں نے کیچڑ میں پتھر مار دیا تھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے بلند آواز سے پکارا۔

''کوثر۔ دیکھو کون آیا ہے؟''

پھر میری جانب مڑ کر صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''بیٹھو نا یار کھڑے کیوں ہو؟''

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ صوفے کے آگے بیضوی شکل کی بڑی سی تپائی رکھی تھی، جس کی سطح شفاف شیشے کی بنی تھی۔ تپائی پر ایک خوبصورت سا گلدان تھا جس میں پلاسٹک کے پھول سجے ہوئے تھے۔ کمرے کی تینوں دیواروں کے اوپری حصے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بک شیلف بنے ہوئے تھے جس میں کتابیں سلیقے سے لگی ہوئی تھیں۔ چھت کے درمیان ایک جھومر لٹک رہا تھا جس میں یقیناً برقی قمقمے لگے ہوں گے مگر اس وقت قمقمے روشن نہیں تھے۔ جھومر کے دونوں طرف پنکھے لگے ہوئے تھے۔ دونوں پنکھے بند تھے۔

''ریلیکس ہو کر بیٹھو یار۔ تم صوفے پر بھی یوں بیٹھے ہو جیسے موقع ملتے ہی بھاگ کھڑے ہو گے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے قدرے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں اندر کے کمرے کی چق ہٹی اور ایک خاتون باہر نکلیں۔ شاید وہ ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھیں۔ انھوں نے پیازی رنگ کی ردا سے اپنا سر اور کان لپیٹ رکھے تھے۔ صرف ان کا چہرا کھلا تھا۔ ان کا رنگ یقیناً گورا تھا مگر گورے رنگ کے نیچے ہلکی ہلکی زردی بھی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے سے نظر آ رہے تھے جس سے چہرہ اور بھی ملول لگ رہا تھا۔ آنکھوں سے ایک بے نام سی اداسی جھانکتی دکھائی دے رہی تھی مگر ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ موجود تھی۔

''کوثر۔ میری شریک حیات۔ شریک حیات کم، شریک غم زیادہ۔''

اس نے پھر ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا۔

''اور کوثر، یہ اردو کے مشہور ادیب ...... جنھیں اس سال 'پریم چند ایوارڈ' سے نوازا گیا ہے۔

ایک اور بے ہنگم قہقہہ۔ اس کے تعارفی کلمات سے طنز پھوٹا پڑ رہا تھا۔ خاتون نے پیشانی تک ہاتھ لے جا کر 'آداب' کہا۔ میں بھی صوفے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''آداب۔''

یکبارگی پھر چق ہٹی اب کے تین لڑکیاں باہر نکلیں۔ تینوں کی عمریں بالترتیب بارہ سے لے کر سات آٹھ برس کے درمیان رہی ہوں گی۔

''یہ ہماری بیٹیاں ہیں۔ کاکل، سنبل اور زلفی۔''

تینوں لڑکیوں نے ایک ساتھ ہم آواز ہو کر 'آداب' کہا۔ میں نے سب سے چھوٹی لڑکی زلفی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''جیتی رہو۔''

میں نے دیکھا کہ تینوں لڑکیوں کی شکلیں اپنی ماں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ تینوں نے ایک ہی رنگ کا شلوار کرتا پہن رکھا تھا اور تینوں نے اپنے سر اور کان لپیٹ رکھے تھے ماں کی طرح۔ تینوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ضرور تھی مگر لگتا تھا مسکراہٹ اندر سے نہیں پھوٹ رہی ہے بلکہ کسی نے باہر سے ان کے ہونٹوں پر چسپاں کردی ہے۔ تینوں کی آنکھوں میں بھی ماں کی طرح ایک بے نام اداسی کی جھلک موجود تھی۔ غرض حلیے بشرے سے تینوں کی تینوں اپنی ماں کی پرچھائیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

''آپ چائے لیں گے یا کافی؟'' خاتون نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، صفدر نے ترنت کہا۔

''نہ چائے نہ کافی'' آج ہم ان کے ایوارڈ کو سیلی بریٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ خاتون کے چہرے پر لمحے بھر کو سایہ سا لہرا کر گزر گیا۔ بچیوں کی آنکھوں میں بھی ایک موہوم سا اضطراب کروٹ بدل کر غائب ہو گیا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

''صفدر بھائی، آج کے دن صرف چائے چلے گی۔ میں پھر کبھی آجاؤں گا۔''

''سوال ہی نہیں اٹھتا۔ میں اتنی دور سے تمھیں اغوا کر کے صرف چائے پلانے تھوڑی لایا ہوں۔''

پھر وہ بیگم اور بچیوں کی طرف مڑ کر بولا۔'' چلو اپنے اپنے کام سے لگ جاؤ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔'' اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

اتنا سنتے ہی بچیاں ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئیں جیسے کسی نے خودکار کھلونے کا بٹن دبا دیا ہو۔ پھر تینوں مجھے جھک کر آداب کہتی ہوئی مڑیں اور چق ہٹا کر اندر چلی گئیں۔ صفدر کی بیوی بھی ''آپ تشریف رکھیے'' کہہ کر بچیوں کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

صفدر نے ایک شیلف میں کتابوں کے پیچھے ہاتھ ڈالا اور وہاں سے وہسکی کی ایک بوتل برآمد کی۔ ہنستا ہوا بوتل کو میرے سامنے تپائی پر لا کر رکھ دیا۔ ''کتاب اور شراب دونوں کی فطرت ایک ہے۔ دونوں انسان کے باطن کو آئینہ دکھاتی ہیں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس کی حرکات وسکنات کو دیکھتا رہا۔ اس نے میرا پریم چند مومینٹو، پھولوں کا گلدستہ اور شال کو تپائی سے اٹھا کر میرے قریب صوفے پر رکھ دیا۔

''سنبھالو اپنا سرو سامان۔'' میں نے اس کے لہجے میں ہلکی سی حقارت کی جھلک محسوس کی۔''صفدر بھائی میں ہوٹل پر فون کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔'' اس نے کمرے کے دوسرے گوشے میں رکھے کوارڈلیس فون کا ریسیور اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ہوٹل کے نمبر ڈائل کیے۔ ریسپ شنسٹ کو اپنا روم نمبر اور نام بتا کر صفدر کا فون نمبر نوٹ کراتے ہوئے ہدایت کی کہ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اس نمبر پر رنگ کر دینا۔ میں فون کر کے مڑا اتنی دیر میں تپائی پر وہسکی کی بوتل کے ساتھ دو گلاس، سوڈے کی بوتل اور گزک کی پلیٹیں سجادی گئی تھیں اور صفدر شراب کی بوتل سے گلاسوں میں شراب ڈال رہا تھا۔

''پانی یا سوڈا؟'' اس نے پوچھا۔

''مکس'' میں نے گلاسوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

جام بھر گئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ جام اٹھائے اور چیئرس کہتے ہوئے انھیں ہونٹوں سے لگالیا۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''صفدر بھائی، اس وقت آٹھ بج رہے ہیں۔ میں ٹھیک نو بجے اٹھ جاؤں گا۔''

''ارے یار، پہلی سپ ابھی حلق سے اتری نہیں اور تم جانے کی باتیں کرنے لگے۔ فکر مت کرو زیادہ دیر ہو جائے تو یہیں سو جانا۔''

''بالکل نہیں۔ میں نو بجے اٹھ جاؤں گا۔'' میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔ اب آرام سے شراب پیو۔ اور ہاں مجھے بار بار صفدر بھائی صفدر بھائی کہہ کر مخاطب مت کرو۔ آج کل اس لفظ کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ لفظ بھائی، سنتے ہی کانوں میں ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔'' وہ حسب معمول بھونڈے طریقے سے ہنسنے لگا۔

میں نے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ سینگ کا ایک دانہ منہ میں ڈال کر چپ چاپ منہ چلانے لگا۔ گردن گھما کر دیوار پر چلے الگ الگ بک شیلفوں کو غور سے دیکھنے لگا۔

شاعری، تنقید، فلسفہ، سوانح ہر شیلف پر جلی حروفوں میں الگ الگ نام کی پرچیاں چسپاں تھیں۔ ایک طرف ایک بڑی الماری تھی جس میں صرف انگریزی کی کتابیں قرینے سے لگی تھیں۔

''آپ کے پاس تو بڑا اچھا ذخیرہ ہے کتابوں کا۔'' میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ وہ کچھ بولا نہیں، شراب کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بک شیلفوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی، پھر آلو چپس کا ایک قتلہ منھ میں ڈال کر آہستہ آہستہ منہ چلانے لگا۔

''سنا ہے کہ پہلے آپ لکھتے بھی تھے۔''

''ہاں بہت پہلے، مگر چھپا بہت کم ہوں۔''

''کیوں؟''

''ہماری زبان میں ایسا کوئی رسالہ ابھی نہیں نکلا ہے جو میری تخلیقات کے معیار پر پورا اترتا ہو۔''

''کیا؟'' میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اس کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہو گئی تھیں اور ہونٹوں پر ایک زہر خند تھا۔

''آپ سنجیدہ ہیں۔'' میں نے قدرے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال سے میں ہوں۔''

''اس طرح تو آپ ہماری زبان کے پورے ادب کو یکسر خارج کر رہے ہیں۔''

''پورے ادب کو نہیں، صرف آج کے ادب کو۔''

''آپ کا کوئی تو آئیڈیل شاعر یا ادیب ہوگا۔''

''میں خود ہی اپنا آئیڈیل ہوں۔'' اس نے پھر ایک بار زوردار قہقہہ لگایا۔ بجلی کی روشنی میں اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''یار میری بات کا برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ سب مجھ سے پہلے کہا جا چکا ہے، یہ الگ بات ہے کہ تم اس سے واقف نہیں ہو، مثلاً میں نے ابھی کہا کہ میں خود ہی اپنا آئیڈیل ہوں۔ تمھیں میری بات سن کر قدرے حیرت ہوئی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ ناگوار بھی گزری ہو، مگر آج سے سیکڑوں سال پہلے یہ بات ایک مشہور صوفی کہہ چکا ہے، ''میرے جبے کے نیچے خدا ہے۔ میں ساقی ہوں، میں ہی پیالہ ہوں۔ میں ہی میخوار ہوں۔'' بتاؤ میری بات میں اور صوفی کی بات میں کیا فرق ہے سوائے الفاظ کے۔ ادھر ہمارے عہد

کے ایک اردو شاعر نے بھی کچھ ایسا ہی مضمون اپنے شعر میں باندھا ہے۔ ''میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی، راہی بھی۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا اور پھر بولنا شروع کیا۔

''میں نے اس لیے لکھنا چھوڑ دیا کیوں کہ میں جو کچھ لکھ رہا تھا وہ مجھ سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ جو لکھا جا چکا ہے اسے دوبارہ لکھنے کا کیا مطلب! ویسے بھی باسی نوالے چبانے میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں مگر یہ بات کتنے لوگ سمجھتے ہیں۔ جو لوگ نہیں سمجھتے انھیں سمجھانا فضول ہے، اور جو لوگ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے انھیں دنیا کا کوئی سمجھدار آدمی سمجھا نہیں سکتا۔ کیا سمجھے؟ دنیا میں اکثریت ناسمجھوں کی ہے، سمجھدار تو بس آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ مگر کامیابی ہمیشہ ناسمجھوں کے ہی حصے میں آتی ہے کیوں کہ وہ سمجھوتہ کرنے کے گر سے واقف ہوتے ہیں اور سمجھدار ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں کہ ناسمجھوں سے سمجھوتہ ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ اس دنیا میں سمجھ کی بات کوئی سمجھنا نہیں چاہتا۔ اسے اس طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔ تکرار لفظی سے میرے دماغ کی رگیں پھٹنے لگی تھیں، درمیان میں جب وہ سانس لینے کو رکتا اور میں کچھ بولنے کے لیے منھ کھولتا تو وہ فوراً ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیتا اور چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد پھر بولنا شروع کر دیتا۔ وہسکی اس پر تیزی سے اثر انداز ہو رہی تھی اور اس کی تقریر کی روانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میری حالت اس شخص جیسی تھی جسے کوئی بال پکڑے پانی میں متواتر غوطے دیے جا رہا ہو۔ اگرچہ بول وہ رہا تھا مگر سانس میرا پھولنے لگا تھا۔

ابتدا میں تو اس کی گفتگو میں ربط و تسلسل برقرار رہا۔ الفاظ جگنوؤں کی مانند جلتے بجھتے ہلکی ہلکی روشنی دیتے رہے مگر رفتہ رفتہ اس کی باتوں میں بے ربطگی کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ الفاظ اپنی خیرگی کھونے لگے۔ جملوں کے تانے بانے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔

وہ کبھی مذہب کی دقیانوسیت پر ضربیں لگاتا تو کبھی سیاست کی دھجیاں اڑاتا، کبھی بڑے بڑے فلسفیوں کے حوالے دیتا تو کبھی معاشیات کے اعداد و شمار گنوانا شروع کر دیتا۔ میں دو پیگ پی چکا تھا۔ میری کنپٹیاں بھی قدرے گرم ہونے لگی تھیں۔ اب اس کی گفتگو میری سماعت پر بے حد گراں گزر رہی تھی۔ مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ دوستوں نے اس سے ملتے وقت

احتیاط برتنے کی تاکید کیوں کی تھی۔ اس کا جوش و خروش لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ آنکھوں کی سرخی میں اضافہ ہو گیا تھا اور باچھوں کے کناروں پر کف جمع ہونے لگا تھا۔

بولتے بولتے وہ اچانک کھڑا ہو گیا، دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے۔ دیدوں کو دائیں بائیں گھمایا، پھر گردن اٹھا کر دور تک نگاہ ڈالی جیسے سامنے ہزاروں کا مجمع موجود ہو۔ پھر قدرے پھنسی پھنسی مگر بھاری آواز میں گویا ہوا۔

''اوہام کے سمندر میں حقائق کے موتی تلاش کرنے والو سنو!

تمہاری بینائی کمزور اور تمہاری سماعت ناقص ہے، اس لیے تم گہرے پانیوں میں اترنے سے گھبراتے ہوئے، جس تہذیب کی تم دہائی دے رہے ہو اس کی گردن پر تو جنگلوں کا قصاص باقی ہے۔ لفظوں کی کوکھ سے معنی کے انڈے نہ نکلیں تو سمجھ لو تمہاری ماں دردزہ میں مبتلا ہو گئی ہے اور تمہارا باپ لچا، شہدا کبوتروں کے انڈے چرا رہا ہے۔ وہ اکیس مردوں کے ساتھ فارغ ہونے کے بعد بیانگ دہل پکار رہی ہے۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق؟ ادب بے ادبوں کا زیور ہے اور تمدن کی تہ میں نہ جانے کتنے چھید ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی سے بال جبریل کے اجزا الگ کر دیں تو نطشے بغلیں جھانکتا نظر آئے گا۔ کیوں کہ دریدا کی ٹوپی اوڑھ کر جب بھرتری ہری غائب ہو جاتا ہے تو ساری ساختیات پس ساختیات دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ادھر گوئٹے نے شیطان سے دوسری گانٹھ لی اور ادھر بے چارے غالب کے پرزے اڑ گئے۔ جانتے ہو شیکسپیئر کے سارے کردار مٹی کا چولہا بنانے کے فن سے نا آشنا تھے۔ پلکوں پر خواب سجانے سے اچھا ہے آدمی گھاس چھیلتے چھیلتے زمین کی کھاد بن جائے۔ باغ عدن میں اہرمن ٹہل رہا ہے اور یزداں واشنگٹن کے کیفے ٹیریا میں سوم رس کی چسکیاں لے رہا ہے۔ یزداں بہ کمند آورا سے ہمت مردانہ مارکس نے نیوٹن کا بٹن دبایا اور فرائڈ کے گلے سے ایک دلخراش چیخ نکلی۔ معاشیات واشیات سب مداری کے کھیل ہیں ورنہ آج تک یہی ثابت نہیں ہو سکا ہے کہ ایک سے ایک مل کر دو ہوتے ہیں یا گیارہ۔ دانتے پل صراط سے گرتے گرتے بال بال بچ گیا۔ غنیمت ہے اسے ایلیٹ نے سنبھال لیا ورنہ دونوں جہنم رسید ہو چکے ہوتے۔ میر تقی میر جب انیس کے گلے میں بانہیں ڈالے روتے ہیں تو نظیر اکبرآبادی آگرہ بازار میں ریوڑیاں بیچ رہے ہوتے ہیں۔ پریم چند یہ کس کا کفن سی رہے ہیں؟ اور منٹو کس کی کالی شلوار پہنے اترا رہا ہے۔ ٹالسٹائی، دوستو وسکی، چیخف، گورکی سب ایک ہی تھیلے کے چٹے بٹے ہیں۔

آخر فلابیر کو موپاساں سے پنگا لینے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے دیکھو میں ستاروں میں سب سے روشن ستارہ اور گھوڑوں میں سب سے سرکش گھوڑا ہوں۔ وہ سمجھتا ہے اس کے سامنے جتنے لوگ بیٹھے ہیں سب بے لباسی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں جب کہ خود اسے نہیں معلوم کہ اس کے خصیوں کی سلسلاہٹ کو زائل ہوئے زمانہ بیت چکا۔ باسی نوالے چباتے چباتے اس کے دانت جھڑ چکے ہیں لہٰذا اب وہ سوائے گھٹیا شاعری کا لالی پاپ چوسنے کے کچھ بھی کرنے سے قاصر ہے۔''

وہ دائیں بائیں گردن گھماتا، ہاتھ نچاتا ہوا جانے کیا کیا کہے جارہا تھا۔ میں حیرت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا شاید مجھے نشہ ہو گیا مگر میں نے صرف دو پیگ ہی پئے تھے۔ تیسرا پیگ جوں کا توں میز پر دھرا تھا۔ پھر یہ کس قسم کی گفتگو ہے؟ وہ کیا بول رہا ہے؟ ایک لمحہ کو لگتا وہ کوئی بہت معنی خیز بات کہہ رہا ہے مگر دوسرے ہی پل محسوس ہوتا کہ وہ محض یاوہ گوئی کر رہا ہے۔ میرا سر چکرانے لگا میں کسی طرح وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر فرار کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ یکلخت چپ ہو گیا ہے۔ کمرے میں مرگھٹ کا سناٹا چھا گیا صرف دیوار پر لگی گھڑی کی ٹک ٹک سے مجھے اپنے ہونے کا احساس ہو رہا تھا، یک بیک اس کے حلق سے ایک بے ہنگم سی خرخراہٹ نکلی۔ آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ باچھیں چر کر کلوں سے جا لگیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پکڑ کر جھکنے لگا۔ جھکتا گیا اور پھر 'بق بق' کی مکروہ آواز کے ساتھ اس نے ایک بڑی سے قے کر دی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ میز پر رکھے شراب کے گلاس الٹ گئے اور گزک کی پلیٹوں میں زرد اور سبزی مائل رنگ کا گاڑھا لعاب تیرنے لگا۔ مجھے متلی سی ہونے لگی۔ میں نے منہ پھیر لیا مگر ایک کھٹی قسم کی بو میرے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔ وہ حلق سے 'بق بق' کی آوازیں نکالتا برابر قے کیے جارہا تھا۔ اتنے میں اندرونی کمرے کی چق ہٹی۔ اس کی بیوی باہر نکلی۔ اس کا سر اور کان اب بھی ردا میں لپٹے ہوئے تھے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ہکلاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھیے۔ انھیں پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔''

اس نے کچھ نہیں کہا، اپنے شوہر کے قریب آئی۔ ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی الٹیاں رک گئیں مگر اس کی

ناک اور منہ سے لعاب کے لیس دار تار لٹک رہے تھے۔ بیوی نے تولیے سے اس کا منہ پونچھا۔ بوتل سے گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دو گھونٹ پانی پلایا۔ وہ سنبھل گیا تھا مگر اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کی چمک بھی ماند پڑ گئی تھی اور اس کا نچلا ہونٹ اونٹ کی طرح لٹک گیا تھا۔ بیوی اسے سہارا دیتی ہوئی اندر جانے کے لیے مڑی۔ اندر جاتے جاتے میری طرف پلٹی۔ بے تعلق نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''آپ کھانا کھائیں گے؟''

اس کا لہجہ ایک دم سپاٹ تھا جیسے کوئی رٹا ہوا جملہ دہرایا گیا ہو۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھی۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''آپ جا سکتے ہیں۔ خدا حافظ۔''

اس نے جھٹکے سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گئی۔ وہ کسی دیرینہ مریض کی طرح لڑکھڑاتے قدموں سے اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اب میرے لیے وہاں رکنے کا کوئی مطلب بھی نہیں تھا۔ مجھے صریحاً اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا جھولا اٹھایا اور باہر کے دروازے کی سمت مڑ گیا۔ جب میں دروازے سے باہر نکل رہا تھا تبھی پشت سے اس کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

''باہر گیٹ کا پھاٹک بند کر دیجیے گا۔ آوارہ کتے اندر آ جاتے ہیں۔''

''سٹاک' مجھے لگا کسی نے پوری قوت سے میری پیٹھ پر چابک رسید کر دیا ہو۔ میں تڑپ کر پلٹا۔ اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا وہ اسے لیے ہوئے اندر جا چکی تھی۔ معاً میری نظر لرزتی ہوئی چق پر پڑی۔ چق کی جھالر کے پیچھے سے چھے عدد متوحش آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

میں چپ چاپ مڑا اور لڑکھڑاتے قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بازگشت

—علی امام نقوی

آگ کے شعلوں سے بستی روشن ہوئی تو اس نے معنی خیز انداز میں اپنے جوان بیٹوں کے چہروں پر موجود پریشانیوں کے سائے کچھ بڑھتے ہوئے دیکھے۔ کنکھیوں سے بچوں کے باپ ہزارہ سنگھ کے چہرے پر نظر ڈالی جو کسی گہرے تفکر میں ڈوبا ہوا تھا، دوسرے ہی پل اس کی نگاہوں کا زاویہ تبدیل ہو کر سولہ برس کی بیٹی کے چہرے کو اپنے حصار میں لے آیا۔ وہ مکان کے سب سے پوتر حصے میں گروجی کی بیڑ کے سامنے ہاتھ جوڑے من ہی من میں سب کی سلامتی کی دعا مانگ رہی تھی۔ سب کو ہراساں دیکھ دل ہی دل میں وہ مسکرائی، پھر کچھ سوچ کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے زینوں کی طرف بڑھ گئی۔ ہزارہ سنگھ نے تفکر کے کنویں سے سر ابھار کر اس کو دیکھا اور اپنے بڑے بیٹے سے بولا۔

''دہُن کدا ای انصاف دی گل نئی اے۔ اک بندے دی سزا......''

''تسی بھول رئے ہو باؤجی۔''

بیٹے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں جواب دیا تو ہزارہ اپنے بیٹے کیہر کو گھور کر رہ گیا۔ باپ اور بیٹے کے درمیان دو جملوں کی گفتگو اس نے بھی سنی۔ ان کے اضطراب نے اس کے اپنے دل کا دریچہ کھول دیا تھا۔ دل میں قید مسکراہٹ چھلانگ لگا کر اس کے ہونٹوں پر براج گئی۔ وہ مکان کی چھت پر پہنچ چکی تھی اور اطمینان سے ادھر اُدھر سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلوں کا رقص دیکھ رہی تھی۔ قرب وجوار سے ابھرنے والی امدادی صدائیں جوں ہی اس کی سماعت سے ٹکرائیں تو اس کے ہونٹوں پر براجی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ ٹھیک اسی وقت ہوا کا جھونکا اپنے دامن میں جلتے جسموں کی چراند کا بھبکا لیے اس کے نتھنوں سے ٹکرایا اور اس کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

''بی جی۔ تسی کتھے ہو۔''

سولہ برس کی ہرجیت کور کے مخاطب کرنے پر اس نے پلٹ کر اس کے سراپے کو دیکھا۔ ہرجیت کے پورے وجود پہ کپکپی طاری تھی اور اس کی آنکھوں میں خوف کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

''بی جی...... تسی کتھے ہو...... دیکھو...... مارے پاسے آگ لگی ہے۔''

''ہوں''

''ہوں کی بی جی؟''

''تھکی تھکی نڈھال سی ستیں برسوں کے بن باس سے لوٹتے ہوئے وہی تو دیکھ رہی ہوں...... تو...... تو نیچے جا...... بھائیوں کے پاس۔''

''تھلّے۔''

''ہاں۔ کیہر اور چھوٹے کے پاس۔''

''تسی اتے کی کر رہی ہو...... تسی بھی تھلے آؤ۔''

''تو جا ہرجیت۔''

اس کے تحکمانہ لہجے کی کرختگی محسوس کرتے ہی ہرجیت زینوں کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے اپنے جسم کے بالائی حصے کو اک ذرا سا جھکانے کے بعد نیچے صحن میں سر جوڑے بیٹوں اور ہزارہ سنگھ کو دیکھا پھر زینے اترتی ہرجیت کو جو حسرت اور بے چارگی سے اسے دیکھتے ہوئے بے دلی سے زینے طے کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خمیدہ وجود کو سیدھا کیا اور پھر ایک مرتبہ جلتے ہوئے مکانوں کو دیکھنے لگی۔ فضا، آہوں، کراہوں اور چیخوں سے اٹی پڑی تھی۔

رینگتی ہوئی ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تو کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے مردوں کے ذہنوں میں موجود تشویش نے جھنجھلاہٹ اختیار کر لی تھی۔ جوان گاڑی کے رکتے ہی مستعد ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر نے پل بھر کے لیے کمپارٹمنٹ کے بند دروازے کو دیکھا اور دوسرے ہی پل اپنے عزیزوں کو۔ یکا یک وہ سب ہی چونک پڑے تھے۔ ایک دم سے بہت سی آوازوں نے کمپارٹمنٹ کے دروازوں اور کھڑکیوں پر حملہ کر دیا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں ٹھساٹھس بھرے مسافروں نے اپنی اپنی خوف زدہ نظروں سے کھڑکیوں کے اس پار چمکتی ہوئی کرپانوں کو دیکھا۔ بوڑھی اور ادھیڑ عورتوں نے کم سن اور جوان ہوتی ہوئی بچیوں کو اپنی چھاتیوں سے لپٹا لیا۔ اس اضطراری فعل سے وہ اپنے دلوں کے خوف پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں یا

بچیوں کی ڈھارس بندھا رہی تھیں۔ ادھر دروازہ پیٹا جا رہا تھا اور ہر تھپ تھپاہٹ کی ضرب وہ اپنے دلوں پر محسوس کر رہی تھیں۔

دفعتاً ایک فائر ہوا۔ سب نے چونک کر دیکھا۔ ایک جوان نے اپنی خوبصورت بہن کی چھاتی میں گولی داغ دی تھی اور وہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دے رہا تھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا۔ گولیاں چلیں اور وہ جوان تیورا کر گرا جس کے ہاتھ میں ریوالور موجود تھا۔ عورتوں کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ گرتے گرتے بھی اس جوان نے اپنا ریوالور حملہ آوروں پر خالی کر دیا تھا ادھر بھی تین چار گرے تھے۔ اور

دوسرے ہی پل نیزوں کی انیاں جوانوں کے سینوں کو برمانے لگیں۔ کرپانوں نے مردوں کے گلے کاٹے۔ ان کے پیٹ چاک کئے۔ ایک کے بعد ایک دل خراش چیخ ابھرتی، اور کسی نئی چیخ میں معدوم ہو جاتی۔ عورتیں جبراً اتاری جانے لگیں۔ جن عورتوں نے اپنی بچیوں کے تحفظ کی خاطر کمر کسی انھیں قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد ایسی عورتوں اور لڑکیوں کو بھی جنھوں نے اپنی چھوٹی بہنوں کی مدافعت کی رتی بھر بھی کوشش کی۔ خود ان کی اپنی بہن بھی اس کے سامنے دیوار بنی کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک جوان ہاتھوں میں سنگین لگی بندوق تھامے کھڑا تھا۔ موت دونوں بہنوں کے سامنے تھی اور جوان کے روبرو تھر تھر کانپتی دو بے یارومددگار لڑکیاں۔

''باجی۔''

اس کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ بہن نے جرأت کا ذرا سا مظاہر کیا اور جواب میں اس کی باجی کی دل خراش چیخ ابھر کر رہ گئی۔ اس کے اور حملہ آور جوان کے درمیان موجود دیوار گر چکی تھی۔

''کی سوچ میں گم اے ہزارے۔''

''دیکھ۔ کی چیز ہے۔ ماں دے خصم اے نوں اُتھے لے جارئے ہوندے۔''

''توڈا کی وچار ائے۔''

''اے نوں میں گھر لے جاویں گا۔''

''مسلی نوں۔''

''آہو...... دیکھ تسی ...... کڑی نیں مٹھے دا گلاس اے۔''

''پھینٹ پھانٹ اور ختم کرائے نوں۔''

''اوئے۔ کی گل کردا ائے۔''

ہزارہ واقعی اسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ ساتھیوں کے منع کرنے کے باوجود بھی۔ گھر پہنچ کر اس نے بار بار اس کی عزت لوٹی۔ پھر تو اس کی آبرو ہزارہ کی خواہش کی پابند ہوتی چلی گئی۔

سارا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ جنون کا دریا اتر جانے کے بعد ہزارہ نے اس کا دل جیتنے کی بھی کوششیں کی تھیں لیکن اس نے تو اپنے ہونٹ سی لیے تھے۔ اکثر ہزارہ اس سے پوچھتا۔

''تو اناں نو کدوں بھلا دینگی ؟''

مگر اس کے پاس ہزارہ کے سوال کا ایک ہی جواب تھا۔ خاموشی۔ بس گہری خاموشی۔ شروع شروع ناشتہ پانی کا انتظام ہزارہ نے ہی کیا تھا۔ پھر چولہا چوکا خود اس نے سنبھال لیا۔ اپنے پر گزر جانے والی قیامت کے اعصاب شکن احساسات کے اثرات زائل کرنے کی خاطر ہی اس نے مصروفیت کا سہارا لیا تھا۔ اسی قیامت کے عذاب کو بھلانے کی خاطر اس کی کوکھ نے بھی تین جانیں اگل دی تھیں۔ بڑا کیہر سنگھ، چھوٹا کرم جیت سنگھ اور ایک بیٹی ہر جیت کور۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ ہزارہ کے بچے بڑے ہونے لگے۔ تب اسے خیال آیا کہ گاؤں کی زندگی اس کے بچوں کو بہتر مستقبل فراہم نہ کر سکے گی۔ اپنی زمین فروخت کرنے کے بعد وہ دہلی منتقل ہو گیا۔ راجدھانی پہنچ کر اس نے پرچون کی دکان کھولی۔ کاروبار کے ترقی پاتے ہی دکان بڑے بیٹے اور ملازم کے سپرد کر کے اس نے موٹر سائیکل کے پرزوں کی ایجنسی لے لی۔ ترقی نے یہاں بھی اس کے قدم چومے اور — آج ہزارہ کی بچی ہر جیت اسی دہلیز پہ کھڑی تھی جہاں سے خود اس کی اپنی زندگی میں انقلاب آیا تھا۔

جلتے ہوئے مکانوں کی آگ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور نیچے صحن میں کھڑا ہزارہ اس سے مخاطب تھا۔

''اوئے تسی تھلے آجا — ائے کی کر رئی اے۔''

چھت کی لگار پر، ہتھیلیاں ٹیک کر اس نے سر جھکا کر نیچے دیکھا، پھر بچوں کو۔ اس سے پہلے کہ وہ ہزارہ کی بات کا جواب دیتی، بلوائیوں نے مکان پر دھاوا بول دیا۔ ہر جیت ڈر کے مارے کمرے میں بھاگی۔ پل بھر میں ہزارہ، کیہر اور کرم جیت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر کھونٹیوں پر ٹنگی ہوئی کرپانوں کو۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ فیصلے ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ کرپانوں کی طرف بڑھتے دروازہ ٹوٹ کر صحن میں آن گرا۔ یکدم سے کئی جوان ہاتھوں میں

جلتی ہوئی مشعلیں، لاٹھیاں اور بندوقیں لیے صحن میں گھس آئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر چھوٹے کے کھیس پکڑے دوسرا ہزارہ کی طرف بڑھا۔ کیہر کرم جیت کی طرف بڑھا تو ایک بلوائی کا چھرا اس کے پیٹ میں اتر گیا۔ ہزارہ تلملایا اور آگے بڑھا۔ دوسرے بلوائی نے اپنا ریوالور اس کے سینے پر رکھ دیا اور ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ بڑھاتے ہوئے گالی دینے لگا۔ کرم جیت دہشت زدہ اب بھی ان کی گرفت میں تھا ایک نے اس کا کام بھی تمام کر دیا۔ تب کسی نے چیخ کر سب کو مخاطب کیا۔

''ایک عورت اور ایک لونڈیا اور ہے گی اس مکان میں۔''

وہ سنبھل گئی۔ اس نے اپنے سارے وجود سے ہمتیں بٹوریں اور چھت پر سے صحن میں کود گئی۔ چند ثانیوں کے لیے تمام حملہ آوروں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اٹھ کر اس نے کولہے جھاڑے ایک نگاہ بلوائیوں پر ڈالی۔ پھر کیہر، کرم جیت اور ہزارہ کی لاشوں کو دیکھتے ہوئے الٹے قدموں کمرے کی طرف بڑھی۔

''سوچو کیا ہو۔ ختم کرو۔''

''اور لونڈیا کو اٹھالو۔''

''بی جی — '' ہر جیت کی کانپتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''با جی — '' کہیں بہت دور سے خود اپنی آواز بھی اس نے سنی۔

''بی جی — '' ہر جیت نے اسے پھر پکارا۔

''با جی — '' خود اپنی ہی آواز اب اس نے بہت قریب سے سنی۔

''بی ...... جی — '' ہر جیت ہڑ بڑا کر کمرے سے نکل آنے کی حماقت کر بیٹھی۔

''سوچو کیا ہو۔ ٹھکانے لگا اسے۔ اور اٹھالو لونڈیا کو۔

اس نے دیکھا ایک بندوق بردار اس کا نشانہ لے رہا تھا۔ پل بھر میں اس نے ایک فیصلہ کیا۔ سرعت سے مڑ کر اس نے ہر جیت کو اپنے سے الگ کیا۔ لپک کر کرپان نکالی اور آن واحد میں وہ کرپان ہر جیت کے پیٹ میں اتار دی۔

وہ جو نشانہ لے رہا تھا۔ بندوق اس کے ہاتھوں میں لرز کر رہ گئی۔ اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔ مشعلوں میں روشن آگ کچھ تیز ہو چلی تھی۔ فرش پر ہر جیت آخری سانس لیتے ہوئے تڑپ رہی تھی اور مشعلوں کی روشنی میں ماں اور بیٹی دونوں کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

☆☆☆

گنبد کے کبوتر

— شوکت حیات

بے ٹھکانا کبوتروں کا غول آسمان میں پرواز کر رہا تھا۔

متواتر اُڑتا جا رہا تھا۔ اوپر سے نیچے آتا، بے تابی اور بے چینی سے اپنا آشیانہ ڈھونڈتا اور پھر پرانے گنبد کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب اُڑ جاتا۔

اُڑتے اُڑتے ان کے بازو شل ہو گئے۔ جسم کا سارا لہو آنکھوں میں سمٹ آیا۔ بس ایک اُبال کی دیر تھی کہ چاروں طرف......

لیکن یہ پڑوسیوں کے بچے بھی کم بدمعاش نہیں۔ مرغیوں کے ڈربے میں آدمی رہنے پر مجبور ہو جائیں اور مرغیاں وسیع و عریض ہال میں چہل قدمی کرنے کی سعادت حاصل کر لیں تو کئی باتوں پر نئے سرے سے غور کرنا ہوتا ہے...... لیکن بچے تو بچے ٹھہرے۔ اپارٹمنٹ کے بچے ہوں یا عام قصباتی گلیوں اور جھونپڑ پٹیوں کے بچے۔

بچے بھی اتنے بے ہنگم ہوتے ہیں ...... اتنا شور مچاتے ہیں ...... سارے فلیٹ کو سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ لیکن سر پر اُٹھانے کے لیے شہر کے سب سے بڑے اپارٹمنٹ کا سب سے چھوٹا ون بیڈ روم یونٹ بھی اس کا فلیٹ ہی تھا، جس میں کھیل کود کی سب سے کم گنجائش تھی۔ کارپیٹ ایریا کے نام پر چند انسانوں کے سانس لینے کے لیے جسم کے ہلنے ڈلنے بھر کی جگہ دی گئی تھی۔ چاروں طرف سے بند ڈربے۔ بس ایک چھوٹی سی بالکنی ہی راحت پہونچاتی تھی، جس کے بڑے حصے میں متعدد گملے سجے ہوئے تھے۔ گملوں میں انواع و اقسام کے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ گلاب، چنبیلی، زنّیا، کروٹن اور...... جینے کی آرزو کے استعارے۔

دن بھر کا تھکا ماندہ، ہانپتے کانپتے بغیر لفٹ سے اپارٹمنٹ کی چوتھی منزل پر پہونچ کر وہ اپنے فلیٹ کی کال بیل بجاتا، بدحواسی پورے وجود پر طاری ہوتی۔

بچے پیروں سے لپٹتے، کاندھوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے۔

''تم لوگ اب تک کلچرڈ نہیں ہو سکے...... دوسرے بچوں کو دیکھو...... سیکھو کچھ اُن سے ...... کس طرح نہ ہونے کی طرح ہوتے ہیں۔ یہی تو ان کی شناخت ہے......!''

لیکن چھوٹی سی بالکنی میں آ کر بیٹھ جاؤ...... گرم گرم چائے کی ایک پیالی مل جائے اور بچے خاموش اور مصروف ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ جنت میں اس سے زیادہ لطف آئے گا بھلا...... ساری تکان دُور ہو جاتی ہے۔

اپارٹمنٹ کے کیمپس میں بڑے سے پیپل کے درخت کو بلڈر نے اپنی جگہ سالم چھوڑ دیا تھا۔ اس کی ایک شاخ اس کی بالکنی تک پھیلی ہوئی تھی۔ سیمنٹ کے اس پہاڑ کے ساتھ پیپل کے درخت کا کولاژ جدید مصوری کے شاہکار نمونے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

گوریّوں کا جھنڈ چہچہاتا ہوا اپارٹمنٹ کی اس بالکنی میں منڈلاتا رہتا اور زندگی کی خوبصورتی کے گیت گاتا۔ ایک نٹ کھٹ گلہری تیزی سے آتی اور شرارت بھری آنکھوں سے اُسے گھورتی ہوئی پیپل کے درخت کی ٹہنی کے راستے پیڑ پر واپس چل دیتی۔ ہواؤں کی خنکی میں سورج کی سنہری کرنوں کی گرمی من پسند دل ربا اور سیم تن کی گرمی سے ذائقہ دار ہم آمیزی کا لطف دیتی۔

زندگی اتنی سفاک نہ بن......

سب کچھ داؤں پر لگا کر تجھے حاصل کیا ہے

یا ہنوز تجھے پانے کی جستجو میں ہوں......

وہ دھیمے دھیمے سُر میں گنگناتا۔

وہسکی اور بیئر کو ملا دو تو اس کی تلخی دماغ کو جھنجھناتا ہوا لطف عطا کرتی ہے۔ سارا وجود ہلکا ہو کر آسمان میں اُڑنے لگتا ہے۔ اُوپر سے دیکھنے پر زمین پر چلنے والے لوگ کتنے بونے نظر آنے لگتے ہیں۔

ہوائیں تیز چلنے لگیں۔ پیپل کے پتے ہلنے لگے۔ پیپلیاں ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ گوریّوں کی چہچہاٹ معمول سے مختلف سماعتی پیکر اختیار کر رہی تھی۔

بغل والا پڑوسی کہہ رہا تھا۔

''اس بار پچھلے سال والا اُبال نہیں۔ دن خیریت سے کٹ جائے گا۔ موسم ٹھیک ہے۔ جینے کی چاہت قائم ہے...... آپ بھی مزے سے رہیے۔ نو پرابلم......!''

اپارٹمنٹ کے تمام بچوں کو میرے ہی فلیٹ میں مجمع لگانا تھا۔ اُن کی کوئی کانفرنس ہے کیا۔ ٹو بیڈ روم اور تھری بیڈ روم کے بڑے بڑے فلیٹ چھوڑ کر ون بیڈ روم فلیٹ میں اُن کا جماؤ...... ہر جگہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے...... لیکن یہ تمام چھوٹی مچھلیاں مل کر بڑی مچھلی کا روپ دھارن کر لیں تو......!

ٹیلی ویژن آن تھا۔ پرائیوٹ چینل کے پروگرام چل رہے تھے۔ دودھیا اسکرین پر تاریخ کی طویل صدیاں لمحوں کی نوک پر خود بخود آخری ہچکی لے رہی تھیں۔

''کوئی تو سمجھائے ان بچوں کو جا کر۔ ناگفتہ بہ حالات میں کیا آسمان سر پر اُٹھا لینے کا ارادہ ہے...... مجھے ڈر ہے! میرے پودوں، چھوٹی چھوٹی کونپلوں، کلیوں، پھولوں اور تلسی کی پتیوں، میرے گملوں پر کوئی ضرب نہ آجائے...... بڑی محنت سے انہیں سینچا ہے...... اجی سنتی ہو ...... ذرا دیکھو...... اچھا چھوڑو...... شریف آدمی کو تو مرنا ہی پڑتا ہے...... کچھ مت کہو...... بچے تو بچے ہی ہیں...... پڑوسیوں کے بچے...... ہمکیں گے بھی تو کس حد تک جائیں گے......!''

بغل والے فلیٹ کے ینگ مین آف سکسٹی ٹو سین دادا کے ساتھ باہر نکلنے سے پہلے اُس نے بیوی سے بدبداتے ہوئے کہا۔ پھر اُن کے ساتھ چہل قدمی کرتے ہوئے دور تک نکل گیا۔ دادا بول رہے تھے۔

''ہاں صاحب! گھبرانے کی بات نہیں...... سب کچھ نارمل ڈھنگ سے ہو رہا ہے۔ اضطراری چیزیں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہتیں۔ امن و استقامت کی راہ اپنا کر ہی ہم اور آپ چین اور سکھ کی زندگی گزار سکتے ہیں...... میں تو پچھلے سال کے مقابلے میں بڑی تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ راوی چین اور راحت کی سانسیں لکھتا ہے!''

پرانے زمانے کے سین دادا اُس کے ساتھ ہوتے تو اُردو کے ثقیل الفاظ کچھ زیادہ ہی استعمال کرتے تھے۔

سڑک پر گاڑیاں معمول کے مطابق چل رہی تھیں۔ چھٹی کے دن چہل پہل کی جو کمی عام طور پر دیکھی جاتی ہے، وہ اُس روز بھی تھی۔

پڑوسی نے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

''ارے صاحب، کیوں سوگواری کا موڈ طاری کئے ہوئے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں آپ اپنی بالکنی میں بچوں کے اکٹھا ہونے سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ اپنے پودوں اور گملوں کے تحفظ

کے لیے بے چین ہیں ...... کچھ نہیں ہوگا۔آپ کے سارے گملے خیریت سے رہیں گے۔اب دوستوں سے ملنے چل رہے ہیں تو یوں اُداس نظر آنا چھوڑ یئے ...... انجوائے کیجئے ...... دیکھیے گول گول گنبدوں کی گولائی اور نوکیلے اُبھار ...... اُف ...... سامنے کے پُرکشش منظر سے جسم میں عجیب ترنگ پیدا ہو رہی ہے ...... ذرا دیکھئے آپ بھی ......!''

''اس عمر میں دادا آپ ......!''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کا دل دوسرے گنبدوں میں اُلجھا ہوا ہولناک کیفیات سے گزر رہا تھا۔سین دادا نرم وگداز جسمانی گنبدوں میں ٹا مک ٹوئیے مارتے ہوئے چٹخارے بھر رہے تھے۔

''عمر کی کیا بات کرتے ہو ...... ہمیشہ خود کو جوان سمجھو ...... یہی زندگی ہے ...... دیکھنا اور دیکھتے ہوئے ان رنگین تصویروں میں ڈوب جانا اور بار بار ڈوبنا اُبھرنا ......!''

سین دادا نے پھر کہا۔

''ینگ مین، تم جوانی میں بوڑھا ہو گیا ...... ذرا نظر تو اُٹھا، ......!''

سین دادا نے اُس کے شانے پر اپنی انگلیوں کی گرفت سخت کر دی۔

آگے تین قیامتیں فاختاؤں کی چال چلتی ہوئی گپ شپ میں مصروف تھیں۔

''سین دادا آپ ان فاختاؤں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ ذرا اُوپر دیکھئے۔ بے ٹھکانا کبوتروں کا غول مستقل آسمان میں چکر کاٹ رہا ہے۔اپنے مستقر کے بے دردی اور بربریت کے ساتھ مسمار کر کے غایب کر دیئے جانے کے بعد کیسی بے گھری اور بے امانی جھیل رہا ہے۔ آپ ان کبوتروں کی آنکھیں دیکھ رہے ہیں ...... ان میں اترتا خون، بے چارگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپتی ہوئی آرزوئیں محسوس کر رہے ہیں ......!''

سین دادا اپنی دھن میں مگن تھے۔آسمان کی طرف نظر اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی۔ اُن کے پاس تو پوری زمین تھی اور زمین پر آسمانی جلوے موجود تھے ...... وہ ان سن رسیدہ لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں سے بیویوں کے مرجانے کے بعد بھی شہوت کے شرارے پھوٹتے رہتے ہیں۔

اسے یاد آیا کہ ایک روز جب گارڈ نے اطلاع دی کہ اپارٹمنٹ کے نیچے ایک سانپ نظر آیا ہے تو سب پر وحشت طاری ہو گئی تھی۔ پورے اپارٹمنٹ میں ریڈ الرٹ کر دیا گیا تھا۔

لوگ رات بھر سو نہیں پائے۔ ادھر اُدھر سے مانگ کر ڈنڈے اور لاٹھیاں جمع کر لی گئیں۔ کھڑکی دروازے سب کے سب مقفل تھے۔ آنکھیں پہرے دے رہی تھیں لیکن ہر آن یہ ڈر تھا کہ روشنی گل ہو گئی یا آنکھیں لگ گئیں تو پتہ نہیں سانپ کس کو ڈس لے۔

اسے تو بس اس بات کی فکر تھی کہ اس کی بالکنی میں آنے والی گلہری اور گوریوں کا جھنڈ متوحش نہ ہو جائے۔ کہیں سانپ انہیں نہ ڈس لے۔ مبادا اُس کے رنگ برنگ پھولوں والے گملوں، گلہریوں اور گوریوں سے جو کولاژ بنتا ہے، اس پر سیاہ بادل نہ منڈلانے لگیں۔

وہ چپ چاپ لوہے کی ایک چھڑ لے کر اپنی بالکنی میں جا کر بیٹھ گیا۔ بالکنی میں گوریوں نے چھوٹا سا گھونسلہ بنا رکھا تھا۔ چوں چوں کی آوازیں رنگین روشن فواروں کی طرح پھوٹ رہی تھیں۔ اُس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اس کے ایک ہاتھ میں تین سیل والی ٹارچ تھی۔ اُس کی بیوی بک بک کرتی رہی۔ اُسے بھلا برا کہتی رہی۔ بالکنی سے ہٹنے کی ہدایت دیتی رہی۔ اُس نے طرح طرح سے اُسے سانپ کے زہر سے ڈرانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ آخر کار اُسے کہنا پڑا کہ اگر بہت ڈر لگ رہا ہے تو بالکنی کا دروازہ اندر سے بند کر لے۔ وہ گوریوں کے گھونسلے کی حفاظت پر مامور رہے گا۔ بہت دیر تک اُس کی بیوی بچے منت سماجت کرتے رہے، اُسے خبطی اور بے وقوف قرار دیتے رہے لیکن اس نے گوریوں کی ننھی سی جانوں سے لاپرواہی کے لیے خود کو کسی قیمت پر آمادہ نہیں کیا۔

کسی فلیٹ میں سانپ نہیں ملا۔ تمام کونے کھدرے جھاڑے گئے۔ بکس اور کپ بورڈ کی چھان پھٹک کی گئی۔ بچے تو بچے ہی ٹھہرے۔ کچھ دیر تک سانپ کا چکر انہیں دلچسپ تماشے کی طرح لگا۔ بڑوں کے کاموں میں وہ پوری تندہی کے ساتھ ہاتھ بٹاتے رہے۔ بعد ازاں سب کے سب تھک کر جہاں تہاں سو گئے ...... بڑے بوڑھے رات بھر جاگتے رہے اور بالآخر صبح ہونے پر سب کے سب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ ایک افواہ تھی جو انہیں رات بھر پریشانیوں میں مبتلا رکھنے کے لیے اُڑائی گئی تھی۔ تفتیش کی گئی کہ سب سے پہلے یہ خبر کس نے اُڑائی تھی۔ آخر کار اپارٹمنٹ کا گارڈ شک کے گھیرے میں آ گیا۔ سب اسی کی کرتوت ہے۔ محافظت کی ذمہ داری میں وہ گھپلا کر رہا ہے۔

صبح کی نرم و نازک ہواؤں کے ساتھ تتلیاں اُڑتی ہوئی پھولوں کی طرف آئیں۔ بھنورے پھولوں کا چکر کاٹنے لگے۔ گھونسلے سے گوریوں کے جھنڈ نے دانہ چگنے کے لیے اُڑان

بھری۔ سورج کی نرم کچی کرنوں نے اُس کی بالکنی کو گلے لگایا تو اُسے محسوس ہوا کہ جینے کے جواز ابھی ختم نہیں ہوئے۔

''دادا میرا دل نہیں لگ رہا ہے...... اب واپس چلیں...... نہ معلوم میرے پھولوں کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ بچوں کی بھیڑ کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے......!''

''تم خواہ مخواہ وہمی ہو گئے۔ کسی نہ کسی فلیٹ میں سب برابر اکٹھا ہوتے ہیں۔ اس بار تمہارے فلیٹ کی باری ہے۔ آخر تمہارے بچے بھی تو ان میں شامل ہیں...... گھبرانے کی کیا بات ہے......!''

''دادا...... میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا ہے...... یہ بے اماں کبوتروں کا اُڑتا ہوا غول دماغ میں عجیب قسم کی وحشت پیدا کر رہا ہے۔ اُن کی جائے اماں ان سے چھن گئی۔ گنبدوں کی بلندی دھول چاٹ رہی ہے۔ یہ کبوتر اب کہاں جائیں دادا...... اُنہیں کہاں آسرا ملے گا......؟''

''تم ینگ مین...... پازیٹو ہو کر سوچو تو ہر جگہ ٹھکانا ہی ٹھکانا ہے...... گنبد، پہاڑوں کی سفاک چوٹیاں، پتھریلے غار اور گھنے جنگل کے درختوں کی ڈالیاں...... موسموں کے سرد و گرم جھیلنے کے لیے تیار رہو...... یار، اپنی کھال تھوڑی کھر کھری بناؤ......!''

ہر طرف اندر ہی اندر مختلف آہٹیں تھیں...... کہیں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، کہیں شہنائی پر ماتمی دُھن بج رہی تھی۔ ایک مدت کے بعد وہ عجیب و غریب لمحہ ایک نقطے پر منجمد ہو گیا تھا، جہاں سے بیک وقت خوشیوں اور غم کے دھارے پھوٹ رہے تھے۔ بظاہر چاروں طرف سراسمگی اور گہرا سناٹا تھا جو آنے والے بڑے طوفان کا نقیب معلوم ہو رہا تھا۔

سین دادا دونوں جذبوں سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان پر شہوانی جذبات حاوی تھے۔ جن دوستوں کے یہاں جا رہے تھے، ان کی عورتوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کئی جگہوں سے ہوتے ہوئے وہ دونوں مسٹر تھامسن کے گھر پہونچے...... مسٹر تھامسن مہمان نواز انسان تھے۔ اُنہوں نے جھٹ نئی بوتل نکال لی۔ گلاس سامنے رکھ دیئے۔ اُن کے گھر کی نوجوان خادمہ مس ریزہ بڑی پھرتی سے ہر کام میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔

جھٹ پٹ اس نے فریج میں رکھے ہوئے گوشت کے قتلے کئے اور انہیں فرائی کر کے اُن کے آگے رکھ دیا۔ گرم گوشت سے اُٹھتی ہوئی بھاپ سے سین دادا کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ مسٹر تھامسن پہلے ہی سے شغل میں مصروف تھے۔ اُن کا نشہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ سین

دادا بھی مست ہو رہے تھے۔ اُن سے برداشت نہ ہوا۔ اُنہوں نے نیم برشٹ کا جو کی پلیٹ لاتی ہوئی مس ریزہ کی ننگی گرم پنڈلی پر اپنی لرزتی ہوئی انگلیاں رکھ دیں۔

اس نے بڑے پیار سے سین دادا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت بھرا بوسہ دیا اور اُن کا پیگ بنا کر گلاس اُن کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کی مدت کی پیاس بجھ گئی۔ دل کو قرار آ گیا۔ دوسرے ہی لمحے اُن کی تڑپ اور شدت اختیار کر گئی۔ شریانوں میں خون کا دباؤ بڑھ گیا...... اُن کی انگلیاں ایک بار پھر مس ریزہ کی برہنہ پنڈلی کو چھوتی ہوئی اس کی سڈول جانگھوں کی طرف رینگنے لگیں۔

مس ریزہ کچھ دیر مبہوت رہی۔ کوئی تاثر اُس کے چہرے پر نہیں تھا۔ اُس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اُن کی انگلیاں اور آگے بڑھنے لگیں۔

مس ریزہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔

دراصل مس ریزہ سین دادا کو دیکھ کر ماضی کی وادیوں میں کھو گئی تھیں۔ اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگا تھا۔

''مائی لِوِنگ ڈوٹر ریزہ......

لائف اِز اینڈلس اسکائی......

یو ہیو ٹو گو لانگ وے...... ویری لانگ......''

اس کے مشفق باپ کی آنکھوں میں کیسے کیسے خواب تھے۔ وہ باپ سے لپٹ گئی...... ننھے ننھے پیروں سے اس کے کندھوں پر چڑھ گئی...... مسٹر سین کے چہرے کی اس کے باپ سے مشابہت نے اسے چشم زدن میں اُن کے قریب کر دیا تھا...... بعدازاں اس کے باپ نے تابوت میں سکونت اختیار کر لی۔ ہواؤں کے دوش پر اُڑتی ہوئی پتی کی طرح کئی جگہوں سے ہو کر اُسے تھامسن کے یہاں آسرا ملا تھا جو اس علاقے میں بڑا عزت دار شخص گردانا جاتا تھا...... یہاں اُسے بہت دباؤ اور جبر میں ہنستے اور خوش دکھتے ہوئے خود کو تھامسن کے حوالے کرنا پڑا تھا۔

اس کے لیے کوئی اور راستہ بھی نہ تھا...... کئی دروازے اُس نے بدلے تھے۔ ہر دروازے پر زبانیں لپلپاتے، رال ٹپکاتے، سرخ آنکھوں والے حیوان موجود تھے۔ پھر مسٹر تھامسن کیا بُرے تھے۔ صاف ستھرے خوشبودار انسان۔ ان کے لمس میں کم از کم اُسے جمالیاتی

طور پر کسی کراہیت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ سین دادا مس ریزہ کی ان کیفیات سے بے خبر سرشاری اور لذت یابی کی اپنی دنیا میں محو تھے۔ وفورِ جذبات سے اُن کی پلکیں مُند نے لگی تھیں ...... مس ریزہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُن کے نزدیک کھڑی تھی۔ نشہ کی حالت میں بھی مسٹر تھامسن نے سین دادا کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ایک دریادل انسان تھے۔ شراب و کباب میں تو دوسروں کی شرکت پسند کرتے تھے، لیکن اور کسی نجی چیز میں اُنہیں کسی کی حصہ داری منظور نہ تھی۔

انہوں نے خشم گیں نگاہوں سے مس ریزہ کی طرف دیکھا۔ مس ریزہ جس کی آنکھوں میں سین دادا کے لیے ہمدردی اُمنڈ آئی تھی، تھامسن کی کیفیت دیکھ کر سٹپٹا گئی اور خالی پلیٹ اُٹھا کر آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ پھر وہ نظر نہ آئی۔ یہاں تک کہ ضرورت پڑنے پر مسٹر تھامسن کو اُسے چیخ کر بلانا پڑا۔

اُس نے سوچا، اُس کے اور مس ریزہ کے دکھ میں کس کا دکھ بڑا ہے۔ غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتروں کا غول اس کے سر پر منڈلانے لگا۔ اس نے ہامی بھری۔ اس سے بڑا غم تو ان بے اماں کبوتروں کا ہے جنہیں اب ساری عمر ہجرت کا عذاب جھیلنا ہے ...... کئی نسلوں سے وہ ان گنبدوں کے باشندے تھے...... لیکن اب ......

اُسے سین دادا اور مسٹر تھامسن کی مئے نوشی پر غصہ آنے لگا۔ سین دادا بولتے ہیں ینگ مین غم بھلاؤ...... انجوائے کرو...... ایسے حالات میں بھلا کوئی انجوائے کرسکتا ہے......

اندرون خانہ سے برتنوں کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔

متوحش سی ریزہ دوڑتی ہوئی آئی۔

''انکل ...... ایک کبوتر گھر کے اندر داخل ہوگیا ہے...... بغل والے پڑوسی کی بلی اس پر جھپٹنا چاہ رہی تھی...... کبوتر کچن میں برتنوں کے بیچ چھپ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے بلی کو بھگایا اور کچن کا دروازہ بند کرکے آرہی ہوں ......!''

اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس نے سین دادا کی آنکھوں میں جھانکا پھر تھامسن کو دیکھا۔ نشے کی چمک ہونے کے باوجود اُن کی آنکھوں میں کبوتر کے بارے میں سن کر سراسیمگی پیدا ہوگئی تھی۔ دونوں کے سر جھک گئے جیسے کوئی افتاد آپڑی ہو۔

اسی وقت باہر کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

''مسٹر تھامسن ...... مسٹر تھامسن ......!''

اُداس اور سراسیمہ ریزہ نے دروازہ کھولا۔

پڑوسی مسٹر جان کھڑے تھے۔

'مس ریزہ...... مسٹر تھامسن کو بلاؤ......!''

''کیا ہے بھائی ......!'' مسٹر تھامسن نشے میں جھومتے ہوئے بھاری قدموں سے باہر آئے۔

''میرا کبوتر آپ کے یہاں آ گیا ہے...... آپ جانتے ہیں کہ میری مدر اِن لا پرانی مریض ہیں...... آج کل ان کے ہاتھوں میں سنسناہٹ رہتی ہے۔ ڈاکٹر نے کبوتر کا جوس تجویز کیا ہے...... اسے ذبح کر ہی رہا تھا کہ اُڑ کر آپ کے یہاں چلا آیا......''

''ہاں ...... ہاں ...... میرے یہاں آ کر چھپ گیا ہے...... ابھی ابھی مس ریزہ نے مجھے رپورٹ دی ہے...... ایک بلی بھی ہے جو اس کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے...... مس ریزہ جاؤ ...... ان کا کبوتر انہیں واپس کر دو...... آیئے ...... آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں مسٹر جان...... کچھ ہو جائے جب تک!''

''اوہ نو تھینکس ...... میں صرف ویک اینڈ میں لیتا ہوں ...... دوسرے روز چھٹی رہتی ہے ...... سویرے اُٹھنے کا چکر نہیں ہوتا ...... کمبخت کو لینے سے مجھے نیند نہیں آتی ہے......!''

ہزار اندرونی شکست وریخت سے گزرنے کے بعد ناچار مس ریزہ کبوتر کو پکڑ کر لے آئی تھی...... لیکن اُس نے دیکھا کہ اُس کے پورے وجود پر کپکپاہٹ طاری تھی ...... مسٹر تھامسن نے اُس کی آوازوں کو سُنا ...... بہت دنوں سے وہ اُسے خود سے اسی طرح کی باتیں کہتے ہوئے سُن رہا تھا...... خاموش نگاہوں سے وہ بدبدا رہی تھی۔

......لڑ نہیں سکتا تو بھاگ جانا نامراد...... اُڑ جا...... بستیوں سے دُور وسیع آسمانوں اور جنگلوں کی طرف بھاگ......

لیکن سہما ہوا کبوتر اُس کی ہتھیلیوں میں سکڑتا سمٹتا چھپنے کی کوشش میں مصروف تھا...... اور جب مسٹر جان نے 'تھینک یو...... تھینک یو......' کہتے ہوئے اُسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مس ریزہ کے اندرون سے کسی نے اُچھال لگائی۔

اس منظر نامے میں اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس میں لرزش زیادہ تھی ...... کبوتر میں یا مس ریزہ میں ...... یا وہ خود زیادہ لرز رہا تھا ...... یہ کبوتر کہیں ...... اچانک اُسے خیال آیا۔

بے اماں کبوتر ...... شاید ان میں سے ایک بوڑھی عورت کے ہاتھوں کو حرارت پہونچانے کے لیے مذبح کا اسیر ہو گیا......

مس ریزہ نے ہتھیلیاں ڈھیلی کر دیں۔ اس کے اندر کسی نے اچھل کر جیسے اُس کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا۔

لڑ نہیں سکتے تو کم از کم بھاگ تو سکتے ہو...... ہائے نامراد ......تو نے یہ صلاحیت بھی کھو دی......!

کبوتر اڑا اور روشن دان پر جا کر بیٹھ گیا۔

مسٹر تھامسن نے ایک طمانچہ اُس کے گال پر جڑ دیا۔ وہ بے حد غصے میں تھے۔ مس ریزہ پر سکتہ طاری ہو گیا...... تھامسن نے ٹیبل پر اسٹول رکھ کر اُسے پکڑنے کا حکم دیا۔ اس کوشش میں اسٹول کھسکنے سے مس ریزہ گری...... اسے شدید چوٹیں آئیں ...... سین دادا اُسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھے لیکن تب تک مسٹر تھامسن نے بڑھ کر اُسے اٹھالیا تھا...... ان کے سینے سے لگی ہوئی مس ریزہ کانپ رہی تھی۔

وہ دونوں اُٹھ گئے۔

''اجازت ہے مسٹر تھامسن ...... آپ کی محفل میں بڑا لطف آیا......!''

''لیکن یہ صاحب تو اتنے سوگوار ہیں کہ انہوں نے کوئی مزہ نہ لیا......!''

سین دادا نے بڑے پیار سے اُس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا ویسے کنکھیوں سے وہ مستقل کانپتی ہوئی مس ریزہ کو دیکھے جا رہے تھے۔

''اُس کی اداسی برحق ہے...... لیکن میرا کہنا ہے کہ خواہ مخواہ اُداس ہونے کا فائدہ کیا ہے ......کوئی راستہ نکلتا تو ٹھیک تھا...... آپ کے پاس لایا تھا کہ انگور کی بیٹی کے ساتھ شغل کرے گا تو بہل جائے گا...... لیکن یہاں کبوتر اور بلی کا تماشا دیکھ کر یہ اور بھی اُداس ہو گیا...... کوئی بات نہیں ......اپنی اپنی قسمت ہے...... آپ نے بڑی فیاضی دکھائی...... اس گرما گرم محبت کا شکریہ!''

رخصت ہونے سے قبل اُنہوں نے مس ریزہ کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا جو اس متوحش انداز میں بھی بلا کی حسین لگ رہی تھی......

''بائی بائی ریزہ..... بائی مسٹر تھامسن..... گڈ نائٹ.....!''

اس روز کئی دوستوں کے یہاں دونوں گئے تھے۔ سب نے اُس روز کے اہم ترین واقعے پر بات چیت کرنے سے گریز کیا تھا۔ لوگ دل ہی دل میں یا تو رو رہے تھے یا ہنس رہے تھے۔ عجیب بے بسی اور دلی خوشی کی کیفیتیں تھیں جن سے مختلف لوگ اپنے اپنے حساب سے گزر رہے تھے لیکن تمام کیفیات اور بے نیازی کے باوجود ایک سوال سب کو کرید رہا تھا۔

''اب کیا ہوگا..... آئندہ کیا ہونے والا ہے.....؟''

وہ اوب گیا تھا۔ تھامسن کے یہاں اس نے بھی مئے نوشی کی لیکن اُسے نشہ آنا تو دور، ہلکا خمار تک نہ ہوا۔ رہ رہ کر اُسے اپنے گملوں کے پودے، بالکنی اور بچوں کے اجتماع کا خیال آرہا تھا۔ ایک عجیب تشویش میں وہ تمام وقت مبتلا رہا۔

اس علاقے کے تمام دوستوں کے یہاں سین دادا نے جی بھر کر انجوائے کرنے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا۔ اُن کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ گلابی نشہ پورے وجود پر طاری تھا۔ ریزہ کی لحاتی قربت نے اُنہیں عجیب کیف و سرور سے سرشار کر رکھا تھا پھر بھی اتنا ہوش اُنہیں تھا کہ ہم سفر کی چارہ جوئی کرنی ہے۔ اُسے اپنے پھولوں، پودوں اور گملوں کی سالمیت کے تعلق سے ڈھارس بندھاتی ہے۔ راستے بھر ان کا انداز پچکارنے اور دلارنے والا رہا۔

''گھبراؤ نہیں بچے..... سب ٹھیک ہو جائے گا!''

گیٹ پر اپارٹمنٹ کے گارڈ نے اُن کے داخل ہونے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر اُس نے سین دادا کو سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑتے۔ تیسری منزل پر بہ دقت تمام اُس نے دادا کی جیب سے اُن کی فلیٹ کی چابی نکال کر ان کا انٹرلاک کھولا۔ اُنہیں ان کے فلیٹ کے اندر داخل کیا۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ دادا نے اندر سے چٹخنی لگالی ہے، وہ اپنے فلیٹ کی جانب روانہ ہوا۔ اُوپر کی منزل کی سیڑھیاں طے کرتے ہوئے اُس کے قدم کانپ رہے تھے۔ دل ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔

کال بیل بجانے پر بیوی نے دروازہ کھولا تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی لگیں جیسے بہت دیر سے روتی رہی ہو۔

''کیا حال ہے میرے پھولوں کا......؟''

''خود دیکھ لو جا کر......!''

بچے اپنے بستروں میں گہری نیند میں مبتلا تھے۔ سب کے چہروں پر ایسی اذیتیں جیسے کوئی ڈراؤنا اور تکلیف دہ خواب دیکھ رہے ہوں۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... اس کے جسم میں کاٹو تو لہو نہیں۔ بالکنی کے کھلتے ہی وہاں کے ٹوٹے پھوٹے منتشر حالِ زار نے اُسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ نُچے ہوئے پھول، موزائک کے فرش پر مسلی کچلی بکھری ہوئی پھولوں کی پنکھڑیاں ...... ٹوٹے پھوٹے گملے ...... گملوں کی مٹیوں کے جابجا ڈھیر...... گوریّوں کے گھونسلوں کے منتشر تنکے...... گوریوں کا کوئی پتہ نہیں تھا...... گلہریاں، تتلیاں اور بھنورے تو اب ایک مدت تک دکھائی نہیں دیں گے ......اس کی بالکنی کا سارا حسن ملیا میٹ ہو چکا تھا......

آخر بچوں نے اپنے کھیل میں میرا سب کچھ......

اس کا اندیشہ صحیح نکلا۔ اُس دن اپارٹمنٹ میں گھسے سانپ کو چند بچوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا اور اس سے کھیلنے کے خطرناک عمل کے عادی ہو گئے تھے۔ اسی لیے تو بچے اتنے زہریلے اور وحشی ہو گئے تھے۔

آسمان میں گنبد کے خون آلود کبوتروں کا غول مستقل جائے اماں کی تلاش اور کچھ کر گزرنے کے جنون میں چکر کاٹ رہا تھا۔

بیوی سے اُس کی نگاہیں ملیں تو اُسے اچانک احساس ہوا کہ گھر میں میت پڑی ہے اور باہر کرفیو میں اس کی تدفین ایک سنگین مسئلہ ہے۔

☆☆☆

لکڑ بگھا چُپ ہو گیا

— سید محمد اشرف

اسٹیشن سے گاڑی نکلے ابھی ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ سینکڑوں فولادی قینچیوں پہ چلتی ریل گاڑی نے سیٹی بجائی۔ انجن سے گارڈ کے ڈبے تک سارے ڈبوں کے بریک چرچرائے اور شروع ہوتی برساتی رات تلے روشن اور نیم روشن کوپے چُپ کھڑے ہو گئے۔ ریل کے شور میں دبی مسافروں کی آوازیں اچانک بلند اور واضح ہو گئی تھیں۔

کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ ماہوٹ کی بارش کا پانی ڈبے کی چھت سے بہہ کر شیشوں تک آتا، بوند بوند کر کے آہستہ آہستہ نیچے سرکتا اور جب کئی بوندیں کسی جگہ مل جاتیں تو ایک بڑی بوند بن کر نم لکیر بناتا کھڑکی کے نچلے حصے کی طرف بہتا چلا جاتا۔ اسے یہ کھیل دیکھنے میں مزا آ رہا تھا۔

''کیوں رُک گئی؟'' نانا نے برابر والے سے پوچھا۔

وہ نانا کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا، کسمسایا اور پھر بوندوں کا کھیل دیکھنے لگا۔

''کیا معلوم...... کالج کے لونڈوں نے زنجیر کھینچ دی ہوگی۔'' سامنے بیٹھا مونچھوں والا مسافر بولا۔

''آج تو اتوار تھا۔ کوئی اور بات ہے۔ ذرا دیکھنا بھائی۔ کیا چکّر ہے؟''

''باہر بہت بارش ہے بڑے میاں۔'' کچھا کھچ بھرڈبے میں وہ جگہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

نانا نے کھڑکی اوپر سرکائی ہی تھی کہ ٹھنڈی ہوا اور تیز بوچھار اندر گھس آئے۔ کئی مسافروں نے احتجاج کیا، لیکن نانا نے کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھ ہی لیا۔ نانا کی گردن کے نیچے سے سر نکال کر اُس نے بھی دیکھا۔ خاموش برساتی رات میں آؤٹر سگنل کی سُرخ آنکھ روشن تھی۔ وہ ڈر گیا اور سر اندر کر کے چُپ چاپ بیٹھ گیا۔ نانا نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ ان کے اور قریب سرک آیا۔

ایک دم کالی رات میں لال لال روشنی!

سامنے بیٹھی اُس سے ذرا بڑی عمر کی لڑکی اسکارف میں چپکے سے مُسکرائی۔ وہ اس کی طرف بہت دیر سے دیکھ رہی تھی اور اس کا ڈر محسوس کر رہی تھی۔ لڑکی کو مسکراتا دیکھ کر اُسے شرمندگی محسوس ہوئی۔

''ڈبل لائن ہوتی تو گاڑی ایسے ہی تھوڑے رُک جاتی۔'' نانا نے چہرے کا پانی رومال سے خشک کرتے ہوئے سوچا۔

یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ گاڑی کی لائن تو ڈبل ہی ہوتی ہے۔ اکیلی پٹری پر گاڑی کے دونوں طرف کے پہیّے بھلا کیسے چل سکتے ہیں۔

نانا کی طرف اُس نے پوچھنے والے انداز سے دیکھا۔

مونچھوں والا اس کا سوال سمجھ گیا۔

''ایسا ہے بیٹے کہ اگر ایک ہی پٹری پر آنے جانے والی دونوں طرف کی گاڑیاں چلتی ہیں تو اگلے اسٹیشن پر اُدھر سے آنے والی گاڑی روک دیتے ہیں۔ جب ایک طرف کی گاڑی پاس ہو جاتی ہے تب دوسری طرف کی گاڑی چھوڑتے ہیں۔''

''تو ہماری گاڑی کیوں روک دی۔ ہماری گاڑی نے تو ابھی ابھی چلنا شروع کیا تھا۔'' اُس نے مونچھوں والے کے بجائے نانا سے سوال کیا۔

یہ بات اسکارف والی لڑکی کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ بھی بڑے میاں کے چہرے کی طرف جواب کے انتظار میں دیکھ رہی تھی۔

''دارصل اُدھر والی گاڑی ابھی اسٹیشن پر آئی نہیں ہوگی۔'' نانا نے بتایا اور جو شخص بہت دیر سے اوپری برتھ پر لیٹا ایک موٹی سی پرانی کتاب پڑھ رہا تھا، بولا:

''پٹری ایک اور گاڑیاں بہت ہیں اور کوئی گاڑی بھی اسٹیشن پر نہیں پہنچی، سب بیچ میں ہیں۔ اس لیے گاڑی روک دی۔ کون ہے جو روکتا ہے گاڑیاں؟''

اتنے حصّے کے سارے مسافر منہ اُٹھائے بے تکے جملے بولنے والے اُس شخص کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن پھر کتاب والا آدمی کچھ نہیں بولا۔

تب اُس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اُس نے نانا کا کندھا پکڑ کر بہت یقینی انداز میں کہا۔

''ہیں نانا۔ اسٹیشن بابو روکتے ہوں گے گاڑیاں؟''

''ہاں بیٹا۔''

وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ جو بات موٹی کتاب والا نہیں جانتا وہ اُسے معلوم تھی۔ اُس نے بہت فخر کے ساتھ اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اُس وقت اپنی چھوٹی بہن کے لیے بسکٹ کا ڈبہ کھول رہی تھی۔ معلوم نہیں اُس نے سُنا کہ نہیں۔

''چلتی ہوئی گاڑیاں اسٹیشن بابو روکتے ہیں۔'' اُس نے چلاّ کر کہا۔

نانا، مونچھوں والا، وہ لڑکی اور سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی آواز زور سے نکل گئی تھی۔ وہ بات بنانے کے لیے نانا کے رومال کا چوہا بنانے لگا۔ اور تب اُس نے دیکھا کہ اسکارف والی لڑکی نے اپنی بہن کی آنکھ سے بچا کر آدھے سے زیادہ بسکٹ اپنی فراک کی جیب میں رکھ لیے تھے۔ یہ دیکھ کر اُسے انجانا سا دُکھ ہوا۔ اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ دُور بستی کی روشنیاں بارش کے پسِ منظر میں آڑی ترچھی متحرک کرنیں بنا بنا کر چمک رہی تھیں۔

اچانک گاڑی سے تھوڑی دُور چاردیواری میں بنے مکان میں ایک بڑا بلب روشن ہوا۔ اُس روشنی میں اُس نے دیکھا کہ بڑے مکان میں بنے بڑے سے برآمدے میں ایک بڑی سی میز پر ایک بڑا کتا بڑا سا مُنہ پھاڑے کھڑا ہے۔

''نانا! نانا! دیکھیے میز پر کتا کھڑا ہے۔'' اُس نے نانا کا کندھا ہلا کر کہا۔

''نہیں بیٹے، یہ کُتا نہیں۔ لکڑ بگھا ہے۔ ایس۔ پی۔ صاحب نے اُس خونی لکڑ بھگے کو اکیلے مارا تھا۔ اُس کی کھال میں بھوسہ بھروا کر اپنے برآمدے میں سجاوٹ کے لیے لگا رکھا ہے۔''

''لکڑ بگھا کون ہوتا ہے نانا؟'' اُس نے ڈر محسوس کیا۔

تب اسکارف والی لڑکی نے جلدی سے کہا: ''لکڑ بگھا بھیڑیا ہوتا ہے۔''

''بھیڑیا کون ہوتا ہے؟''

بھیڑیا!!!'' وہ کچھ سوچنے لگی اور پھر بولی۔

''بھیڑیا اور لکڑ بگھا سب ایک جیسے جانور ہوتے ہیں۔''

تب مونچھوں والے نے کہا۔

''مگر یہ لکڑ بگھا ذرا الگ تھا۔ یہ ہنستا بھی تھا اور مرتے دم رویا بھی تھا۔''

''ارے......'' اُس کے مُنہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ اُس نے نانا کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

تب کتاب والا اُوپر سے بولا: ''اسی لیے جب اُس کی بُرائی بنی تو بُرائی بنانے والے نے کمال کر دیا۔ اُس کا مُنہ پھیلا کر جبڑوں میں ایک لکڑی کا تنکا اس طرح پھنسا دیا کہ مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کبھی لگتا ہے یہ ہنس رہا ہے، کبھی لگتا ہے مُنہ پھاڑے رو رہا ہے۔''

یہ سُن کر اُس کے بدن میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

کتاب والے نے بھاری آواز میں کہا تھا۔

''یہ ہمیشہ ہنستا ہی رہتا ہے۔ یہ ہمیشہ روتا ہی رہتا ہے۔''

اُس نے پہلے تو اسکارف والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر ہمّت کر کے آہستہ آہستہ نظریں اُدھر کیں اور کھڑکی کے باہر چاردیواری میں بنے مکان کے برآمدے میں رکھی میز پر کھڑے اس لکڑ بگھے کو دیکھا۔

اُسے لگا جیسے وہ ہنس رہا ہے۔ اُسے لگا جیسے وہ رو رہا ہے۔

اچانک کسی نے کھڑکی کے باہر سے چلّا کر کہا۔

''دروازہ کھلوادو بھائی صاحب۔ آخری گاڑی ہے۔ میرا جانا بہت ضروری ہے۔ میری مدد کرو خدا کے لئے۔''

نانا نے کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ رکھے رکھے باہر کھڑے اُس شخص کو دیکھا جو دھیمی روشنی کے باوجود بہت بیتاب نظر آرہا تھا۔

اُس نے ہنستے روتے لکڑ بھگّے کی جانب سے نگاہیں واپس کھینچیں اور دیکھا کہ دُھندلے شیشوں کے پیچھے وہ آدمی بارش میں بالکل شرابور ہو چکا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں پلاسٹک جیسا ایک تھیلا تھا جسے بچانے کے لیے وہ جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

''دروازہ نہیں کھُلے گا۔ اسٹیشن پر کیوں نہیں بیٹھ گیا تھا۔'' مونچھوں والا گرجا۔

باہر والے نے منہ پھیلا کر سانس کے زور سے پھونک مار کر بالوں اور چہرے سے بہتے پانی کی بوند کو دھکیلا اور ایسے چلّایا جیسے ڈوبتا ہوا آدمی چلّا تا ہے۔ ''دروازہ کھلوادو میں سب بتادوں گا۔ جلدی کرو بھائی صاحب جلدی، گاڑی چل دے گی۔''

''آج کل کا کوئی ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں کوئی چور اُچکا ہو۔ دروازہ مت کھلنے دینا۔'' ڈبّے کے اندر کوئی مسافر بولا تھا۔

اُس نے دیکھا نانا شش و پنج میں تھے۔

اب باہر والے نے تھیلا ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کا شیشہ پیٹنا شروع کر دیا تھا۔

''یہ مت کرو جی۔ صبح والی گاڑی سے چلے آنا۔ ڈبے میں ویسے ہی جگہ نہیں ہے۔'' نانا نے چلّا کر کہا۔

''دروازے میں بیٹھ جاؤں گا۔ بھائی کے لیے خون کی بوتل لے کر جا رہا ہوں۔ صبح اُس کا آپریشن ہے۔ نہیں پہنچا تو وہ مر جائے گا۔ جلدی کرو بابا گاڑی چلنے ہی والی ہے۔'' وہ رحم طلب نظروں سے سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بہروپیا ہے۔ جھوٹا ہے۔'' مونچھوں والا گرج کر بولا۔

اپنی گرج سے وہ باہر والے کو کم اندر والوں کو زیادہ ڈرانا چاہتا تھا تاکہ کوئی دروازہ نہ کھول سکے۔ دراصل ڈبہ کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ گیلری تک میں آدمی بھرے پڑے تھے۔ دروازے کا شیشہ اور شٹر سب بند تھے، اس لیے وہ دروازے سے ملی کھڑکی میں بیٹھے بڑے میاں سے رحم طلب کر رہا تھا۔

اسکارف والی لڑکی کی ماں اپنے کسی پچھلے سفر میں ملے چور کا ذکر بلند آواز میں کرنے لگی تھی۔

''میں چور نہیں ہوں۔ قسم سے میں چور نہیں ہوں۔'' بارش کے شور میں اُس کی آواز دب رہی تھی، اُبھر رہی تھی۔

نانا کے پہلو سے لگے لگے اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی رگیں کھنچ رہی ہیں اور کوئی چیز سینے میں بُری طرح گھُٹ رہی ہے۔

''نانا، نانا! دروازہ کھلوا دو۔ دیکھو اس کا بھائی مر جائے گا نانا، میں کھول آؤں؟''

''بیٹھے رہو تم۔'' نانا کے بولنے سے پہلے ہی مونچھوں والے نے ڈپٹ کر کہا۔ اُس نے سہمی سہمی نظروں سے مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ پھر نانا کی طرف دیکھا جو چپ چاپ تھے۔ پھر ڈرتے ڈرتے اسکارف والی کو دیکھا جو سب کچھ سُن رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی اور تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے باہر چار دیواری میں بنے مکان کے برآمدے میں میز پر کھڑے منہ پھاڑے لکڑ بگھے کو دیکھ لیتی تھی۔ اس کو اپنی طرف دیکھتا محسوس کر کے اسکارف والی نے اس

کی طرف دیکھا۔ اس بار وہ مسکرائی نہیں تھی۔ شاید اُس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ دروازہ کھول دیا جائے۔ اسکارف والی کو ایسا سوچتا محسوس کر کے اُس نے خود میں ہمت محسوس کی اور سوچا کہ یہ مونچھوں والا شخص بڑا کمینہ ہے۔ یہ تو خود چور سا لگتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب نانا نے گاڑی رُکنے کی وجہ جاننے کو کہا تھا تو کیسا بہانہ بنا رہا تھا کہ باہر بارش ہے۔ کوئی نیچے تھوڑی ہی اُتر کر دیکھنا تھا۔ اس کو ڈر لگ رہا تھا کہ کوئی اُس کے اُٹھتے ہی اُس کی جگہ پر نہ بیٹھ جائے۔ کمینہ۔ مونچھیں ہوتے ہوئے بھی ڈرتا ہے کہ باہر والا آئے گا تو جگہ گھیر لے گا اور اپنے بھیگے کپڑوں سے اُسے بھگو دے گا۔ جھوٹا، مکّار۔

نانا جو کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے اب کھڑکی کے شیشے سے رِستے پانی میں آہستہ آہستہ بھیگنے لگے تھے۔

کھڑکی کے شیشوں پر اب باہر والے نے جنونی انداز میں ہاتھ مارنا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے ہاتھ کی دھمک سے شیشوں پر چپکا پانی بار بار نانا کے کپڑوں پر چھلک آتا تھا۔

اچانک اُس کے ننھے سے ذہن میں ایک بجلی سے کوندی۔

''نانا! اسے دروازہ کھول کر اندر کرلو۔ اس کا بھائی مرگیا تو سب پر گناہ پڑے گا۔ اسے کھڑکی کے پاس بٹھا دینا تو تم پانی سے بھی بچ جاؤ گے۔ ہیں نانا۔''

نانا نے مونچھوں والے کا تاثر جاننے کے لیے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مونچھوں والے کے ماتھے کی رگیں اس تجویز پر کھلنے لگی تھیں اور چڑھی ہوئی آنکھوں کے انگارے ماند پڑنے لگے تھے اور آہستہ آہستہ چہرے کی سختی دور ہو رہی تھی۔

ننھے سے بچّے کے مدد کے جذبے کو دیکھ کر اور اپنی اپنی سیٹ محفوظ خیال کر کے سب مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اسکارف والی کی ماں نے بھی پچھلے سفر کے چور کا قصہ درمیان میں چھوڑ دیا تھا اور نظریں نیچی کر کے چھوٹی بچّی کو کمبل میں لپیٹنے والی تھی۔

باہر والا زور سے گھگھیا کر چیخا۔

''تم سب کو اپنے اپنے بھائیوں کا واسطہ دروازہ کھلوادو۔ بتّی ہری ہوگئی ہے۔ گاڑی چلنے والی ہے۔''

اُس نے نانا کی طرف دیکھا۔ تیزی سے اُٹھا، مسافروں کی ٹانگوں سے اُلجھتا، ٹکراتا گھوم کر دروازے پر پہنچا۔ مسافر ہاں ہاں کرتے ہی رہ گئے کہ اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر

والا بجلی کی طرح اندر آیا اور دروازہ بند کر کے زور زور سے ہانپنے لگا۔ وہ نیلے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھا جو بدن سے چپک کر رہ گئی تھی۔

''میں نے دروازہ کھولا۔'' اُس نے اس کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ کر کہا۔ نیلی قمیص والے نے اُس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ ایک ننھا سا فرشتہ ہو جو اپنے پنکھ گھر کی الماری میں بند کر آیا ہے۔

''ہمارے نانا کے پاس کھڑکی کی طرف بیٹھ جانا۔ نانا پر پانی آنے لگا ہے۔'' اُس نے کہا۔

نیلی قمیص والے نے تھیلا احتیاط سے رکھ کر اپنے کپڑے اُتارے۔ سردی میں تھرتھراتے بدن کے کانپتے ہاتھوں سے اپنے کپڑوں کو جھڑک کھول کر باہر نکال کر نچوڑا، پہنا اور تھیلا اُٹھا کر اس کے ساتھ آ کر نانا کے برابر کھڑکی کی طرف بیٹھ گیا، اور تھیلا گود میں رکھ لیا۔

مونچھوں والے نے ترچھی نظر کر کے، مشکوک انداز میں اُس کے تھیلے کی طرف دیکھا۔ پلاسٹک کے تھیلے میں خون کی بوتلیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ مونچھوں والے کو مایوسی ہوئی۔ وہ بڑبڑایا۔

''آخر جب سگنل ہو گئے تو گاڑی چلتی کیوں نہیں؟''

اس کا دل چاہا کہ گاڑی ابھی کچھ دیر اور کھڑی رہے۔ وہ لکڑ بھگے کو ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسکارف والی اپنی ماں سے پوچھ رہی تھی کہ اگر منہ میں پھنسا تنکا گر جائے تو کیا پھر بھی لکڑ بگھے کا منہ ایسا ہی کھلا رہے گا۔

''معلوم نہیں گاڑی کیوں رُکی کھڑی ہے کم بخت۔'' اُس کی ماں نے اونگھتے اونگھتے آنکھیں کھول کر کہا۔

اُدھر نانا نے اُسے بتانا شروع کیا۔

''یہ تو نہیں معلوم کہ یہ ہنسا کیوں تھا اور رویا کیوں تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب بھی جب تیز ہوائیں چلتی ہیں اور اس کے کھلے ہوئے منہ سے ہو کر گزرتی ہیں، تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ زور زور سے ہنس رہا ہے یا زور زور سے رو رہا ہے۔ پر بیٹا یہ ہے بڑا منحوس جانور۔ یہ جس دن مرا تھا اس کے دوسرے ہی دن کپتان پولیس نے اپنا تبادلہ کرا لیا تھا۔ یہ ٹرافی تو اگلے ایس۔ پی نے بنوائی تھی۔''

اچانک نانا نے نیلی قمیص والے کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ذرا کھڑکی گھیر کے بیٹھو جی۔ پانی مجھے بھگوئے دے رہا ہے۔''

اُسے نانا کی اس بات نے دکھ دیا۔

اچانک پوری گاڑی کی بجلی چلی گئی اور گھُپ اندھیرا چھا گیا۔

اس نے سہم کر نانا کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

مسافروں نے ریل کی بدانتظامیوں پر گفتگو کرنا شروع کر دی۔

نانا نے کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا۔ گارڈ چھتری لگائے گزر رہا تھا۔

''کیا ہوا گارڈ صاحب۔ اندھیرا کیوں ہو گیا؟'' نانا نے زور سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بیٹھے رہو۔ ڈائنا ما کا تار نکل گیا ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

ڈبّے میں بالکل تاریکی تھی۔ بڑی مشکل سے ایک دوسرے کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ تاریکی کے ساتھ خاموشی بھی کہیں سے دَر آئی تھی۔ سکوت اور اندھیرا۔ اسی لیے باہر کا منظر کچھ روشن اور با آواز ہو گیا تھا۔ باہر بارش کا زور ٹوٹ رہا تھا لیکن ہوا تیز ہو گئی تھی۔

نیلی قمیص والے نے کھڑکی آدھی کھول لی تھی۔ اب بوچھار نہیں آ رہی تھی۔

باہر کوئی بھاگتا ہوا آیا اور نیلی قمیص والے کا بازو پکڑ کر بولا۔

''دروازہ کھول دو بھیا۔ اسٹیشن سے بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ گاڑی چھوٹ گئی تھی، بڑی مشکل سے مِل پائی ہے۔''

اُس نے نانا کا ہاتھ پکڑے پکڑے مونچھوں والے کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی سیٹ پر خود کو محفوظ اور مطمئن محسوس کئے اونگھ رہا تھا۔

اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا ڈبّے پر سے ہوتا ہوا چاردیواری میں بنے مکان کے برآمدے کی طرف گیا اور خاموش تاریک رات میں ایک ہولناک آواز اُبھری، وہ تھرتھرا گیا۔

نانا نے لپٹاتے ہوئے سرگوشیوں میں کہا۔

''دیکھو لکڑبگھا ایسے ہنستا ہے۔ اس طرح روتا ہے۔''

اُس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔

لکڑبگھا منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ہوائیں چل رہی تھیں اور وہ ہنس رہا تھا، اور رو رہا تھا۔ برآمدے کی روشنی میں اس کے جبڑے صاف نظر آ رہے تھے جن میں نوکیلے دانت چمک رہے تھے۔ اسے اپنے اندر سنسنی سے دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

اسکارف والی بھی اپنی ماں سے چمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ کھچا کھچ بھرے ڈبّے میں سب خاموش تھے۔

باہر کھڑے آدمی نے نیلی قمیص والے کا شانہ زور زور سے ہلایا۔

''بھائی صاحب میری مدد کرو۔ میرے بھائی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔ ابھی ابھی خبر ملی ہے۔ اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اسپتال میں دم توڑ رہا ہے۔''

نیلی قمیص والے نے اپنے تھیلے کو مضبوطی سے سنبھالا۔ کھڑکی کا شیشہ گرایا اور اونگھنے لگا۔

اسکارف والی زور سے چلّائی:

''امّی - امّی دیکھو۔ لکڑ بگھا اب نہ ہنس رہا ہے نہ رو رہا ہے۔ ہوا کے زور سے وہ تنکا گر گیا۔ لکڑ بگھا چُپ ہو گیا امّی۔''

جو اتنی دیر سے سب کچھ سُن رہا تھا، سب کچھ دیکھ رہا تھا اُس نے اپنے نانا کی کمر مضبوطی سے پکڑ کر نیلی قمیص والے کی آنکھوں میں دیکھا۔ نیلی قمیص والے کی آنکھیں اُس کی آنکھوں سے چار ہوئیں اور ڈبّے کے نیم تاریک سناٹے میں اس نے بہت واضح محسوس کیا کہ نیلی قمیص والے کی آنکھیں پہلے سے چھوٹی ہو گئی ہیں اور جبڑے آپس میں بھنچ گئے ہیں۔

☆☆☆

بگولے

— شموئل احمد

قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی لتیکا رانی اپنے برہنہ جسم کو مختلف زاویوں سے گھور رہی تھی، اس کے ہونٹوں پر ایک مطمئن سی فاتحانہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں پراسرار سی چمک۔ ایک ایسی چمک جو شکاری کی آنکھوں میں اس وقت آتی ہے جب وہ اپنا جال اچھی طرح بچھا چکا ہوتا ہے اور ہونٹوں پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ لیے ایک گوشے میں بیٹھا شکار کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ لتیکا رانی نے بھی اپنے جال بچھائے تھے اور فتح کا یقین کامل اس کی آنکھوں میں چمک، اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ بن کر رینگ رہا تھا۔ یوں تو لتیکا رانی نے شکار کئی کئے تھے اور کلب میں بڑی شکاری مشہور تھی۔ لیکن یہ شکار اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تھا اور وہ اپنی اس کامیابی پر پھولے نہ سمائی تھی۔ اس نے مس چودھری کی طرح کبھی پیسے کے لیے شکار نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس پیسے کی کمی بھی نہ تھی۔ شہر میں کپڑے کی تین تین ملیں تھیں اور اس کے علاوہ بنک بیلنس بھی کافی تھا۔ وہ محض جنسی آسودگی کے لیے لوگوں سے رسم وراہ بڑھاتی تھی۔ مس چودھری سے تو اس کو شدید نفرت تھی کیونکہ مس چودھری نے ہمیشہ پیسوں پر جان دی تھی اور جاہل اور بھدّے قسم کے لکھ پتیوں کے ساتھ گھومتی تھی جن کے پیلے پیلے بدنما دانتوں سے تو ایسی بُو آتی تھی کہ لتیکا رانی کو ان سے باتیں کرتے ہوئے ناک پر رومال رکھ لینا پڑتا تھا۔ لتیکا رانی کو اس بات کا فخر تھا کہ اس نے کبھی ایسے ویسوں کو لفٹ نہیں دی۔ پچھلی بار اس کے ساتھ ایک ماہر نفسیات کو دیکھا گیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ پھر جلد ہی ان لوگوں سے اکتا جاتی تھی۔

لتیکا رانی کا مردوں کے متعلق وہی خیال تھا جو بعض مردوں کا عورتوں کے متعلق ہوتا ہے۔ یعنی وہ مردوں کو بستر کی چادر سے زیادہ نہیں سمجھتی تھی کہ جب میلی ہو جائے تو بدل دو اور اس لیے کوئی چادر اس کے پاس ایک ہفتے سے زیادہ نہیں ٹک پائی۔ اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ہمیشہ جوان اور تنومند ملازم رکھتی ہے اور آئے دن انہیں بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ بات سچ

تھی۔ آج کل اس کے پاس ایک نوجوان دیہاتی ملازم آکر رہا تھا جو وقت بے وقت اس کو بڑا سہارا دیتا تھا۔ خصوصاً اس دن تو وہ اس کے بڑا کام آیا تھا جب وہ نوجوان انجینئر اس کے ساتھ بڑی رُکھائی سے پیش آیا تھا اور اس کی پیش کش کو ٹھکرا کر مسز درگا داس کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا۔ اس دن لتیکا رانی نے حد سے زیادہ پی تھی اور کوئی آدھی رات کو کلب سے واپس لوٹی تھی۔ کلب سے آکر سیدھی ملازم کے کوارٹر میں گھس گئی تھی اور اس دیہاتی ملازم کو اس نے صبح تک ایک دم نچوڑ کے رکھ دیا تھا لیکن پھر بھی جیسے اس کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ اس انجینئر کو کھونے کا درد اور بڑھ گیا تھا۔ مسز درگا داس کے لیے لتیکا رانی کا دل نفرت سے بھر گیا تھا کیونکہ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا۔ مسز درگا داس اس سے زیادہ تجربہ کار منجھی ہوئی شکاری تھی اور اس نے اس کے کئی شکار باتوں ہی باتوں میں اُڑا لیے تھے۔ اس سے بدلہ لینے کے منصوبے وہ رات دن بناتی رہتی اور اس دن جب مسٹر کھنہ کے یہاں وہ پکنک کا پروگرام بنانے گئی تو اس نو عمر لڑکے کو دیکھ کر اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہے۔ وہ صوفے پر بیٹھا ''لائف'' کی ورق گردانی میں مصروف تھا۔

''مسٹر کھنہ ہیں — ؟'' لتیکا رانی نے اس کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''جی ......! وہ — تو پونا گئے ہوئے ہیں۔'' اس نے چونک کر لتیکا رانی کی طرف دیکھا اور بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکائیں۔ لتیکا رانی کو اس کا اس طرح پلکیں جھپکانا کچھ اتنا اچھا لگا کہ وہ بے اختیار اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آپ کو تو یہاں پہلی بار دیکھا ہے......''

''جی ہاں...... ملازمت کے سلسلے میں آیا تھا۔''

''اوہ تو آپ مالتی کے بھائی ہیں۔'' لتیکا رانی نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

جواب میں اس کی نظریں جھک گئیں اور چہرے پر ندامت کی لکیریں سی اُبھر آئیں۔

''مالتی تو مسٹر کھنہ کے ساتھ گئی ہوگی۔''

''جی ہاں — '' اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

لتیکا رانی اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھیں خاصی بڑی بڑی اور پُرکشش تھیں اور کچھ کہتے ہوئے وہ کئی بار پلکیں جھپکاتا اور بہت سادہ معصوم نظر آتا۔ مسیں کچھ کچھ بھیگ چلی تھیں اور ہونٹ بہت پتلے اور باریک تھے۔ چہرے کے سانولے پن نے اس کو اور

زیادہ پُرکشش بنادیا تھا۔لتیکا رانی کا یکا یک جی چاہا کہ وہ اس کے ہونٹوں کو چھو کر دیکھے کتنے نرم و نازک ہیں، لمحہ بھر کے لیے اس کو اپنی اس عجیب سی خواہش پر حیرت ہوئی اور وہ مسکراتی ہوئی اس کے تھوڑا قریب سرک آئی۔ لڑکے نے کچھ چور نظروں سے لتیکا کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی 'لائف' کے ورق اُلٹانے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ آئی تھیں اور چہرہ کسی حد تک سرخ ہو گیا تھا۔لتیکا اس کی اس پریشانی پر مسکرا اُٹھی۔ وہ اس کے اور قریب سرک آئی۔ اس کی گھبراہٹ سے وہ اب لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ لتیکا کی بھی نگاہیں ''لائف'' کے الٹتے ہوئے صفحوں پر مرکوز تھیں۔ ایک جگہ نیم عریاں تصویر آئی اور لڑکے نے فوراً وہ ورق اُلٹ ڈالا لیکن دوسری طرف بوسے کا منظر تھا۔ اس نے کچھ گھبرا کر لتیکا کی طرف دیکھا اور ''لائف'' بند کر کے تپائی پر رکھ دیا۔

''آپ کچھ پریشان ہیں؟'' لتیکا نے شرارت بھری مسکراہٹ سے پوچھا۔

''جی ......! نہیں تو......'' اس کے لہجے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ وہ گھبراہٹ میں اپنی انگلیاں چٹخا رہا تھا۔

''آپ کی انگلیاں تو بڑی آرٹسٹک ہیں......'' یکا یک وہ اس کی پتلی پتلی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی۔

''لیکن مجھ میں تو کوئی بھی آرٹ نہیں......'' اس دفعہ وہ مسکرایا اور لتیکا رانی کچھ جھینپ گئی۔

''آپ کو پامسٹری پر یقین ہے؟'' اس نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

''تھوڑا بہت......''

''پھر لائیے آپ کا ہاتھ دیکھوں......'' اور لتیکا اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگی۔

اس کی ہتھیلی پسینے سے ایک دم گیلی تھی۔ لتیکا کی ہتھیلی اور انگلیاں بھی پسینے سے بھیگ گئیں اور اس کو عجیب سی لذت کا احساس ہوا۔لتیکا کے جی میں آیا وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے گالوں سے خوب رگڑے اور اس کی ہتھیلی کا سارا پسینہ اپنے چہرے پر مل لے۔ اس پسینے کو وہ سونگھے اور اس کا ذائقہ اپنی زبان پر محسوس کرے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی ہتھیلی کو دباتے ہوئے اس نے کہا۔

''آپ کا ہاتھ تو بڑا نرم ہے۔ایسا ہاتھ تو بڑے آدمیوں کا ہوتا ہے۔''

''لیکن میں تو بڑا معمولی آدمی ہوں۔''

''آپ بہت جلد مالدار ہوجائیں گے۔ یہ لکیر بتاتی ہے۔''

''لیکن بھلا میں کیسے مالدار ہوسکتا ہوں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''ہوسکتے ہیں۔'' یکا یک لتیکا رانی کا لہجہ بدل گیا اور لڑکے نے اس طرح چونک کر اس کو دیکھا جیسے وہ پاگل ہوگئی ہو۔

''میرے یہاں آیئے تو اطمینان سے باتیں ہوں گی۔'' لتیکا رانی بڑی ادا سے مسکرائی اور وہ محوِ حیرت اس کو تکنے لگا۔

''آئیں گے نہ......؟''

''جی......کوشش کروں گا۔''

''کوشش نہیں۔ ضرور آیئے۔ یہ رہا میرا پتہ۔'' لتیکا رانی اس کو اپنا ملاقاتی کارڈ دیتے ہوئے بولی اور اس کو حیرت زدہ چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر یکا یک وہ مڑی اور قریب آکر بولی۔

''چلیئے......کہیں گھومتے ہیں۔''

''جی......مجھے......مجھے ایک ضروری کام ہے۔'' اس کی آواز کچھ پھنسی پھنسی تھی۔

''آپ اتنے نروس کیوں ہیں؟'' لتیکا نے بڑے پیار سے پوچھا۔ اس کے جی میں آیا کہ اس کو پچکارے اور پیار کرے۔ لتیکا کو وہ ایسا ننھا سا خوف زدہ پرندہ معلوم ہورہا تھا جو اپنے گھونسلے سے نکل کر کھلے میدان میں آگیا ہو اور جنگلی درندوں کے درمیان گھر گیا ہو۔

''آنے کی کوشش کروں گا۔''

لتیکا رانی مسکرائی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ کار میں بیٹھ کر اس نے ایک دفعہ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ گیٹ کے پاس کھڑا پلکیں جھپکا رہا تھا۔ لتیکا کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو قریب بلایا۔ جب وہ تھوڑا جھجکتے ہوئے قریب آیا تو بولی: ''آج شام سات بجے انتظار کروں گی۔''

اور پھر مسکراتے ہوئے اس نے اس پر ایک آخری نظر ڈالی اور موٹر اسٹارٹ کردی۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھی غسل خانے میں گھس گئی اور اپنے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے عریاں جسم کو غور سے دیکھا اور شاور کھول کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ پشت پر پڑتی

ہوئی پانی کی ٹھنڈی پھواریں اسے عجیب لذت سے ہمکنار کر رہی تھیں۔ وہ بیسیوں دفعہ اس طرح نہائی تھی لیکن ایسا عجیب سا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد تولیے سے جسم خشک کرتی ہوئی وہ باہر نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے تولیہ پلنگ پر پھینک دیا اور قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر برہنہ جسم کو ہر زاویہ سے دیکھنے لگی۔

وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا۔ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگ رہی تھی اور آنکھوں میں پراسرار خواہش کے جگنو چمک رہے تھے۔

میز کی دراز سے اس نے سگریٹ نکالا اور ایک کرسی کھینچ کر آئینے کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔ اپنے آپ کو وہ سولہ سترہ سالہ لڑکی محسوس کرنے کرنے لگی تھی۔ اپنا عکس اس کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ آنکھ، ناک، ہونٹ، پیشانی سبھی نئے اور اجنبی سے لگ رہے تھے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کو بہت بُرے لگے۔ سنگار میز پر رکھی ہوئی کریم کی شیشی اٹھا کر بہت سا کریم آنکھوں کے نیچے ملنے لگی۔ پھر اس نے چہرے پر پاوڈر لگایا اور سگریٹ کے کش لیتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا تو صرف پانچ بجے تھے۔ اس کے آنے میں کوئی دو گھنٹے باقی تھے۔ یہ دو گھنٹے اس کو پہاڑ سے لگے، اور اگر وہ نہیں آیا تو...... اس خیال کے آتے ہی جیسے اس کے دل نے کہا۔ وہ اس کو ہر قیمت پر حاصل کرلے گی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا لے گی۔ وہ اس کے ساتھ موٹروں میں گھومے گا۔ کلب، سنیما گھروں، ہوٹلوں اور دعوتوں میں وہ اس کے ساتھ ساتھ ہوگا۔ اُف! کتنا معصوم ہے وہ...... بالکل بچوں کی طرح باتیں کرتا ہے اور شرماتا تو ایک دم لڑکیوں کی طرح ہے۔ لتیکا رانی کو یاد آ گیا کہ 'لائف' کی ورق گردانی کے وقت جو ایک نیم عریاں تصویر آ گئی تھی تو کس طرح اس کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا تھا۔ لتیکا رانی مسکرا اُٹھی۔ وہ آئے گا تو کیسا شرمایا شرمایا سا رہے گا۔ وہ اس کے ایک دم قریب بیٹھے گا اور اس کو ایک ٹک گھورتی رہے گی۔ وہ اس کو گھورتا دیکھ کر تھوڑا گھبرائے گا اور اس سے ہٹ کر بیٹھنے کی کوشش کرے گا۔ پھر وہ لکیریں دیکھنے کے بہانے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لے گی۔ اس کی انگلیاں کیسی نرم و سبک سی ہیں۔ جب وہ گھبراہٹ میں اپنی انگلیاں چٹخاتا ہے تو کیسا پیارا سا لگتا ہے۔ باتوں ہی باتوں میں وہ اس کے ہاتھوں کو اپنے گالوں سے مَس کر دے گی۔ اس کی ہتھیلی کا سارا پسینہ اس کے گالوں میں لگ جائے گا اور اس کے گال چپچپے ہو جائیں گے، تب اس کو کیسا ٹھنڈا ٹھنڈا لگے

گا۔ اور وہ تو ایک دم نروس ہو جائے گا۔ تب وہ اس کو چمکارے گی اور پیار سے کہے گی۔ ''اتنے نروس کیوں ہو؟ یہ تمہارا ہی گھر ہے۔'' اور پھر روشنی ...... مگر نہیں ...... اتنی جلدی نہیں۔ وہ ایک دم گھبرا جائے گا۔ پھر شاید کبھی نہ آئے۔ سولہ سترہ سال کا تو ہے ہی۔ ایک دم نادان اور معصوم۔ لتیکا نے سگریٹ کا آخری کش لیتے ہوئے سوچا۔ اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اس نے بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھا۔ چھ بجنے میں کوئی دس منٹ باقی تھے اور اس کو اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔ آخر یہ کون سی تک تھی کہ اس نے سات بجے کا وقت دیا تھا۔ خواہ مخواہ ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا ہے۔ اپنی بے چینی پر وہ یکا یک مسکرا اٹھی اور ایک مخموری سی انگڑائی لیتی ہوئی پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ تکیے کو سینے پر رکھ کر اس نے زور سے دبایا اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ سارے بدن میں اس کو جیسے دھیمی دھیمی سی آنچ لگنے لگی تھی۔ اتنی جلدی وہ یہ سب کچھ نہیں کرے گی۔ اس نے سوچا...... وہ بالکل نا تجربہ کار اور نادان ہے۔ اس کا جسم بند کلی کی طرح پاک اور بے داغ ہے۔ محبت کا تو وہ ابھی مطلب بھی نہیں سمجھتا۔ وہ اس کو محبت کرنا سکھائے گی۔ ایک نادان لڑکے سے مرد بنائے گی بھر پور مرد! اور لتیکا کو اپنے آپ پر بڑا فخر محسوس ہونے لگا۔ یہ سوچ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی کہ وہ پہلی عورت ہے جو اس کو محبت سے روشناس کرائے گی۔

اُس نے الماری سے بیئر کی بوتل نکالی اور ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ لیکن اس کی بے چینی اور بڑھ گئی۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ایک بار پھر غسل خانے گھُس جائے اور پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی دھار میں اپنے جلتے ہوئے جسم کو دونوں ہاتھوں سے زور زور سے ملے لیکن یکا یک کال بل بج اُٹھی۔ اس نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا تو سات بج چکے تھے۔ اپنے عریاں جسم پر اس نے سلیپنگ گاؤن ڈالا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دروازہ پر پریشان اور گھبرایا سا کھڑا تھا۔

''اوہ! گاڈ...... کم اِن ینگ بوائے!'' لتیکا رانی نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔

لتیکا کو وہ ایسا سہا ہوا معصوم سا بچہ نظر آ رہا تھا جس کو یکا یک بھوت کہہ کر ڈرا دیا گیا ہو۔

وہ جیسے ہی اندر آیا لتیکا رانی نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا اور مسکراتی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کی مسکراہٹ میں یقین کا رنگ مستحکم ہو کر فتح اور غرور کی چمک میں تبدیل ہو گیا تھا۔

''بیٹھو کھڑے کیوں ہو......؟''لتیکا رانی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
وہ فرماں بردار بچے کی طرح کرسی پر بیٹھ گیا۔لتیکا رانی کرسی کو یک ٹک گھورنے لگی۔ وہ کرسی کے ہتھے پر انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔
''کیا سوچ رہے ہو......؟''
''جی......؟''
''کیا سوچ رہے ہو......؟''
''کچھ نہیں......''
''کچھ تو ضرور سوچ رہے ہو؟''لتیکا رانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ چپ رہا۔
''لاؤ تمہارا ہاتھ دیکھوں!'' وہ زیادہ صبر نہ کرسکی۔
اس نے چپ چاپ اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔
''اِدھر آجاؤ پلنگ پر۔اچھی طرح دیکھ سکوں گی۔''
لمحہ بھر اُس نے توقف کیا اور پھر کرسی سے اُٹھ کر اس کے قریب ہی پلنگ پر بیٹھ گیا۔وہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد لتیکا نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب سرک رہا ہے۔لتیکا نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔اس کا بایاں ہاتھ لتیکا رانی کی کمر کے گرد بڑھ رہا تھا اور پھر لتیکا نے اپنی کمر پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔اس کو لڑکے کی اس بیباکی پر سخت حیرت ہوئی۔ وہ اس سے تھوڑا ہٹ کر بیٹھ گئی جیسے اتنی جلدی اس کا بے تکلف ہوجانا اس کو پسند نہ آیا ہو۔لتیکا نے محسوس کیا کہ وہ پھر اس کے قریب سرک رہا ہے۔ایک دفعہ لتیکا کو پھر اپنی کمر پر اس کی انگلیوں کا دباؤ محسوس ہوا۔
''یہ لکیر کیا بتاتی ہے؟''یکا یک لڑکے نے جھک کر ایک لکیر کی طرف اشارہ کیا اور اس طرح جھکنے میں اس کا چہرہ لتیکا کے چہرے کے قریب ہوگیا، یہاں تک کہ اس کے رخساروں کو لڑکے کی گرم گرم سانسیں چھونے لگیں اور لتیکا کو ایسا لگا جیسے وہ جان بوجھ کر اس کے اتنے قریب جھک گیا ہے۔ جیسے وہ اس کو چومنا چاہتا ہو۔لتیکا رانی کھڑی ہوگئی اور کچھ ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیوں اب لتیکا کو اس کے چہرے پر پہلے جیسی معصومیت اور سادہ پن نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اس کو اور لوگوں کی طرح ایسا ویسا لگ رہا تھا۔

''بیٹھئے نہ...... آپ اتنی نروس کیوں ہیں؟'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نروس۔ بھلا میں کیوں نروس ہونے لگی؟'' لتیکا رانی نے بڑے طیش میں کہا اور اس کو ایسا لگا جیسے یہ وہ نہیں ہے جو وہ اب تک سمجھ رہی تھی بلکہ یہ تو انتہائی فحش اور گندا انسان ہے۔ یہ کوئی سولہ سترہ سالہ معصوم نادان لڑکا نہیں ہے بلکہ ایک خطرناک مرد ہے۔ بھرپور مرد۔ اس کا جسم کسی بند کلی کی طرح پاک اور بے داغ نہیں ہے بلکہ گندگی میں پلا ہوا کوئی زہریلا کانٹا ہے جو اس کے سارے وجود کو لہولہان کردے گا۔

اور دوسرے لمحے جیسے لتیکا رانی کا سارا وجود لہولہان ہوگیا۔ پل بھر کے لیے اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ لتیکا کو محسوس ہوا جیسے وہ اس کو ایک دم فاحشہ اور بازاری عورت سمجھتا ہے۔ جیسے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ جو جب چاہے جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اور لتیکا کا دل اس کے لیے نفرت سے بھر گیا۔ وہ تڑپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گئی اور اپنے ہونٹوں کو انگلیوں سے پونچھتے ہوئے اس نے چیخ کر کہا۔

''یو باسٹرڈ...... وہاٹ فور یو ہیو کم ہیر؟''

اس نے حیرت سے لتیکا کی طرف دیکھا۔

''گٹ آؤٹ یو سوائن......'' وہ چیخی۔

دروازے کے قریب پہنچ کر لڑکے نے ایک بار مڑ کر لتیکا کی طرف دیکھا اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

لتیکا پلنگ پر گر کر ہانپنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ یکا یک اٹھی، سلیپنگ گاؤن اتار پھینکا اور غسل خانے میں گھس گئی۔ شاور کھول کر وہ اکڑوں بیٹھ گئی۔ ٹھنڈے پانی کی دھار اس کی ریڑھ کی ہڈیوں میں گدگدی سی پیدا کرنے لگی اور وہ زور زور سے اپنا سارا بدن ہاتھوں سے ملنے لگی۔

گرتے ہوئے پانی کے مدھم شور میں لتیکا رانی کی گھٹی گھٹی سی چیخیں بھی شامل ہوگئی تھیں۔

☆☆☆

فرار

— عبدالصمد

وہ کوئی عجوبہ روزگار نہیں تھا۔

ایک بالکل عام سا آدمی ...... جب کسی آدمی کی تعریف کی جاتی ہے تو اسے طرح طرح کے کپڑے پہنا دیے جاتے ہیں اور قسم قسم کے میک اپ سے اس کا حلیہ یوں بگاڑ دیا جاتا ہے کہ وہ پہچان میں نہیں آتا۔ زور تقریر اور زور قلم سے ایسا کر کے خوش ہونے والی کوئی بات نہیں، کیوں کہ اصل آدمی تو کہیں چھپ جاتا ہے۔

جس آدمی کے بارے میں بات ہو رہی ہے وہ لباس کی خوش رنگیوں اور میک اپ کے حشر سامانیوں میں ہرگز گم نہیں ہوا۔ وہ جیسا بھی ہے، ہمارے آپ کے سامنے ہے، تھوڑی سی کوشش کی جائے تو اسے کہیں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی بھی محلے کے ایک بیحد معمولی اور خستہ حال مکان میں، کسی بھی سرکاری، غیر سرکاری دفتر کے کونے میں اپنی فائل پر سر جھکائے ہوئے، کسی بھی سڑک یا گلی میں سب کے ساتھ چلتے ہوئے، پھر بھی سب سے الگ تھلگ، زمانے کی تیز رفتاری میں سب سے پچھلی صف میں دوڑنے کی کوشش میں مصروف ...... کسی بھی تیز و طرار اور دبنگ آدمی سے دبتا ہوا، کہیں بھی آگے بڑھ کر بینا اٹھانے کی کوششوں میں ناکام، کسی بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز، کسی بھی عبادت گاہ میں صف کی آخری جگہ ملنے پر مطمئن ...... یوں مثالیں تو بہت ہیں، لیکن جب آپ دو چار مثالوں میں اسے نہیں پہچان سکے تو اتنی ساری تقریروں اور تحریروں کے بعد بھی اسے نہیں پہچان سکیں گے، ویسے وہ ہمیشہ آپ کے سامنے ہی رہتا ہے بس سامنے کے دو چار آدمیوں کو ہٹا دیجئے وہ نظر آجائے گا، کسی بھی محفل میں، کسی بھی نکڑ پر......

تو یوں ہوا کہ میری نظروں کے سامنے ایسا ہی ایک آدمی غیر معمولی تیزی کے ساتھ نکلا اور بھیڑ میں گم ہو گیا، ایک ہی پل میں مجھے ایسا لگا کہ وہ ہماری آپ کی طرح ایک عام آدمی ...... لیکن وہ سب کی نظروں سے بچنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے......؟

کوئی خاص بات ہے کیا......؟

تجسّس نے مجھے آ گھیرا اور میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر بھیڑ میں گھس گیا اور اس کا پیچھا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھیڑ میں چلنا کتنا مشکل ہے اور دوڑنا تو بالکل ناممکن۔ اصل میں بھیڑ میں کوئی چھوٹا بڑا تو ہوتا نہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایسے میں کسی ایک کا بازی مار لے جانا ممکن نہیں۔ میں نے کوشش تو بہت کی کہ کسی طرح اس کے قریب پہنچ جاؤں لیکن ناکام رہا، البتہ اس پر نظر رکھنے کا پورا جتن کیا، وہ بس دو چار دس آدمیوں کے آگے چلا جا رہا تھا اور اس کے جسم کا کوئی نہ کوئی حصہ ہر وقت میری نگاہوں کی گرفت میں تھا۔ جیسے ہی بھیڑ ختم ہوئی، وہ ایک شاپنگ کمپلکس میں گھس گیا۔

''یہ پھٹیچر وہاں کیا کرنے گیا ہے......؟''

میں بدبدایا، لیکن پیچھا تو کرنا ہی تھا۔

وہ شاپنگ کمپلکس ایک بھول بھلیاں قسم کی چیز تھی، درجنوں پیچ دار سیڑھیاں، بے شمار دالان اور منزلیں اور سیکڑوں قد آدم مجسمے۔

سیڑھیاں چڑھتے اترتے، منزلوں اور دالانوں کو پھلانگتے اور مجسموں کو تاکتے تاکتے ہی بے حال ہو گیا۔ اس پر کہیں نگاہیں تو نہیں پڑیں، بس اس کا ایک سایہ سا لہراتا ہوا مجھے اپنے آس پاس محسوس ہوتا رہا جس نے سب سے بے خبر مجھے اپنی دھن میں مشغول رکھا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی کہ کاؤنٹر کے اس پار یا اس پار کھڑے لوگ مجھے کن نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسے بھی دیکھ رہے ہوں گے لیکن وہ تو سب کی پروا کئے بغیر آخر بھاگ ہی رہا ہے۔ معاً ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے مجھ پر شک ہو گیا ہو اور وہ مجھ سے بھاگ رہا ہو......

لیکن......اسے کس طرح خبر ہو سکتی ہے بھلا......؟

اس کا میرا کبھی آمنا سامنا تو ہوا نہیں، وہ مجھے پہچانتا نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ قائم ہوا تھا، وہ ابھی تک برقرار ہے تو پھر......؟

یوں تو نہیں کہ وہ کسی اور سے بھاگ رہا ہو اور میں انجانے میں ایک درمیانی آدمی کے طور پر پھنس گیا ہوں......

یعنی میں بھی کسی کی نظروں میں ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی پیچھا ہو رہا ہے...... اس احساس نے میرے اندر کچھ عجیب کیفیتیں پیدا کر دیں۔

میں بیحد چوکنا ہو گیا، سر سے پیر تک خوف کی ایک تیز لہر میرے اندر دوڑ گئی، کسی نے اگر اس کو اپنا نشانہ بنایا تو میں اس کی زد میں نہ آجاؤں......؟ یہ اچھا ہی تھا کہ اب تک اس سے میرا ایک باوقار فاصلہ بنا ہوا تھا۔ شعوری طور پر میں نے اس سے دور رہنے کی کوشش کی تھی لیکن لاشعوری طور پر میں خود اس سے دور رہ گیا تھا اور اب یہی چیز اس وقت میری تشفی کا باعث تھی۔

شاپنگ کمپلکس کا چکر لگاتے لگاتے میں ہانپنے لگا۔ عجیب آدمی ہے، پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا۔

باہر آ کر میں رومال سے اپنا پسینہ پونچھنے لگا اور شاید میں اس فضول کام سے باز ہی آجاتا کہ اچانک وہ مجھے نظر آ گیا۔

سب کی نظروں سے بچتا بچاتا محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے چوکنے قدم رکھتا ہوا وہ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں پوٹلی جیسی کوئی چیز چھپا رکھی تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ اس چیز کی حفاظت میں اس نے اپنے سارے جسم کو مامور کر رکھا ہے۔

اوہ...... اس کا مطلب ہے...... اس کے پاس ضرور کوئی قیمتی...... بہت قیمتی چیز ہے۔

تب تو اس کا پیچھا کرنا اور بھی ضروری ہے۔ پتہ نہیں اس کے پاس کون سی ایسی چیز ہے جسے وہ دنیا کی نظروں سے چھپانا چاہتا ہے۔

میں اپنی تھکاوٹ اور پریشانی کو یکسر بھلا کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ اس دفعہ وہ صاف میری نظروں کے سامنے تھا، بھیڑ اور بازار اب درمیانی رکاوٹ نہیں رہے تھے، یعنی میں نے جب اتنی محنت کی تھی تو اس کا کچھ سیر حاصل نتیجہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن وہ بھی ایک چھلاوہ ہی تھا یا شاید اسے میرے مصمم ارادے کا علم ہو گیا تھا۔ اس نے کوشش بہت کی کہ پھر کسی چیز کا سہارا لے کر میری نظروں سے چھپ جائے، پر اس دفعہ میں نے بھی کچھ زیادہ ہی ہوشیاری برتی اور راہ چلتے مسافروں کے بے شمار سروں، کاندھوں، مونڈھوں اور ان کے وجود کے سارے اعضا کو کمال ہوشیاری سے ہٹاتے ہوئے اپنے مقصد پر گامزن رہا، وہ مجھے دیر تک ٹیڑھے میڑھے راستوں پر خوب جھکائیاں دیتا رہا اور آخر کار وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔

وہ ایک بہت بڑی عمارت میں گھس گیا۔

اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اچانک جو میری نگاہیں عمارت پر پڑیں تو پتہ چلا کہ وہ ایک عبادت گاہ ہے۔

''اچھا تو اب مذہب......''

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں بھی عبادت گاہ میں داخل ہو گیا۔ شکل وصورت، چال ڈھال اور لباس وغیرہ سے میں ایسا نہیں تھا کہ مجھے وہاں داخل نہ ہونے دیا جائے، کم سے کم اس سے تو یقینی بہتر...... وہ تو چال ڈھال سے ہی عجیب لگتا تھا۔ اگر چہ واضح طور پر میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن دور سے دیکھنے پر اس کے بارے میں، میں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ بہت خوش گوار نہیں تھا، پھر وہ کچھ چھپائے ہوئے بھی تھا، ایسی صورت میں اگر خدا نے مجھے اپنا دربان مقرر کر رکھا ہوتا تو میں ہرگز اسے خدا کے حضور میں جانے نہیں دیتا۔

اندر جا کر پتہ نہیں وہ کون سی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ میرے لیے ایک مشکل یہ آپڑی کہ وہ جس عقیدے کے مطابق عبادت کر رہا تھا، میں اس کا پیروکار نہیں تھا۔ وہ جس طریقے سے اپنے خدا کے حضور میں موجود تھا، وہ طریقہ میرے لیے جائز نہیں تھا۔ اگر میں اس کی نقل کرنے بیٹھ جاؤں تو پتہ نہیں کب اس کی عبادت ختم ہو اور کب وہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ اس عبادت کا خاتمہ کیسے ہوگا...... میں تو صرف نقل ہی کر رہا ہوتا نا...... میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں چپ چاپ باہر نکل کر اس کا انتظار کروں، عبادت گاہ میں لوگوں نے ابھی تک مجھے بغور نہیں دیکھا تھا اور قرینہ اغلب تھا کہ اگر کسی کی نگاہیں مجھ پر کچھ دیر تک ٹھہر گئیں تو شاید میں مشکوک قرار دیا جاؤں......

......اسی کی طرح......

میں خاموشی سے باہر آ کر کیاریوں میں لگے خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں بعض ایسے تھے کہ میری نگاہیں بھی اس سے پہلے ان پر نہیں پڑی تھیں، یقینی طور پر انہیں بہت جتن سے حاصل کیا گیا ہوگا۔ ایسے نایاب اور نادر نمونے عام طور پر دیکھنے کو نہیں ملتے۔ میں شاید ان کے حسن اور خوشبو میں کھو ہی جاتا کہ باہر جاتے ہوئے اسے دیکھ کر جیسے میں

خواب سے بیدار ہو گیا، اس دفعہ تو اس کا چہرہ بھی دیکھ لیا...... کوئی خاص بات نہیں، شاید سو میں چالیس چہرے ایسے ہی ہوتے ہوں گے جن پر روز ہی ہماری نگاہیں پڑتی ہیں۔

وہ کسی چیز کو چھپانے کی صاف کوشش کر رہا تھا۔ مجھے تعجب بھی ہوا، وہ کہاں کہاں سے گزرا، اس مشکوک حالت میں اسے ہزاروں نے دیکھا ہوگا لیکن کسی نے بھی اسے نہیں ٹوکا......؟ ایک میں ہی بے وقوف رہ گیا جو اپنی ساری مصروفیات، سارا کام کاج، ساری دلچسپیاں چھوڑ کر اس کے پیچھے لگ گیا......؟ اس سے مجھے فائدہ کیا ہوگا......؟

میری رفتار دھیمی پڑ گئی......

اچانک مجھے خیال آیا کہ آخر میں کس پر بوکھلا رہا ہوں، مجھے اس کا پیچھا کرنے پر کسی نے مامور تو نہیں کیا، میری تو اس سلسلے میں کسی سے بات چیت بھی نہیں ہوئی۔ یہ تو میں خود ہوں جس نے مجھے ایسا کرنے پر اکسایا، یعنی یہ ایک خالص ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کا کوئی دخل نہیں...... اگر کسی کے کانوں میں میری حرکتوں کی اطلاع پہنچے تو پتہ نہیں میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے۔

اور پھر کیا پتہ کہ کتنے لوگوں کو میں نے اپنی طرح اس کا پیچھا کرنے کو اکسایا ہوگا، کتنے لوگ اس کے پیچھے لگے بھی ہوں گے، آخر میرے آس پاس یا اس کے آس پاس چلنے پھرنے والوں کی کمی تو ہے نہیں، میری طرح جو ہوگا، اس کا بھی یہ ذاتی معاملہ ہوگا، اب کوئی مجھ سے اپنے اندر کی بات تو کہے گا نہیں، میری طرح نہ جانے کتنے لوگ اس کا راز جاننے کو بے چین ہوں گے۔ وہ کوئی سنسان جنگل یا ویران پہاڑ سے تو گزر نہیں رہا، بھری پری بارونق دنیا اس نے چنی ہے اور اس طرح وہ سب کی نظروں سے چھپنے کی گویا کوشش کر رہا ہے۔

کتنا بے وقوف ہے وہ......

اس دفعہ اس نے سیدھی راہ نہیں چنی، یعنی سیدھی ناک پر نہیں چل کر ٹیڑھے میڑھے انداز میں چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ ٹریفک کے کسی ضابطے کی پروا کئے بغیر وہ کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں، اس سے مجھے خاصی تکلیف ہوئی لیکن پھر میں نے طے کیا کہ بھلے ہی وہ اپنے آپ جلیبی بناتا رہے، میں ہرگز اس کے نقش قدم پر نہیں چلوں گا۔ میں تو اس کا پیچھا کر رہا ہوں نا، اس طرح اپنے آپ کو تھکا کے وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور میں بڑے آرام سے سیدھا چل کر بھی

اس پر اچھی طرح نظر رکھ سکتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ اس کے ٹیڑھے اور میرے سیدھے چلنے کے باوجود اس کے اور میرے درمیان جو فاصلہ تھا، کم وبیش وہ برقرار رہا۔ میری خواہش بھی تھی کہ یہ فاصلہ برقرار رہے کیونکہ اسی طریقے سے میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کر سکتا تھا۔ آخر یوں سڑکوں اور بازاروں میں چلتے ہوئے تو میں اس کے راز کو پا نہیں سکتا، اس کے لیے ہم دونوں کو تنہائی کی ضرورت ہوگی جو کسی سنسان جگہ پر ہی نصیب ہو سکتی تھی—

اگر اس کے پاس کوئی خطرناک چیز ہوئی تو......؟

میرے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور میں نے اپنے پورے جسم میں ایک لہر سی محسوس کی۔ کہیں یہ خوف تو نہیں......؟

اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ہو سکتا ہے وہ کوئی غیر ملکی ایجنٹ ہو...... ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث کسی تنظیم کا کوئی فرد...... یا...... پھر......

کروڑوں کے اس دیش میں کون کس بھیس میں چھپا ہوا ہے کیا معلوم......؟ اگر میری سوچ صحیح راستے پر چل پڑی ہے تو وہ یقیناً کسی ایسی جگہ کی تلاش میں ہے جہاں وہ بہت آسانی کے ساتھ اپنے خطرناک ارادوں کو عملی جامہ پہنا سکے......

ہو سکتا ہے وہ کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ رہا ہو جہاں وہ اس چیز کو رکھ سکے جسے وہ چھپائے پھر رہا ہے...... خطرناک چیز کو......

اس کا مطلب ہے میں ایک بہت ہی خطرناک آدمی کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔

اس کا مطلب ہے، میں اپنی موت......

مشقت کی اس کیفیت میں بھی مجھے پسینہ آ گیا۔ فوری طور پر میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اپنے ارادے سے باز آ جاؤں یا...... اس سلسلے میں سوچنے یا غور کرنے کی فرصت کہاں، وہ تو مستقل بھاگا جا رہا تھا۔ اگر ایک آدھ منٹ کے لیے وہ رک جاتا تو شاید مجھے سوچ بچار کا کوئی موقع مل جاتا۔

لیکن اتنا قیمتی وقت جو میں نے ضائع کیا تھا، اسے کس کھاتے میں ڈالتا......؟

اتنے میں وہ شخص تیزی کے ساتھ ایک بہت بڑی عمارت میں گھس گیا۔ میرے قدم چلتے چلتے اچانک رک گئے...... عمارت پر میری نگاہ پڑ گئی تھی اور میں حیران رہ گیا تھا۔ اس شخص کی دلیری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

وہ عمارت ایوان قانون ساز تھی......!

اب تو جذبۂ وطنی کے تحت بھی میرا جانا ضروری ٹھہرا۔ ایوان قانون ساز کی حفاظت میری ایک اکیلی جان سے بہت بڑھ کرتھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کی اور اس پر کڑی نظریں رکھنے کو پوری طرح مستعد ہو گیا۔

میں پہلے کبھی ایوان قانون ساز میں داخل نہیں ہوا تھا۔ سن رکھا تھا کہ وہاں داخلے کے قانون سخت ہیں لیکن شاید اس کا اجلاس نہیں چل رہا تھا اس لیے سختی نہیں تھی۔ لیکن ایوان قانون ساز، ایوان قانون ساز ہوتا ہے اور یہ شخص پتہ نہیں کس ارادے سے وہاں گیا ہے......

وہ بھی ایک عجیب بارہ دری تھی، بے شمار گلیارے، لاتعداد کوریڈور، ان گنت دالان اور کمرے...... میں تو بالکل چکرا کر رہ گیا۔ چونکہ میں ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا اس لیے ایک طرح سے وہ شخص وہاں میری رہنمائی کر رہا تھا۔ میں ایک گلیارے سے نکلتا تو کسی دوسرے کوریڈرو میں جانکلتا، ایک دالان پھلانگتا تو اپنے آپ کو کسی دوسرے کمرے میں موجود پاتا۔ گویا میں آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اگر مقصد میرے سامنے نہ ہوتا تو شاید میں اپنے آپ کو ان بھول بھلیوں میں گم کر دیتا۔

کافی دیر تھکنے اور تھکانے کے بعد وہ وہاں سے بھی باہر نکل آیا اور پھر بھری پری سڑک تھی اور ہم...... عجیب آدمی ہے...... اس کا تو کوئی اور چھور سمجھ ہی میں نہیں آتا، کوئی مقصد، کوئی منزل بھی اس کی ہے یا نہیں...... آخر وہ کون سی ایسی چیز لے کر بھاگ رہا ہے کہ اسے دم مارنے کی بھی فرصت نہیں۔ ہوسکتا ہے اس کے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں ہو، ورنہ اب تک وہ اسے کہیں نہ کہیں ضرور پٹک دیتا۔ وہ تو ایسی جگہوں پر گھوم آیا کہ چاہتا تو دنیا کو تہ و بالا کرسکتا تھا پر اس نے نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے اس کے پاس کچھ بھی نہیں...... وہ ہم کو، آپ کو، اپنے آپ کو، دنیا بھر کو دھوکہ دے رہا ہے......

میری رفتار کچھ دھیمی ہوگئی......

وہ کسی کو کیوں دھوکہ دے گا، اس نے کسی سے یہ تو نہیں کہا کہ اس کے پاس کچھ ہے...... وہ تو صرف میں تھا کہ اپنے آپ کو اس کے پیچھے یوں تھکا دیا اور میں اس کے لیے کسی کو جواب دہ بھی نہیں ہوں......

رفتار دھیمی کرنے اور اتنا کچھ سوچنے سے بات تو کچھ بنی نہیں، ارادہ ملتوی کرنے کا مطلب صاف ہے کہ میں پھر صفر پر پہنچ جاؤں ...... پھر کس بات کا انتظار اور کہاں کا سفر اور کس سمت میں ......؟

نہیں ...... مجھے ہر حال میں اپنا حل چاہئے ...... خود اپنا ......

اب بھی کچھ بگڑا نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کچھ دور ضرور نکل گیا تھا، اس کے اور میرے درمیان دو چار آدمی بھی آ گئے تھے، پھر بھی وہ میری نگاہوں میں تھا۔ اگر میں مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنی چال کو ایک خاص رفتار پر نہیں ڈال دیتا تو اسے پکڑ بھی سکتا تھا لیکن نہیں ......

شاید بہتر یہی تھا کہ میں اس کے پیچھے وہاں تک جاؤں جہاں تک وہ جا سکتا ہے۔ کہیں نہ کہیں تو میری اس کی مڈبھیڑ ہوگی اور یقینی وہ جگہ اس بات کے لیے مناسب ترین ہوگی کہ میں

...... چلتے چلتے ......

چلتے چلتے ......

اس نے مجھے ان تمام جہانوں کی سیر کرادی جو آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل تھے، لیکن وہ جس جگہ بھی جاتا، بے نیل و مرام نکل آتا۔ جب اسے کچھ لینا دینا نہیں تھا تو پھر وہاں جاتا ہی کیوں تھا۔ وہ چاہتا تو ان جگہوں میں مجھ سے چھپ بھی سکتا تھا لیکن وہ مجھ سے بھاگ کہاں رہا تھا......؟

وہ تو مستقل میری آنکھوں کے سامنے دندناتا ہی پھر رہا تھا، اگر وہ واقعی مجھ سے چھپنے کی کوشش کرتا تو شاید مجھے خوشی ہی ہوتی یعنی یہ کہ اسے پیچھا کرنے کی خبر ہوگئی ہے تب ہی تو ...... دوسرے یہ کہ مجھے بھی اس تگ و دو سے باز آ جانے کا ایک بہانہ ہاتھ آ جاتا لیکن وہ تو جیسے مجھے بالکل نظر انداز ہی کر رہا تھا، اپنی دھن میں جیسے مگن تھا وہ...... دھن میں تو میں بھی مگن تھا اور یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اتنی محنت اور وقت کی بربادی کے بعد میں اپنا مقصد پورا کئے بغیر بھاگ جاؤں۔ اب تو جو ہو سو ہو، وہ جہاں جائے، پاتال میں بھی چلا جائے تو مجھے پیچھے نہیں ہٹنا......

عمارتیں ختم ہوئیں، ایوان پیچھے رہ گئے، مکانات کا سلسلہ ختم ہوا، بازار در بازار پیچھے کھڑے رہ گئے، سڑکیں ختم ہوئیں اور......

وہ تو کوئی باقاعدہ چلنے والا راستہ ہی نہیں تھا، قدموں سے روند کر زبردستی راستہ بنا تھا، خصوصیت بس یہ تھی کہ وہ ایک ویرانہ تھا، دور دور تک بس اکادکا آدمی دکھائی دے جاتے، وہ مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا اور اب ہمارے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنے کمال کا بھی اعتراف کیا کہ ہم نے شروع سے اپنے درمیان جو فاصلہ قائم کیا تھا، وہ کم وبیش ابھی تک برقرار تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔

بہت مختلف نہیں تھا اس سے جواب تک میری نگاہوں اور میرے تصور میں رہا تھا۔

ایک بے حد عام اور بدحواس آدمی ......

''اے صاحب سنئے تو......''

میں نے اسے آواز دی، وہ چونک کر ایک لمحہ کے لیے جیسے ٹھٹک گیا، پھر اپنی رفتار تیز کر دی۔

''اے بھائی......''

میں نے بھی اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے اسے پھر پکارا۔ اس کی بدحواسی بڑھ گئی اور وہ دوڑنے لگا۔ ناہموار راستے پر دوڑنا...... اسے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑا، میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچا اور سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ ٹھوکر کھانے سے اس کی پوٹلی دور جا گری تھی، میں نے جلدی سے اسے اٹھالیا......

کچھ نہیں، بس ایک بوسیدہ لیکن بے داغ سفید کپڑا......

ململ کو جیسے کانٹے دار جھاڑی پر پھیلا کر کھینچ لیا جائے...... جگہ جگہ بہت ہی بے دردی سے نچا ہوا......

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میں بغور اسے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

سدھیشور بابو حاضر ہو جائیں

— حسین الحق

سردیوں کے موسم میں تو شام ذرا پہلے کیا بہت پہلے ہو جایا کرتی ہے، تو شام ہو چکی تھی مگر مجمع ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ یہ مجمع اپنی خوشی سے نہیں لگا تھا۔

اب الیکشن پروسیس جتنا مشکل ہو چکا ہے اس میں اپنی خوشی سے کون الیکشن ڈیوٹی کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب سپریم کورٹ نے کالج اور یونی ورسٹی کے اساتذہ کو بھی الیکشن ڈیوٹی میں لگانے کا حکم جاری کر دیا تو کلکٹریٹ والوں کو ایک بہانہ مل گیا۔

''اب دیکھیں گے سالے پروفیسر لوگ کیسے بچتے ہیں۔'' پروفیسر نول کشور کسی کام سے کلکٹریٹ گئے تھے، وہاں ایک ٹیبل پر ایک کرانی کو بولتے سنا۔

''ہاں۔ سب کے سب اپنے کو کمشنر کے برابر ہی سمجھنے لگے تھے۔'' اس کرانی کے تبصرے پر دوسرے نے گرہ لگائی۔

''اب ساری ہیکڑی بھلا دی جائے گی۔'' ایک کونے سے تیسرا تبصرہ۔

نول کشور نے انجمن اساتذہ کے سکریٹری کو پکڑا، سکریٹری رجسٹرار سے ملا تو رجسٹرار نے جو حکومت کا ایک ریٹائرڈ ملازم تھا، بہت غرّا کر کہا: ''آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ سپریم کورٹ کے حکم نامے کے ساتھ لیٹر آیا ہے۔ لسٹ کیسے نہیں بھیجی جائے گی؟'' اور دوسرے دن سے آفس کا ایک کلرک لسٹ بنانے کے کام میں جٹ گیا۔

پروفیسروں کی آپس کی گفتگو میں بڑی بے چینی کا اظہار ہوا، اور طرح طرح کا ردعمل سامنے آیا۔ ایک مسلمان پروفیسر بھارتیہ جنتا پارٹی کا ممبر بن گیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیٹر پیڈ پر اپنے سیاسی تعلق کی اطلاع ڈی ایم کو بھجوا دی اور مطمئن ہو کے بیٹھا کہ اب اسے کون

چھونے والا ہے۔ دوسرے نے ایک لمبا چوڑا خط ڈی ایم کے نام لکھا اور پارٹی جوائن کرنے کی جو آزادی کالج ٹیچرس کو ملی ہوئی ہے، اس کے حوالے سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ چونکہ اساتذہ عام طور پر کسی نہ کسی سیاسی گروپ کی ہمدرد یا اس سے متعلق ہوتے ہیں، اس لیے ان سے الیکشن پروسیس میں غیر جانب داری کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔ ایک اور صاحب نے اپنا ECG، پیشاب جانچ کی رپورٹ (جس میں یرقان کی نشان دہی کی گئی تھی) الٹرا ساؤنڈ (جس میں جگر بڑھنے کی بات کہی گئی تھی) سارا لیکھا جوکھا جمع کیا اور مطمئن ہو بیٹھے کہ اس بنیاد پر بچ جائیں گے۔ ایک صاحب نے بھاگ دوڑ کر نگاہ کی کمزوری اور بہرے پن کی سرٹی فیکیٹ حاصل کرلی۔

اس عام بے چینی اور گھبراہٹ کے درمیان اسکول ٹیچرس اور نن گزیٹیڈ امپلائز کی اسٹرائک ٹوٹ گئی تو ہوا کے ریلے کی طرح ایک بات چاروں طرف یہ گشت کرنے لگی کہ اب کالج والوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ حکومت کے اپنے کارندے تو کام پر لوٹ ہی آئے۔

دوستوں نے ایک دوسرے کو خوش خبری سنائی اور گھر پر سبھی نے بال بچوں کو اطمینان دلایا۔ بات آئی گئی ہوگئی کہ پھر ایک دن جیسے بھونچال آ گیا۔ یونی ورسٹی اور کالج میں ہر جگہ بس ایک ہی بات موضوع بحث تھی: ''لیٹر آ گیا۔'' کسی کو بھی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی، ہر ٹیچر اپنے کلیگ سے بس اتنا ہی کہتا: ''تم نے سنا؟ لیٹر آ گیا۔'' اور وہ حیران ہو کر پہلا سوال یہی کرتا: ''یہ کیسے ہو گیا؟''

چاروں طرف اسکوٹر اور رکشے دوڑنے لگے۔ سنگھ کے سکریٹری اور پریسیڈنٹ کو پھر پکڑا گیا: ''کیا کیا آپ لوگوں نے؟ لیٹر کیسے آ گیا؟'' سکریٹری پریسیڈنٹ کیا جواب دیتا، وہ آفس کی طرف دوڑے اور وہاں سے یہ خبر لے کر آئے کہ صرف پروفیسر ہی نہیں آفیسرس کو بھی ڈیوٹی دے دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ رجسٹرار کو بھی اب الیکشن ڈیوٹی پر جانا ہے۔

ویسے اب رجسٹرار کی سمجھ میں بھی آ چکا تھا کہ یہ غلط ہو گیا کیوں کہ پروفیسرس، ریڈرس اور لکچررس کے ڈیوٹی پر جانے سے صرف پڑھائی کا نقصان ہونے والا تھا مگر آفیسروں کی

الیکشن ڈیوٹی تو یونی ورسٹی ہی بند کرادے گی اور ویسے بھی رجسٹرار حکومت کا گزیٹیڈ آفیسر ہوتا ہے اس کی پروفیسر سے کیا برابری۔ اس لیے ایک دروازے سے اگر سنگھ کے پریسیڈنٹ اور سکریٹری کلکٹریٹ میں داخل ہوئے تو دوسرے دروازے سے رجسٹرار صاحب بھی داخل ہوتے نظر آئے اور پھر تینوں نے ایک اسٹریجی کے تحت مشترکہ طور پر درخواست کی کہ کم از کم آفیسرس، ڈپارٹمنٹل ہیڈس اور یونی ورسٹی پروفیسرس کو Exempt کر دیا جائے۔ ڈی ایم نے یہ بات مان لی۔ سنگھ کا سکریٹری وہاں سے بہت خوش خوش لوٹا اور کریڈٹ لینے کے لیے ڈی ایم کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو پریس کے حوالے کر دی۔ دوسرے دن اخبارات میں خبر آئی کہ: ''ڈی ایم صاحب آفیسرس، ہیڈس اور پروفیسرس کو الیکشن ڈیوٹی سے بری کرنے پر راضی ہو گئے۔'' اخبار کا بازار میں آنا تھا کہ اک آگ سی لگ گئی۔ سارے ریڈرس اور لکچررس سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک اسٹریجی کے تحت ڈی ایم کے پاس گئے اور اس بات پر کافی غم وغصہ کا اظہار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پروفیسرس میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے اور ریڈرس لکچررس بالکل کوڑا کرکٹ ہیں کہ یہ جان دینے کے لیے بھیجے جائیں گے اور پروفیسر کو چھوڑ دیا جائے گا۔ کلکٹر صاحب تو ویسے ہی الیکشن کے ہنگاموں کے سبب بدحواس ہو رہے تھے، اس پر انہوں نے جو یہ ہنگامہ دیکھا تو وقتی طور پر اور نروس ہو گئے مگر چند لمحوں بعد ہی اپنی کلکٹری کے خول میں واپس آ گئے اور ڈپٹ کر بولے: ''جھوٹی خبر ہے۔ میں نے کسی کو Exempt نہیں کیا ہے۔'' ریڈرس اور لکچررس وہاں سے خوش خوش لوٹے، راستے میں ایک لکچرر نے ہنستے ہوئے کہا: ''سالے بڈھے ہم لوگوں کو پھنسانا چاہ رہے تھے۔ اب پتہ چلے گا۔'' اور واقعی وہی ہوا۔ کلکٹریٹ کے ایک ڈپٹی کلکٹر نے رجسٹرار کو فون کر کے بتایا کہ کلکٹر صاحب کسی کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ڈپٹی کلکٹر کے اس فون پر یونی ورسٹی ہیڈ کوارٹر میں پھر پٹس پڑ گئی۔ پھر لوگ سنگھ کے سکریٹری کو گالی بکنے لگے اور رجسٹرار کو یونی ورسٹی کا دو دن بند ہونا پھر یونی ورسٹی کے لیے بہت نقصان دہ محسوس ہونے لگا۔

سوچتے سوچتے رجسٹرار صاحب نے پھر نکتہ پیدا کیا اور ڈی ایم صاحب کے پاس واضح صورت حال لے کر گئے:

1۔ آفیسرس کو چھوڑ دیا جائے تا کہ یونی ورسٹی بند نہ ہو۔
2۔ ہیڈس کو چھوڑ دیا جائے تا کہ شعبوں کی دفتری کارروائیاں چلتی رہیں۔

3۔ جو ہاتھ پیر آنکھ کان سے معذور اساتذہ ہیں، ان کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ تو یوں بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔

رجسٹرار چونکہ حکومت کا ریٹائرڈ گزیٹیڈ آفیسر تھا اور ڈی ایم بھی چونکہ حکومت کی مشنری کا ہی ایک پرزہ تھا اس لیے ڈی ایم نے قہراً جبراً نہیں بلکہ تکلفاً ان تجاویز کو قبول کر لیا اور جس وقت وہ اس سہولت کا آرڈر کرنے والا تھا اسی وقت سنگھ کا سکریٹری بالکل مسمات کی شکل بنائے سامنے آ گیا اور بڑی لجاجت سے بولا: ''سر! جب آپ آفس کے ادھیکاریوں کو چھوڑ رہے ہیں تو میں بھی تو سنگھ کا ادھیکاری ہوں، سکریٹری ہوں۔'' ڈی ایم صاحب کا موڈ اس وقت ٹھیک تھا، انہوں نے جوان سکریٹری کو بھی چھوڑ دیا جو ابھی پروفیسر نہیں ہوا تھا۔ اخبار میں دوسرے دن پھر خبر آئی: ''ڈی ایم نے یونی ورسٹی کے آفیسروں اور لولوں لنگڑوں کو معاف کر دیا۔ باقی سارے پروفیسروں کو ڈیوٹی پر جانا ہوگا۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی چند برسوں قبل لکچرر بنے اشوک پرشاد اور چند برسوں میں ریٹائر کرنے والے ان کے پتا پروفیسر سدھیشور پرشاد دونوں کلکٹریٹ میں بیٹھے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے مگر بیٹا باپ سے کٹا کٹا چل رہا تھا اور باپ کی نگاہ اگر بیٹے پر پڑتی تو وہ جلدی سے اپنی نگاہ پھیر لیتا یا سگریٹ جلانے لگتا۔

سردیوں کے موسم میں تو شام ذرا پہلے کیا بہت پہلے ہو جایا کرتی ہے تو شام ہو چکی تھی مگر مجمع ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

''وجے۔ کتنا بجا بھائی؟'' سدھیشور بابو نے اپنے کلیگ وجے کمار سنہا سے پوچھا۔

''چھ بج گئے''

''ابھی اور کتنا وقت لگے گا؟''

''کیسے کہا جائے بھائی؟ اب تو ساری پہلی ترتیب ہی ختم کر دی گئی تو نئی ترتیب میں تو وقت لگے گا۔''

''لیکن اس الٹ پھیر کی ضرورت کیا تھی؟''

''ارے وہ! تم نے سنا نہیں؟ جو انتظام کیا گیا، جو مختلف پارٹیوں کی میٹنگ کی گئی، وہ ساری کی ساری پچھلے الیکشن والی تھی اس کی اطلاع مشاہدین کو ملی تو ان کو یہ شک ہوا کہ یہ خبر

پوشیدہ نہیں رہ پائے گی اور شاید سیاسی پارٹیاں الیکشن کرانے کے لیے جانے والے پریزائیڈنگ آفیسروں اور پٹرولنگ مجسٹریٹس کو پہلے ہی (Manage) کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیں گی۔ اسی لیے ساری سیٹنگ کو دوبارہ کمپیوٹر کے حوالے کر دیا گیا تھا تا کہ بالکل نیا انتظام کیا جا سکے۔ یہ ایک ایسا انتظام ہو جس کی اطلاع جانے سے پہلے تک کسی آفیسر کو نہ مل سکے۔''

سدھیشور بابو وجے بابو کی آواز سنتے سنتے اونگھ گئے۔ یہ سب کچھ سدھیشور بابو کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ساری زندگی مطلق اور مجرد کے درمیان فرق سمجھتے رہے اور سمجھاتے رہے، انہیں کیا پتہ تھا کہ ان کی ضعیفی میں انتہاؤں پر بھی ''وسط'' تلاش کیا جانے لگے گا۔ انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ریٹائرمنٹ سے صرف دو سال پہلے ان کو الیکشن ڈیوٹی مل جائے گی اور ''انڈیا انٹرنیشنل'' کے قومی سیمینار میں اجلاس کی صدارت کرنے والے کو کلکٹریٹ کے میدان میں بچھی لوہے کی کرسی پر صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک اپنا نام پکارے جانے کا انتظار کرنا ہوگا۔

''حرامزا......'' اچانک ہی ایک لفظ ان کے منہ سے بہ آواز بلند نکل گیا۔ حالانکہ انہوں نے جلدی سے زبان دانتوں تلے دبائی مگر وجے کمار نے سن ہی لیا۔

''کیا ہوا سدھیشور؟ گالی کیوں بک رہے ہو؟''

''بس ایسے ہی یار۔ جھلا گئی تھی طبیعت۔'' سدھیشور بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سدھیشور۔ تمہاری طبیعت تو ابھی جھلائی۔'' انگلش کے سینئر پروفیسر شمس الہدیٰ کہنے لگے: ''میرا تو یہ حال ہے کہ ایک ہفتہ پہلے سے یعنی جس دن سے لیٹر آیا ہے ہر بات میں ماں بہن کی گالی منہ سے نکلی جا رہی ہے۔''

سدھیشور بابو، وجے کمار سنہا اور شمس الہدیٰ تینوں آہستہ آہستہ ہنسنے لگے۔ فضا پر چھایا بوجھل پن ذرا کم ہوتا محسوس ہوا مگر اندھیرا اب اور گہرا ہو گیا تھا۔ چہرے چہرے کم تھے اور چہروں کا عکس زیادہ۔

کلکٹریٹ کے لان میں تقریباً ڈیڑھ دو سو کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور وہاں لوگوں کی تعداد چار سو سے کم نہیں تھی۔ یہ چار سو لوگ صبح نو دس بجے سے اپنا نام پکارے جانے کا انتظار کر رہے تھے، ان سب کو پٹرولنگ مجسٹریٹ کی ڈیوٹی دی جانے والی تھی۔

پٹرولنگ مجسٹریٹ کے ماتحت ایک پولیس انسپکٹر اور چار بندوق بردار سپاہی دیئے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ یہ امن وامان اور ایمانداری کے ساتھ الیکشن کے مراحل مکمل کرائیں۔ اس غرض سے ایک پٹرولنگ مجسٹریٹ کو چار سے چھ پولنگ بوتھ تک حوالے کئے جاتے ہیں جو تقریباً چار پانچ کیلومیٹر کی دوری میں پھیلے ہوتے ہیں۔ الیکشن کے دوران کئی قسم کی گڑبڑی کے خطرات رہتے ہیں۔ مثلاً پریزائڈنگ آفیسر یا پولنگ آفیسر کسی خاص سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی رعایت تو نہیں برت رہے ہیں، یا کسی پارٹی والے کسی بوتھ پر قبضہ تو نہیں کر رہے ہیں، یا علاقے کے عام لوگ تو ووٹ دینا چاہتے ہیں مگر کچھ لوگ باقی لوگوں کو کہیں اس لیے تو نہیں ڈرا دھمکا رہے ہیں کہ یہ لوگ ووٹ نہ دے سکیں۔ اس کے علاوہ کچھ اور چھوٹے چھوٹے حادثات کا خطرہ بھی بنا رہتا ہے مثلاً کہیں کچھ لوگ بیلٹ پیپر پھاڑ دیتے ہیں، کچھ لوگ پریزائیڈنگ آفیسر کے ساتھ بدسلوکی کرنے لگتے ہیں۔ ایسی ہر صورت حال میں پٹرولنگ مجسٹریٹ کو اختیار حاصل ہے کہ ان تمام حادثات وخطرات کو روکنے کے لیے جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔ یہاں تک کہ اگر وہ چاہے تو پولنگ رکوا بھی سکتا ہے۔ جہاں کوئی بدنظمی ہوئی ہے وہاں کی پولنگ کینسل کرانے کے لیے الیکشن کمیشن سے سفارش بھی کر سکتا ہے، لاٹھی چارج بھی کروا سکتا ہے۔ حد یہ کہ اگر ضرورت پڑے تو گولی چلانے کا بھی حکم دے سکتا ہے۔

''مگر وجے بابو۔'' سدھیشور پرساد وجے کمار سنہا کی طرف مخاطب ہوئے۔ ''پٹرولنگ مجسٹریٹ کو اختیارات بہت ہیں۔''

اور اس سے پہلے کہ وجے بابو کچھ کہتے اچانک دونوں کی نگاہ پروفیسر رکن الدین پر پڑی۔ پروفیسر رکن الدین گورے نارے خوبصورت آدمی تھے اور یونی ورسٹی کے چند خوش لباس لوگوں میں گنے جاتے تھے مگر اس وقت تو منظر ہی کچھ دوسرا تھا: بال الجھے ہوئے، چہرہ پسینے سے تر، سارا گوراپن سیاہی مائل ہو رہا تھا، پینٹ شرٹ پر ایک دو جگہ دھبے بھی نظر آئے۔ ایک ہاتھ میں کلکٹریٹ سے ملے ہوئے سارے کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں ان کا بریف کیس! ''دین صاحب۔'' سدھیشور بابو اچانک پکار اٹھے۔ رکن الدین آواز پہچان کر بے ساختہ ان کی طرف دوڑے۔

''کیا دین بھائی؟ آپ کی ڈیوٹی کہاں پڑی؟''

''سر! ایک دم نکسل ایریا ہے۔ شیر گھاٹی اور آمس کے بیچ سے ایک روڈ گئی ہے۔''
پروفیسر رکن الدین کا لہجہ عجب سا...... کچھ رویا رویا سا تھا۔

''آپ لوگ بچ گئے سر؟'' رکن الدین صاحب کے لہجے سے حسرت ٹپک رہی تھی۔

''ابھی کیسے کہا جائے بھائی؟'' پروفیسر شمس الہدیٰ نے گویا تسلی دی۔ ''پکارا جارہا ہے۔ دیکھئے کب ہمارا نمبر آتا ہے؟''

''آپ کو کیا ملی؟ کار یا جیپ؟'' سدھیشور بابو نے پوچھا۔

سدھیشور بابو کی اس بات پر رکن الدین اچانک ہنس پڑے: ''آپ بھی سر کیسی بات کر رہے ہیں؟''

''کیوں؟ کیا ہوا؟ میں نے غلط کہا کیا؟''

''سر، ہم لوگوں کو کار جیپ مل جائے گی تو صاحب لوگ کس پر جائیں گے؟''

''ارے بھائی۔ تو ہم لوگوں کو جانے کے لیے گاڑی تو وہ دیں گے نا؟''

''ہاں سر دیں گے۔ ٹریکٹر مل رہا ہے ہم لوگوں کو''

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' سدھیشور بابو ہڑابڑا کر کھڑے ہوگئے۔

''مولوی صاحب۔ اب وہاں کیا کھڑے ہوگئے؟ چلئے۔'' اچانک آگے رکے انسپکٹر سپاہی میں سے کوئی ایک بالکل جیسے ڈپٹ کر بولا اور رکن الدین بیچارہ مزید کچھ کہے بغیر جلدی سے پولیس والوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''یار مجسٹریٹ ٹریکٹر پر جائے گا؟'' سدھیشور پرساد بڑبڑائے۔

''ہدیٰ صاحب۔ انسپکٹر مجسٹریٹ کا ماتحت ہے یا مجسٹریٹ انسپکٹر کا ماتحت؟'' وجے کمار سنہا نے بڑے تیکھے لہجے میں شمس الہدیٰ سے پوچھا۔

کسی نے کسی کو جواب نہیں دیا۔ پروفیسر رکن الدین جا چکے تھے، نام پر نام پکارا جارہا تھا، سرد اندھیری رات دوڑتی چلی آرہی تھی۔

''وجے۔ کہیں پانی ملے گا؟''

''کیا بات ہے؟'' ہدیٰ صاحب نے سدھیشور بابو کا چہرہ دیکھا۔ فروری کی ایک سرد شام میں سدھیشور بابو کے ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔

''تم دل کے پرانے مریض ہو۔ دوا چوس لو۔ پانی مت پیوٗ۔'' وجے کمار نے مشورہ دیا۔

سدھیشور بابو صرف دل کے مریض نہیں تھے، ان کا شوگر بھی بڑھا ہوا تھا، تنفس بھی پریشان کرتا تھا اور اس وجہ سے گرد وغبار سے تو ان کو بالکل ہی الرجی تھی، ساتھ ساتھ موتیا بند بھی بالکل تیار ہو چکا تھا اور اسی فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں آپریشن لینے کا ارادہ تھا۔ ان کو بھاری کام کرنا بالکل منع تھا اور کچھ ان کی طبیعت بھی ارسٹوکریٹک تھی اسی لیے آئی اے ایس کمپیٹ کر لینے اور جوائن کرنے کے چھ ماہ بعد ہی انہوں نے استعفیٰ دے کر یونی ورسٹی جوائن کر لی۔ لکھنے پڑھنے کی عادت شروع سے تھی اور اپنے سبجکٹ کا بہت ہی واضح اور منفرد Concept رکھتے تھے اس لیے فلسفہ کے میدان میں ان کی بہت پوچھ تھی۔ عمر ساٹھ کے آس پاس تھی، صوبہ کے ایک وزیر اعلیٰ کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔ صوبہ میں اور صوبہ کے باہر ہر جگہ بحیثیت فلسفی ان کی عزت کی جاتی تھی۔ انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ایسی صورت حال کا سامنا بھی ان کو کرنا پڑسکتا ہے۔ ان کی دنیا کتاب اور قلم تھی۔ انہوں نے اپنی طبیعت کو انتظامیہ کی طرف مائل ہوتے نہ دیکھا تب ہی تو وہ انتظامیہ چھوڑ کر ٹیچنگ میں آگئے اور اب انہیں، سدھیشور پرساد کو حکم نامہ ملا کہ: ”کلکٹریٹ آؤ اور کلکٹر صاحب تمہیں جس علاقے میں جانے کا حکم دیں وہاں جا کر الیکشن مکمل کراؤ۔“

سدھیشور بابو نے دوا کھا کر سامنے رکھی ایک کرسی پر پیر پھیلا دیا اور جس کرسی پر بیٹھے تھے اس کی پشت پر سر ٹکا دیا۔

”ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا۔“ جانے کب کا سنا ہوا علامہ اقبال کے قومی ترانے کا ایک مصرعہ سدھیشور بابو کے ذہن میں گونج گیا...... ان کی آنکھیں بھر آئیں...... بچپن کے دن یاد آ گئے۔ ان کے پتا تپیشور پرساد جنگ آزادی کے جانے مانے سپاہی تھے...... بچپن میں سنا باپ کا ایک جملہ یاد آ گیا۔ انہوں نے ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: ”باعزت زندگی کے لیے آزادی ضروری ہے۔“

”اگر میں نے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس سے استعفیٰ نہ دیا ہوتا تو یہ شاید میرے اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ ہوتا۔“ انہوں نے سامنے بنے اسٹیج پر ایک خصوصی گدے دار کرسی پر بیٹھے اور حکم دیتے ڈی ایم کو دیکھ کر مند مند آنکھوں سے جانے کیا کیا دیکھا کہ ان کی آنکھیں اور دھندلا گئیں۔

ان کے سامنے پورا صوبہ کتاب کی طرح کھلا پڑا تھا۔ 1974 کے بعد سے صوبہ میں سماجی اور سیاسی ایکٹوزم کا کچھ عجیب پیچیدہ بلکہ سچ مچ سمجھ میں نہ آنے والا سلسلہ شروع ہو چکا

تھا اور لگا تار جاری تھا۔ پروفیسر سدھیشور پرساد کسی پارٹی کے ممبر نہیں تھے مگر مزاجاً وہ سماجی بدلاؤ کو خوش آمدید کہنے کی ہمت رکھنے والوں میں اپنا شمار کرتے تھے۔ اسی لیے 1974 کے بعد ''سماجی انصاف'' کا جو نعرہ عام ہوا اس سے پروفیسر سدھیشور پرساد بھی گھبرائے نہیں بلکہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو سمجھایا اور ذہنی طور پر لوگوں کو اس نہج پر تیار کرنے کی کوشش کی کہ جب ساری دنیا میں اینٹی اپرتھائڈ تحریک چل رہی ہے تو ہم عالمی سطح کے اس بدلاؤ میں روڑا کیوں بنیں؟ وہ تاریخ کا چکہ گھومنے کے قائل تھے اس لیے پسماندہ طبقات کی Enthusiasm کا جواز بھی ان کے پاس تھا اور اسی لیے جب دلت، پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کی سماج اور حکومت میں حصہ داری کی بات اٹھی تو وہ اس کے ساتھ ہو لیے مگر 1974 سے 1998 تک کے چوبیس برس کے طویل عرصے میں سماجی انصاف کے نام پر جس طرح ایک ذات کی بالادستی اور اس کی وجہ سے غنڈہ گردی، انتظامیہ کی بے ایمانی اور بے بسی، ذات کے نام پر مجرموں کی پردہ پوشی اور اساتذہ سمیت تمام نظریاتی بنیاد رکھنے والے شریف انسانوں کی بے عزتی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ ان کے اپنے بنائے ہوئے ذہنی ڈھانچے میں کہیں فٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ دارالسلطنت سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ ایک شخص جو نہ تو مرکز یا ریاست، کہیں کا وزیر ہے نہ الیکشن جیت کر آیا ہوا ایم ایل اے یا ایم پی ہے صرف راجیہ سبھا کا ممبر ہے اور وزیر اعلیٰ کا رشتہ دار، وہ اتنا سر چڑھ گیا ہے کہ یونی ورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی جب اس کے کمرے میں جاتے ہیں تو وہ بھی کھڑے رہتے ہیں کیوں کہ اس کمرے میں بس ایک ٹیبل اور ایک کرسی ہے۔ وہ شخص کرسی پر بیٹھا رہتا ہے اور ٹیبل پر پیر پھیلائے رہتا ہے اور باقی سارے وائس چانسلر اور چیرمین اس کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور وہ سارے دانشوروں کو گالی بکتا رہتا ہے۔

سدھیشور بابو کرسی کی پشت سے سر ٹکائے سوچے چلے جا رہے تھے اور کلکٹریٹ کے لان میں گہری اندھیری رات جھوم جھوم کر برس رہی تھی۔

''پورے ہندوستان پر رات کا سمئے ہے یا یہ اندھیرا صرف اسی علاقے کے لیے ہے؟'' سدھیشور بابو نے آہستہ سے وجے بابو سے پوچھا تو وجے بابو ہنس دیئے اور بڑے دھیرج سے بولے: "Please, don't give it a philosophical touch." فضا قدرے کم بوجھل محسوس ہونے لگی مگر سدھیشور بابو، وجے بابو اور ہدیٰ صاحب کی بوریت کم نہیں ہو پا رہی تھی۔

لان میں چاروں طرف برقی قمقمے روشن کر دئے گئے تھے۔ ڈی ایم صاحب اور ایس پی صاحب شاید آرام کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے اس لیے کہ اسٹیج پر بچھی تین کرسیوں میں سے بیچ والی پر ایک اسسٹنٹ کلکٹر بیٹھا تھا باقی دو کرسیوں پر ایک طرف ایک بی ڈی او بیٹھا تھا اور دوسری طرف کلکٹریٹ کا ایک بڑا بابو۔

زیادہ تر لوگ اپنا اپنا نام پکارے جانے پر جا چکے تھے۔ ان میں سے کچھ گاڑی اور پولیس پارٹی لے کر دوبارہ شاید بیلٹ پیپر لینے آرہے تھے۔ اب جو لوگ باقی بچے تھے وہ عجب گومگو کی کیفیت میں تھے۔ کبھی دل کہتا کہ اب شاید اسے نہیں پکارا جائے گا مگر پھر خیال آتا کہ مگر نام تو پکارا جا رہا ہے۔ اس نام پکارنے کے مرحلے میں تین چار مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی کا نام پکارا گیا اور وہ حاضر نہ ہوا تو پانچ سات منٹ کے وقفے پر بار بار اس کا نام پکارا گیا اور ہر بار دو تین مرتبہ پکارنے کے بعد بھی جب وہ شخص حاضر نہ ہوا تو اعلان کرنے والے بڑے بابو نے بڑے ہی دھمکی بھرے انداز میں ذرا زیادہ ہی زور سے کہا کہ: ''جو لوگ اپستھت نہیں ہوئے ہیں وہ اس بات کو نشچت سمجھیں کہ ان کے وِرودھ پراتھمکی (ایف آئی آر) اوشیہ درج کی جائے گی۔''

''ہدیٰ صاحب۔ کیا سچ مچ جو لوگ نہیں آسکے ان کے خلاف ایف آئی آر درج ہوگا۔'' وجے بابو نے ہدیٰ صاحب سے پوچھا۔

''دھت۔ آپ بھی کہاں کی بات کر رہے ہیں؟ الیکشن کے بعد کون پوچھتا ہے؟''

''آپ اتنا یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

''میرے ایک رشتہ دار دوسرے ڈیپارٹمنٹ میں ہیں، پچھلے تین الیکشن سے ان کو لیٹر آتا ہے، ان کا نام پکارا جاتا ہے اس پر بھی وہ نہیں جاتے اور کبھی کچھ نہیں ہوتا۔''

''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔'' وجے بابو آہستہ سے بولے۔

''ارے۔'' شمس الہدیٰ صاحب اچانک چونکے۔ ''وجے بابو یہ تو ریزرو والوں کا نام پکارا جا رہا ہے۔''

''مطلب؟''

''لگتا ہے۔ ہم لوگ بچ گئے۔''

''کیا کہا ہدیٰ صاحب؟'' سدھیشور بابو چونک کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''ابھی جو نام پکارا...... روی شنکر گپتا۔'' ہدیٰ صاحب نے وضاحت کی۔ ان سے میری جان پہچان ہے۔ یہ ریزرو میں تھے اور ریزرو والے تو بالکل آخر میں بلائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنرل کوٹا میں سے ہم لوگوں کا لیٹر وہاں پر نہیں ہے۔''

''ارے واہ ہدیٰ صاحب۔ ایسا ہو جائے تو میں آپ کو مٹھائی کھلاؤں گا۔ کیوں وجے بابو؟''

''ارے بھائی۔ میں کیا کہوں؟ میں بھی ریزرو میں ہوں۔ اب کہیں میرا نمبر آ گیا تو؟''

ہدیٰ صاحب اور سدھیشور بابو گڑبڑا کر چپ ہو گئے...... وجے بابو کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

''کیا سدھیشور بابو کی طرح مجھے بھی دل کا دورہ پڑنے والا ہے؟'' وجے بابو کے دل میں شک کا ایک سانپ سا رینگ گیا۔

''شری ایس ہدیٰ۔ ویا کھیا تا، بی ان کالج۔ امتھوا'' فضا میں اچانک مائکروفون سے آواز گونجی اور پروفیسر شمس الہدیٰ کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا۔

''ہدیٰ صاحب۔ آپ کی تو پکار ہو گئی۔'' وجے بابو نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں بھائی۔ پکار تو ہو ہی گئی۔ میرا اتنی دعائیں پڑھنا شاید بیکار گیا۔''

''چپ رہئے۔ مت جائیے۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' وجے بابو نے ہدیٰ صاحب کو مشورہ دیا۔

''شری شمس الہدیٰ ویا کھیا تا بدری نارائن کالج، امتھوا۔ کرپیا آپ آ کر اپنا پارٹی نمبر اور سب کا گج لے لیں۔''

مائکروفون پر آواز پورے لان میں پھیل رہی تھی اور شمس الہدیٰ صاحب رومال سے اپنا چہرہ صاف کر رہے تھے۔

''وجے بابو۔ کیا کروں؟ میرا تو ریزرو میں بھی نہیں ہے۔'' شمس الہدیٰ صاحب تھوک گھونٹتے ہوئے بولے۔

''بیٹھیے ہدیٰ صاحب، جنرل اور ریزرو کیا؟ دیکھا نہیں؟ آپ سے پہلے نو آدمی Appear نہیں ہوئے ہیں۔''

مائکروفون پر پھر آواز گونجی: ''شری شمس الہدیٰ۔ آپ جہاں بھی ہوں جلد آویں۔ یاد رکھیں جو اپستھت نہیں ہوگا اس کے وردھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔''

ہدیٰ صاحب ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں جارہا ہوں۔''

اور اس سے پہلے کہ وجے بابو یا سدھیشور جی پروفیسر ہدیٰ کو کچھ سمجھاتے، ہدیٰ صاحب اسٹیج کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔

کلکٹریٹ کے میدان میں اب زیادہ کرسیاں خالی تھیں۔ زیادہ لوگ جا چکے تھے۔ بمشکل وہاں پچاس آدمی ہوں گے۔ فروری کے مہینے سے عموماً ٹھنڈک کم ہونے لگتی ہے مگر اس مرتبہ ٹھنڈ کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے، سامنے اسٹیج پر اب صرف ایک بی ڈی او بیٹھا تھا۔ اس کے بغل میں کلکٹریٹ کا بڑا بابو ستاہوا لمبوترا چہرہ لیے کسی مشین کی طرح مائکروفون پر بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا: ''جو اپستھت نہیں ہوں گے ان کے وردھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔'' اور اسٹیج سے ذرا ہٹ کر ایک ٹیبل پر چار پانچ آدمیوں پر مشتمل کلکٹریٹ کا وہ عملہ بیٹھا تھا جو ڈیوٹی پر جانے والوں کو کاغذات دینے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

فضا عجب اٹ پٹی سی ہو رہی تھی۔ لمبے چوڑے میدان میں دس بارہ بڑے درخت برقی قمقموں کی روشنیوں کو بار بار چھپا لیتے پھر ہوا چلتی تو روشنی کی کوئی کرن کرسی پر بیٹھے کسی آدمی پر پڑتی پھر پل بھر میں ہوا کا دوسرا جھونکا اس آدمی کو دوبارہ چھپا دیتا۔ کوئی آدمی بھی پوری طرح سامنے نہیں آپا رہا تھا حالانکہ میدان میں ایسی جگہوں پر بھی خالی کرسیاں تھیں جہاں درختوں نے اندھیروں کا جال نہیں بنا تھا مگر لوگ درختوں کی اوٹ ہی میں بیٹھے ہوئے تھے، شاید شبنم سے بچنے کے لئے۔ ویسے درختوں کی اوٹ میں بیٹھنے کی وجہ سے اسٹیج والے بھی کسی کو بہت صاف صاف نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ سامنے بیٹھا بڑا بابو لوگوں کا چہرہ دیکھے بغیر بس نام پکار رہا تھا اور اب زیادہ پکار خالی جا رہی تھی اور مائکروفون پر یہ جملہ بار بار سنائی دے رہا تھا: ''اپستھت نہ ہونے والوں کے وردھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی۔''

پروفیسر شمس الہدیٰ جا چکے تھے۔

سدھیشور پرساد اور وجے کمار دوبدھے میں گھرے۔ بس اپنے دل کی دھک دھک سن رہے تھے......اور نام پکارا جارہا تھا۔

''ہے بھگوان'' اچانک وجے بابو کی کراہ سنائی دی۔ مائکروفون پر آواز گونج رہی تھی: 'وجے کمار سنہا' پروفیسر رسائن شاستر......'' سدھیشور بابو نے وجے کمار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وجے بابو نے سدھیشور جی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو سدھیشور پرساد کو احساس ہوا کہ وجے کمار کا ہاتھ تو کسی لاش کی طرح سرد ہو رہا تھا۔

''وجے؟ کیا کروگے؟'' سدھیشور جی نے بڑی اپنائیت سے پوچھا...... مائکروفون پر پھر آواز گونجی۔

''شری وجے کمار سنہا آ کر اپنا پارٹی نمبر اور دوسرے سمبندھت پیپرس لے جائیں۔''

''چھوڑو، مت جاؤ'' سدھیشور بابو بولے تو مگر ان کی آواز بالکل کھوکھلی ہو رہی تھی۔

''سدھیشور بابو۔ شمس الہدیٰ ہم لوگوں سے جونیئر ہیں۔ عمر میں کم ہیں۔ وہ تو اس کی ہمت ہی نہیں کر سکے۔'' اتنا کہہ کر وجے بابو چپ ہو گئے۔

سدھیشور بابو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ وجے کمار سے کیا کہیں ...... فضا میں وہی کرخت آواز پھر گونجی۔

''شری وجے کمار۔ اگر آپ اپستھت نہیں ہوں گے تو آپ کے وردھ پراتھمکی ......''

وجے بابو اس سے زیادہ نہیں سن پائے۔ انہوں نے اپنا بریف کیس اٹھایا اور سیدھ میں چل پڑے۔

اچانک سدھیشور بابو کو احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہیں!

اچانک انہیں یاد آیا کہ ان کا لکچرر بیٹا بھی تو کلکٹریٹ کے اسی میدان میں تھا، کیا اسے ڈیوٹی مل گئی؟ وہ چلا گیا؟ انہوں نے اچک اچک کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ سدھیشور بابو کو اپنے بیٹے پر بہت غصہ آیا۔ نالائق جانے سے پہلے مل تو لیتا۔ پھر انہیں دوسری فکر نے گھیرا۔ پتہ نہیں اس کی کس علاقے میں ڈیوٹی پڑی، اگر کہیں نکسلائٹس کا علاقہ ملا تو؟ اندر اندر ایک عجیب سے بے چینی نے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ بلڈ پریشر کے مریض کا بھی عجب حال ہوتا ہے۔ جب وہ موجود تھا تو اسے دیکھ کر گالی بک رہے تھے اور چلا گیا تو یہ سوچ کر پریشان ہونے لگے کہ جانے کس علاقے میں گیا۔

رات کے تقریباً نو بج رہے تھے، نزدیک و دور اندھیرے کی چادر تنی ہوئی تھی، لمبے چوڑے کلکٹریٹ کے میدان میں اب بہ مشکل بیس پچیس آدمی بچے ہوں گے۔ سدھیشور بابو نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، کوئی شناسا، جان پہچان کا کوئی آدمی...... سدھیشور بابو کو احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا ہیں۔ ان بیس پچیس افراد میں ایک بھی تو ان کی جان پہچان کا نہیں تھا، پتہ نہیں کون لوگ ہیں، کسی دوسرے کالج کے یا کسی آفس کے یا پھر کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر...... سدھیشور بابو فیصلہ نہیں کر پار ہے تھے۔

اچانک سدھیشور بابو کے دماغ میں ایک سوال نے سر اٹھایا۔ پورے ہندوستان میں الیکشن ہوتا ہے اور کسی صوبے کے لوگوں کو الیکشن کرانے میں کوئی دشواری تو نہیں محسوس ہوتی۔ انہیں یاد آیا، پانچ چھ سال پہلے ان کے ایک تامل دوست کے کچھ رشتہ دار اس دوست کے یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب تامل ناڈو کے کسی محکمے میں گزیٹیڈ آفیسر تھے وہ الیکشن کا تذکرہ نکال بیٹھے تھے اور بہت اطمینان سے الیکشن کے مراحل کی تفصیلات بتار ہے تھے۔ کہیں بھی تو ان کے بیان میں کوئی گھبراہٹ یا اکتاہٹ نہیں تھی۔ پھر ہم لوگ بہار، اتر پردیش اور بنگال وغیرہ کے رہنے والے الیکشن کرانے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ کیا ہم ڈرپوک ہیں؟ کیا ہم ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں؟ کیا ہمارے علاقوں میں امن وامان برقرار رکھنے کا مسئلہ واقعی دوسرے علاقوں سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ ہے؟ کیا باقی پورے ہندوستان میں غیر سماجی عناصر نہیں ہیں؟ نکسلائٹس یا پیپلز وار گروپ والے نہیں ہیں؟ واقعی ہمیں میں کیا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہم الیکشن مکمل کرانے کے کام میں حصہ لینا اپنے منصب سے کمتر سمجھتے ہیں؟ یا پھر یہ وجہ ہے کہ جو لوگ ٹیچنگ پروفیشن میں ہیں وہ انتظامیہ کے مدوجزر سے خود کو ہم آہنگ نہیں کر سکتے اور اسی لیے ٹیچر کلاس کا آدمی کبھی کبھی سر پر آنے والی اس ذمہ داری سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے کیوں کہ Mob handling ایک الگ فن ہے جس سے یا تو سیاست داں واقف رہتا ہے یا ایڈمنسٹریٹر یا پھر مجرم!

سدھیشور بابو سوالات کی ڈھلان پر پھسلے تو پھسلتے چلے گئے۔ ہدیٰ صاب اور وجے بابو تو جا ہی چکے تھے، اب انہیں روکنے والا کون تھا؟ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ چونکے۔ ان کی سمجھ

میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نو بجے سے دس بجے تک سوتے رہے یا جاگتے رہے مگر بہر حال ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ میدان میں پانچ سات آدمی آتے جاتے دکھائی دیے۔ اسٹیج بالکل خالی تھا۔

''کیا میرا نام نہیں پکارا گیا؟'' خیال کی پہلی لہر خوش کرنے والی تھی۔

''مگر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ میرا نام پکارا گیا یا نہیں پکارا گیا۔'' خیال کی دوسری لہر نے انہیں ڈسٹرب کر دیا۔

''یہ کیسے پتہ چلے کہ میرا نام پکارا گیا یا نہیں پکارا گیا۔'' انہوں نے اندر ہی اندر ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی۔

انہوں نے ذہن پر بہت زور دیا مگر وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ سو گئے تھے یا جاگ رہے تھے۔

انہیں اپنے آپ پر شدید غصہ آیا۔ لعنت ہے اس عمر پر جو اپنی خبر سے بھی بے خبر کر دیتی ہے۔ ان کو لگا کہ ان سے اچھے تو ہدئ صاحب اور وجے بابو ہی تھے جنہوں نے ایک واضح صورت حال کی طرف ارادی طور پر قدم بڑھا دیا۔

''کلکٹریٹ کے بڑا بابو سے پوچھ لیا جائے۔'' ایک راستہ نظر آیا۔

''مان لو۔ تمہارا نام نہیں پکارا گیا ہے مگر سامنے آنے پر تمہیں ڈیوٹی دے دی جائے تو؟''

سدھیشور بابو کو محسوس ہوا کہ ڈیوٹی ملنے کے تصور ہی سے ان کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔

ویسی تمام راتوں کا آخری منظر نامہ یہ ہوتا ہے کہ ہدئ صاحب اور وجے بابو آگے بڑھ جاتے ہیں اور سدھیشور بابو جہاں اور جس علاقے میں رہیں نہ آگے بڑھ پاتے ہیں نہ پیچھے ہٹ پاتے ہیں۔

سدھیشور بابو بارہ بجے رات تک کلکٹریٹ کے میدان میں کلکٹریٹ کے بڑا بابو اور دوسرے کرمچاریوں کی نظر سے بچ بچ کر ٹہلتے رہے اور اپنے جانتے صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے رہے اور انہیں کوئی اندازہ نہیں لگ سکا اور بار بار مائکروفون سے میدان میں گونجنے والی آواز ان کے سینے پر دو ہتھڑ برساتی رہی: ''اپستھت نہ ہونے والوں کے وردھ پراتھمکی اوشیہ درج کرائی جائے گی......!!''

☆☆☆

آثار

— شفق

میں راشد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

وہ خوبصورتی کی تری مورتی ہے۔ نام بھی خوبصورت، چہرہ بھی خوبصورت اور رُوح بھی خوبصورت، مگر اس طرف لوگوں سے اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں سُنیں، وہ بدل گیا ہے اُس نے اپنا گھر بدل لیا ہے، وہ ایسا ہو گیا ہے وہ ویسا ہو گیا ہے۔ راشد بدل بھی سکتا ہے مجھے اس بات پر یقین نہیں، یہ یقین راشد سے برسوں کے مراسم کی وجہ سے ہے۔ راشد کو میں اسکول کے زمانے بلکہ اس سے پہلے سے جانتا ہوں اس کا نانیہال میرے پڑوس میں تھا اور میں ایک خوبصورت سے پھُولے پھُولے گالوں والے گورے چٹے لڑکے کو کبھی کبھی وہاں دیکھتا تھا، پھر ہم اسکول کے ساتھی بنے اور یہ سفر کالج تک جاری رہا۔ اس طویل رفاقت میں اس کی ذات کا کوئی گوشہ مجھ سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس کے خاندان والے انتہائی موڈرن تھے، نہ جانے کیسے لباس پہنتے، ہمارے شہر میں وہ فیشن برسوں بعد آتا، ٹیڈی فیشن اسی گھر سے شہر میں پھیلا تھا اور وبائی صورت اختیار کر گیا تھا۔ راشد کے خوبصورت جسم پر لباس خوب کھِلتا تھا اور یہ کہنا مشکل ہوتا کہ لباس کی وجہ سے وہ خوبصورت لگتا ہے یا لباس اس کی وجہ سے۔ میں مذاق میں اس سے کہتا: ''کیوں پڑھائی میں اپنا وقت برباد کر رہے ہو تمہیں تو کوئی بھی ایڈورٹائزنگ کمپنی مُنہ مانگے داموں پر رکھ لے گی۔''

مجھے یاد ہے لڑکیوں میں وہ بے حد مقبول تھا۔ اس کی تصویر نہیں تو تصوّر ضرور سونے والیوں کے تکیہ کے نیچے رہتا ہوگا۔ میں نے اس کی آواز پر کھڑکیوں کے پٹ کھُلتے اور رکشوں کے پردے ہٹتے سیکڑوں بار دیکھے تھے۔ شموئل تو اسے لیڈی کیلر کہتا تھا۔ اب پتہ نہیں لڑکیوں کے اس التفات کا اس کے دل پر کوئی اثر ہوتا تھا یا نہیں، کبھی تو ذکر کرتا، کبھی تو خوشبو اڑتی، شاید اس کا باطن بھی ظاہر کی طرح خوبصورت تھا۔ نہ اس نے کسی کو لفٹ دی، نہ سبز باغ دکھائے، نہ

جھوٹے وعدے کیے، وہ ہمارے ساتھ فٹ بال اور بیڈمنٹن کھیلتا، انگلش فلمیں دیکھتا اور ناولیں پڑھتا۔ اسے مختلف شہروں کی سیر کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں تو ہوم سکنس کی وجہ سے اپنے شہر میں کالج کی ملازمت کو حاصلِ زندگی سمجھ بیٹھا مگر اپنے اسی شوق کے پیش نظر راشد نے پٹنہ کی ایک فرم میں سیلز آفیسر کا آفر قبول کرلیا اور اب اس کا صاف ستھرے علاقے میں چھوٹا سا خوبصورت گھر ہے، حسین بیوی اور پھول سے دو بچے ہیں۔ اب بھی اسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے وہ فوج سے نکل کر آرہا ہے۔ ٹھنڈا تروتازہ خوبصورت اور مطمئن، گھر میں وہ سب کچھ موجود جو آج کا کریز ہے۔ بچے کانونٹ میں پڑھتے ہیں، شوہر بیوی انہیں کار سے اسکول چھوڑنے جاتے ہیں، بچوں کے پیش نظر گھر میں بھی انگریزی میں بات کرتے ہیں۔

کچھ دن پہلے جب میں کہانی ریکارڈ کرانے ریڈیو اسٹیشن گیا تھا تو اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں بار بار اس سے نہیں ملتا کہ اس کے گھر ٹھہرنا پڑتا ہے پھر وہ زیادہ تر سفر میں رہتا ہے، بیوی سوچے گی مفت کا گھر دیکھ لیا ہے چلے آتے ہیں مُنہ اُٹھائے۔

ملاقات کی رات ہم نے دیر تک باتیں کیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں کتابوں کا کیڑا ہوں وہ بھی ادبی کتابوں کا۔ زندگی کے متعلق راشد کا تجربہ اور مشاہدہ زیادہ وسیع ہے۔ وہ نہ صرف مختلف شہروں کے جغرافیائی حالات سے واقف ہے بلکہ ذہنی رویّے اور سیاسی نظریوں پر بھی اس کی نظر ہے، وہ بہت دلچسپ باتیں بتاتا ہے۔ ناگالینڈ میں کوئی باہری آدمی مقامی افراد کو اوورٹیک کرکے آگے نہیں جاسکتا۔

اتنی نفرت ہے باہری آدمیوں سے؟

نفرت کہاں نہیں ہے، سیون سسٹرز کی بات چھوڑو وہ تو سیدھے سادے لوگ ہیں نفرت کا اظہار بھی سادگی سے کرتے ہیں ورنہ پنجاب، کشمیر، مہاراشٹر وغیرہ میں تو باہری افراد کینسر کی رسولی ہیں جنہیں کاٹ کر پھینکا جارہا ہے اور یہ لہر بین الاقوامی ہے۔ یوگانڈا اور بنگلہ دیش میں کیا ہوا۔ بنگلہ دیش کے بہاریوں کو پاکستانی کوڑھ سمجھ رہے ہیں۔ لگتا ہے دنیا پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے، ہر علاقے کا اپنا اپنا ٹھاکر کا کنواں ...... وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولتا رہا۔

تم ان حالات سے مطمئن ہو؟

بے اطمینانی زمین پر جنّت نہیں تعمیر کرتی، حالات جیسے بھی ہوں اُسی میں جگہ بنا کر آگے بڑھنا ہے۔

یار میں یہ سب نہیں سوچتا، مزے کی نوکری ہے۔ کالج گئے گھر آکر بال بچّوں سے ہنس بول لیا پھر کتابیں اُٹھالیں، رات کو کچھ ریڈیو ٹی وی سے خبریں سُنیں وہ بھی کہانی کی تلاش میں۔ چھوٹے شہر کی بے خبری بڑی لطیف ہے۔

کنویں کے مینڈک یہی سوچتے ہیں ——— اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

تم نے غلط کہا، نالی کے کیڑے کہنا چاہئے تھا، فرق اتنا ہے کہ کبھی کبھی نالی کے ایک دو کیڑے خشکی پر چڑھ گئے تو تمہاری طرح سوچنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ یہ جگہ عارضی ہے۔ وہ میرے حملے کو آسانی سے جھیل گیا۔ سوال یہ ہے کہ میرے ذہن میں کنواں مینڈک اور تمہارے ذہن میں نالی اور کیڑے کا تصوّر کیوں اُبھرا۔ ہمارے مذہب میں طہارت، پاکیزگی اور صفائی پر بہت زور دیا گیا ہے مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جہاں سے بجبجاتی نالیاں اور کوڑے کا ڈھیر شروع ہوتا ہے وہ ہمارے علاقے کی پہچان بن گئے ہیں۔

راشد کی بیوی کمبل لے کر آئی تو ہماری بات کٹ گئی۔ راشد نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا مگر اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، راشد کی گود میں کمبل رکھ کر شان بے نیازی سے بکھرے بالوں کو گردن جھٹک کر پیچھے کیا اور بل کھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔

واقعی خنکی بڑھ گئی تھی، ہم گھاس پر کُرسی ڈالے بیٹھے تھے، پورٹیکو بلب کی چاندنی جیسی روشنی ہم پر پھیلی ہوئی تھی، آسمان میں ستارے چمک رہے تھے اور ہر طرف سنّاٹے کی دبیز چادر بچھ گئی تھی، سب کچھ کتنا اچھا اور پُرسکون تھا، میرے لیے جنّت کا تصوّر کچھ ایسا ہی تھا، ایک گھر، پھولوں کے کچھ پودے، خلوت میں شوخ تبسّم کے دیے، ایک دو بچّے اور ایسا ہی سکون۔

میری اور راشد کی آمدنی برابر رہی ہوگی، میں نے اپنی خواہشوں کو کچل کر وراثت میں ملے کچّے مکان کو ازسرِنو تعمیر کر لیا مگر دوسروں سے بہت پیچھے چھوٹ گیا! انہوں نے مکان نہیں بنوایا مگر ضروریات زندگی فراہم کر لیں۔

وہ راشد بدل گیا ہے کتنی عجیب بات ہے، میں اس سے ملوں گا۔ جب پٹنہ جانے کا پروگرام بنا تو میں نے بیوی سے کہہ دیا میں کل واپس آؤں گا، مجھے راشد سے ملنا ہے۔ کہانی

ریکارڈ کرانے کے بعد میں نے رکشا والے کو راشد کا پتہ بتایا، مگر اُس کے نہ ہونے کا خوف پریشان کرتا رہا۔ وہی گھر وہی رونق سب کچھ وہی۔ میں نے کال بل پر انگلی رکھی۔

اندر سے ایک آدمی نکلا، میں اس سے راشد کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ دوڑ کر لپٹ گیا،

مجھے خبر ملتی رہتی ہے، تم پٹنہ آتے ہو، راشد کو بھول گئے نا؟

پہلے کنارے ہٹو، میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، یہ داڑھی پر شلوار قمیص، تم تو پورے مسلمان ہو گئے۔

کب نہیں تھا— وہ ہنستے ہوئے مجھے اندر کھینچ لے گیا، ڈرائنگ روم میں ٹی وی پر رکھا ہوا قرآن، یہ دوسری بڑی تبدیلی نمایاں نظر آئی، میں اس پر سوالات کی بوچھار کرنا چاہتا تھا، وہ میری بے چینی سمجھ کر مسکراتا رہا، میں نے جب بھی کچھ کہنے کا ارادہ کیا اس نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر مجھے روک دیا۔

پہلے چائے پی لو، تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم بھُوکے ہو، اور مجھے بھوکی زبان سے اپنے اوپر حملہ ایسا ہی لگے گا جیسے بھیڑیا شکار ادھیڑ رہا ہو۔

اس کی بیوی چائے نمکین اور پھل لے آئی، ویسے ہی کھلے ہوئے پھول کی طرح شگفتہ، دونوں نے مل کر مجھے چائے پلائی، بچے اسکول سے واپس نہیں آئے تھے، جب وہ چائے کی ٹرے لے کر چلی گئی تو میں نے کہا اب بتاؤ؟

کیا بتاؤں— تم نے پوچھا ہی کیا ہے؟

یہ کوئی نیا فیشن ہے میں نے اس کی داڑھی اور شلوار قمیص کی طرف اشارہ کیا، میرا خیال ہے بھٹو مرحوم وراثت میں یہ پیراہن چھوڑ گئے ہیں جو ہمارے یہاں بھی پرانا ہوگیا ہے۔ تم نے صرف داڑھی کا اضافہ کیا ہے۔

اے خبردار، داڑھی خدا کا نور ہے، اتنی حقارت سے اس کا تذکرہ نہ کرو۔

خیر چھوڑو، ملازمت کہاں کر رہے ہو، میرا خیال ہے......

تمہارا خیال غلط ہے، اس نے بات کاٹ دی، وہ ملازمت میں خود چھوڑنے والا ہوں، دوا کمپنیوں سے باتیں کر رہا ہوں، ایک مخصوص درخت کی چھال جو دواؤں میں کام آتی ہے سیون سسٹرز کے جنگل میں بہت ملتی ہے۔

تو اب صحرا کی خاک چھانو گے؟

جی جناب، مگر مجنوں بن کر نہیں، بزنس مین بن کر۔

میں کوئی ایسا سرا ڈھونڈھ رہا تھا جس سے وہ خود ہی گرہیں کھولنے پر آمادہ ہو جائے۔ میں سوچنے لگا تو وہ بولا:

بہت دن ہوئے ڈائجسٹ میں ایک قصّہ پڑھا تھا، نام یاد نہیں مگر ایک بزرگ کا قصّہ ہے جن سے بادشاہ وقت ناراض ہو گیا تھا اور انہیں قید کروا دیا تھا۔ اُنہیں روز دربار میں بلوا کر کوڑے لگواتا۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا، جب وہ رہا ہوئے تو اُن کے ایک معتقد نے اُن سے پوچھا: یا حضرت کوڑے لگائے جانے کے دوران کبھی آپ گھبرائے بھی تھے؟

ہاں ایک بار — بزرگ کے چہرے پر حیا کا رنگ دوڑ گیا، کوڑا کھانے کے دوران ایک دن میرا ازار بند ٹوٹ گیا تھا۔

اچھا بہت عالم فاضل مت بنو، میں نے بھی بہت سے قصّے پڑھے ہیں اور دیکھ رہا ہوں کہ ان دنوں تم مذہب کا مطالعہ کر رہے ہو۔ میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا، یہ بتاؤ دسمبر میں تم کہاں تھے؟

بمبئی — وہ زیرِ لب مسکرایا، کیوں؟

فساد کے دوران تم وہیں تھے؟

ہاں مگر بمبئی میں فساد کہاں ہوا؟ وہ زیرِ لب مسکرایا، اور اس سے پہلے کہ میں جھلا کر کچھ کہتا وہ کہنے لگا، ایک بار دیوتا اور دانو نے مل کر سمندر کا خزانہ نکالنے کا ارادہ کیا، شیش ناگ کی پیٹھ پر بیٹھ کر انہوں نے سمندر منتھن کیا۔ سمندر کی تہہ سے دو کلش ملے، ایک میں وش تھا دوسرے میں امرت، مانو جاتی کو بچانے کے لیے وش کا کلش تو شنکر بھگوان پی گئے، دانو امرت پی جانا چاہتے تھے پھر انہیں مارنا اسمبھو ہو جاتا، دانو اور دیوتا میں امرت کے لیے گھمسان یدھ ہوا اور اس میں جیت دیوتاؤں کی ہوئی۔

تو کیا آج ہم قصے کہانیوں ہی میں بات کریں گے؟

نہیں — میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ایک بار پھر سمندر منتھن ہو رہا ہے مگر اب نہ شنکر ہیں نہ دیوتا، راکشسوں کی مختلف ٹولیاں امرت تک پہنچنے کے لیے آپس میں یدھ کر رہی ہیں اور بیچ میں ہم کھڑے ہیں ان کے زہریلے ہانڈوں کی زد میں......

مسٹر راشد میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ بمبئی کے فساد میں تم نے مذہب کا جنونی رقص دیکھا؟ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنی بات کی اہمیت بڑھانی چاہی۔

جنونی رقص ضرور دیکھا مگر مذہب کا نہیں، اس نے بھی میرے انداز کی نقل کی۔ ٹھاکر کے کنویں کا جنون تھا، اس کنویں کا پانی صرف ہمارے لیے ہے، سب اپنی ڈولیں لے کر واپس جاؤ جو نہیں جائے گا اس کے جن بچّے کولہو میں......

میں نے اکتا کر گھڑی دیکھی، عام لوگوں سے الگ باتیں کرنا اس کی فطرت بن گئی ہے اس سے کچھ اگلوالینا مشکل ہے۔

وہ جو اُلجھن سی تیرے......

میں جھلاّ کر کھڑا ہو گیا۔ خدا حافظ، شام کی بس سے واپس جانا ضروری ہے۔

بیٹھو بیٹھو، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، تم شاید مذہبی جنون اور فساد کی بات پوچھ رہے تھے، وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا، جب میں ٹرین سے واپس آ رہا تھا میں نے فساد دیکھا، گاڑی اسٹیشن پر رکتی یا روکی جاتی، ڈبے کی تلاشی ہوتی چن چن کر مسافر اتارے جاتے جن کی شناخت نہ ہوتی، اُن کی پتلون کھول دی جاتی اور پھر لاش برہنہ پڑی رہ جاتی۔ راشد کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور میں راشد بزدل، جان کے خوف سے کانپ رہا تھا اگر کسی کو شک ہو جاتا تو میرا بھی وہی حشر ہوتا، وہ خوش قسمت تھے جو ظاہری شناخت کی وجہ سے نہ بے غیرت ہو کر مرے، نہ مر کر بے غیرت ہوئے، اس کی آنکھیں خون خون ہو گئیں۔

بہت دیر تک ایک تکلیف دہ خاموشی ہم پر مسلط رہی پھر اس نے دھیرے سے پوچھا: آج جانا ضروری ہے......

☆☆☆

دھار

— بیگ احساس

صبح جاگنے کے بعد اس نے حسب معمول شیو کرنا چاہا تو اسے اپنا شیونگ سیٹ جگہ پر نہیں ملا اس نے سارا کمرہ دیکھ لیا۔ بچے بھی اس کے کمرے میں نہیں آتے تھے۔ اس کی چیزوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اسے سخت غصہ آیا۔ جب سے اس کا لڑکا واپس آیا تھا اس کا موڈ بے حد خراب رہنے لگا تھا۔ اس نے بیوی کو بلا کر ڈانٹا کہ وہ اس کی چیزوں کا خیال نہیں رکھتی۔ اس کی بیوی بھی حیران تھی کہ آخر شیونگ سیٹ کہاں گیا...... اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا، ہر ممکن جگہ دیکھ لی لیکن وہ سیٹ نہیں ملا۔

برسوں کی عادت تھی۔ چودہ برس کے عمر سے وہ برابر شیو کر رہا تھا۔ صبح جاگتے ہی پہلا کام یہی ہوتا۔ اتنے برس گزر گئے اس کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ آج تک کسی نے اس کی داڑھی بڑھی ہوئی نہیں دیکھی تھی۔ بیماری اور سفر کی حالت میں بھی وہ شیو کرنے سے کبھی نہ چوکتا۔ تیز دھار کی بلیڈ جب تک اس کے گالوں پر نہ دوڑتی وہ خود کو تر و تازہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ پنشن کے بعد اس کے بہت سے دوستوں نے شراب چھوڑ دی اور داڑھی بڑھا لی تھی لیکن وہ آج بھی بہترین بلیڈ اور قیمتی شراب استعمال کرتا تھا۔

"کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟" اس نے سوچا۔

اس کا بیٹا تو مولوی ہے پورا مولوی...... اس نے تو داڑھی رکھ چھوڑی ہے۔ سیاہ شرعی داڑھی۔ اُسے یہ سب پسند نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا تمام مذاہب انسانوں سے محبت کے لیے آئے ہیں انسانوں سے نفرت کرنے کے لیے نہیں۔ سارے مذاہب کچھ خاص زمانے میں مخصوص حالات میں اس دور کے لوگوں کے لیے آئے تھے اب وہ پرانے ہو چکے ہیں موجودہ دور میں نا قابلِ عمل......! سب اپنے مذہب کو بہتر سمجھتے ہیں، کوئی کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتا نتیجے میں کتنے تصادم، کتنے فسادات، کتنی جنگیں ہوئیں۔ سارے مذاہب کے پیشوا عظیم انسان

تھے انھوں نے ایک اچھے معاشرے کے لیے محنت کی۔ آج بھی پرانی باتوں کو دہرانے کی بجائے ایسی ہی کوشش کی جانی چاہیے۔

اس نے اپنے بیٹے کو روکا نہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی اپنے طور پر دنیا کو برتے اور فیصلے کرے۔ اسے دیکھ کر کوفت ضرور ہوتی تھی۔

اور اب اس کے لڑکے کو بڑے زور کا دھکا لگا تھا۔ ویسے وہ بھی اندر سے ہل گیا تھا۔ ادھر کچھ برسوں سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے نظریات کو پے در پے شکست ہو رہی ہے۔ اس کی طرح سوچنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ صارفیت کے طوفان میں سب بہہ رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے آدمی دنیا کے کسی بھی کونے میں جانے کے لیے تیار ہے۔

جب ملک تقسیم ہوا اس وقت وہ جوان تھا۔ ہر شخص بھاگ رہا تھا، تحفظ کے لیے، بہتر مستقبل کے لیے، مفت میں جائیداد حاصل کرنے کے لیے۔ پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں تھی، بس سرحد پار کرنا تھا۔ اس کی ماں کا اصرار تھا کہ وہ ادھر چلے جائیں لیکن وہ یہیں رہنا چاہتا تھا۔ اپنے ملک میں۔ جب بھی فسادات ہوتے اس کی ماں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی لیکن اسے کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ اس کے اپنے خواب تھے، انسانیت پر بھروسا تھا۔ جب جہالت دور ہوگی لوگوں کو شعور آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سب مذہبی جنون ہے۔ اُدھر بھی بہت چین اور سکون نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے معمولی سی سرکاری ملازمت مل گئی۔ وہ اسی میں خوش تھا۔ شادی ہوئی۔ بچے ہوئے۔ بہت خوش حالی تو نہیں تھی لیکن وہ ایک باوقار زندگی گزار رہا تھا۔ بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے لیکن اچھا پڑھتے تھے۔

دوسری بار پھر وہ ایک کڑے امتحان سے اس وقت گزرا جب خلیج کے راستے کھلے۔ اس کے کئی دوست دولت سمیٹنے کے لیے بھاگے۔ بیوی نے اسے بہت سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ وہ ایسے ملک میں نہیں جائے گا جہاں اسے دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنا پڑے۔ پھر اس ملک کے قوانین، طرزِ زندگی، وہ تو گھٹ کر مر جائے گا۔

اس نے دھیرے دھیرے زندگی جوڑی۔ شہر سے دور ایک ہاؤزنگ سوسائٹی کے تحت زمین خریدی اور برسوں میں رفتہ رفتہ گھر بنایا۔ پندرہ بیس برس میں اس علاقے کی صورت بدل

کر رہ گئی۔ اب وہ شہر کا ایسا حصہ بن گیا تھا جس کی بے حد مانگ تھی۔ کالونی میں سب اس کے جاننے والے تھے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والے اس کے دوست جن کے ساتھ وہ شراب پیتا تھا، بحثیں کرتا تھا۔ اسے وہ سب اپنی ہی طرح لگتے تھے۔ لڑکے نے بھی سرکاری کالج اور یونیورسٹی سے پڑھ کر انجینئرنگ کر لی تھی، ایک فرم میں ملازمت بھی کر رہا تھا۔ لڑکی کی شادی ہو گئی تھی۔ داماد خلیجی ملک میں ملازمت کر رہا تھا۔ بیٹی اور نواسے اس کے ساتھ تھے۔ بڑی حد تک وہ مطمئن تھا۔ لیکن اندر سے سب کچھ اطمینان بخش نہیں تھا۔ پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ کسی بھی قوم کی زندگی میں پچیس پچاس برس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شخصیت پرستی اور موروثی نظام نے رنگ دکھایا۔ ضدی عورت اور ناتجربے کار لڑکا خود بھی تباہ ہوئے اور ملک کو بھی تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔ ان کے بعد اونگھتے ہوئے بوڑھے نے تابوت میں آخری کیل جڑ دی۔ سب کچھ برباد ہو کر رہ گیا۔ ملک کو رتھ والوں کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔

قدیم عبادت گاہ ہٹ دھرمی سے گرا دی گئی تو بہت کچھ بدل گیا۔ کتنے لفظ بے معنی ہو گئے اور کتنے نئے لفظ نئے مفہوم لے کر آئے۔ شیلانیاس، کارسیوک، ڈھانچہ، ہندوراشٹر، بھارتیہ کرن، اُگروادی، جہاد، بم بلاسٹ، انکاؤنٹر، نئی نئی دہشت پسند تنظیمیں، بڑی جارحانہ وطن پرستی آ گئی تھی۔ کچھ نئے لوگ اس منظرنامے میں ابھر آئے تھے جن کا کام صرف زہر اگلنا اور دھمکیاں دینا تھا۔ سیکولر کہلانے والے اپنی کلائیوں پر سرخ دھاگے باندھنے لگے تھے۔ اپنے بچوں کی شادی کے دعوت ناموں پر جلی حرفوں میں بسم اللہ اور اوم لکھا جانے لگا تھا۔ ایک بڑی طاقت تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی اور کل تک جو سوشلسٹ لیڈر تھے، بائیں بازو کے اخبارات شائع کرتے تھے وہ کٹر مذہبی جماعتوں کے تلوے چاٹنے لگے تھے۔

تبدیلی اس کی کالونی میں بھی آئی تھی۔ وہ خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ شام کی محفلیں کبھی کی ختم ہو چکی تھیں۔ محلے کے بچوں نے اس کے نواسوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔

پاکستانی...... پاکستانی......!

اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ جس ملک کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا وہی اس کے بچوں کے سروں پر تھوپا جا رہا ہے۔ اس کے بچے پاکستان کے بارے میں زیادہ جانتے بھی نہیں تھے۔

''نانا جی وہ ہمیں پاکستانی کیوں کہتے ہیں۔'' وہ چپ رہا۔
''کیوں کہ ہم مسلم ہیں۔'' بڑے نواسے نے کہا۔
''کیا تمام مسلم پاکستانی ہوتے ہیں؟'' پھر سوال کیا گیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، جھلا کر اسی وقت باہر نکلا۔ وہ کالونی کے بزرگوں سے ملا۔ صورت حال بتائی۔ کسی نے اس کی بات رد نہیں کی۔ لیکن اسے لگا جیسے صرف وہی بول رہا ہے، خلا میں اس کے الفاظ بکھر رہے ہیں اور کوئی معنی نہیں دے رہے ہیں۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ شاید اب وہ یہاں نہیں رہ پائے گا۔ جو قومیں کمزور پڑ جاتی ہیں انھیں سلمس میں ڈھکیل دیا جاتا ہے۔ اپنا گھر فروخت کرتے وقت اسے سخت تکلیف ہوئی۔ قیمت بھی وہ نہیں ملی جو بازار کی تھی۔

اپنے بیٹے اور بیوی کے مشورے سے وہ ایک ایسی بستی میں آ گیا جہاں وہ تحفظ محسوس کرتے تھے۔ بے ترتیب مکانات، سڑکیں خستہ حال، ہر نکڑ پر نوجوانوں کی ٹولیاں، لمبے لمبے کرتے اور اونچے پاجامے پہنے بزرگ، لمبی داڑھیاں، سر پر ٹوپیاں...... سیاہ برقعوں میں گھومتی عورتیں، صرف آنکھیں کھلی رہتیں۔ نوجوان لڑکے جینز اور ٹی شرٹ پہنے موٹر سائیکلوں پر دندناتے پھرتے۔ راتوں رات دولت مند بن جانے اور بغیر محنت کے پیسہ کمانے کے خواب آنکھوں میں سجائے سر پر الٹی کیپ لگائے، جیبوں سے سیل فون کی گنگناتی موسیقی...... ہر گھر کا کوئی نہ کوئی فرد بیرونِ ملک ملازم تھا...... نماز کا وقت ہوتا تو لاؤڈ اسپیکر پر اذانوں کا شور بلند ہوتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔

عجیب بستی تھی۔ سب کو سب کی خبر ہوتی تھی۔ کون کیا کرتا ہے، کیا کھاتا ہے کیا پہنتا ہے، کس گھر میں کون مہمان آیا ہے۔ پتہ نہیں یہ ساری باتیں کیسے ایک دوسرے تک پہنچ جاتی تھیں۔ شروع شروع محلے والوں نے اسے بھی گھیر لیا۔ نمازیوں کی ایک ٹولی اس کے پاس آئی۔ ''راہِ راست'' پر لانے کی کوشش کی گئی۔ اس نے سختی سے کہہ دیا کہ گناہ اور ثواب کے بارے میں وہ ان سے زیادہ جانتا ہے۔ اب وہ عمر کی اس منزل میں ہے کہ کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے وہ اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہے۔ اس کی اصلاح کی کوشش نہ کریں۔ اس کے لہجے میں اتنی تلخی اور درشتگی تھی کہ دوبارہ پھر کسی نے ہمت نہیں کی۔ البتہ اس کا بیٹا محلے میں جلد ہی مقبول ہو گیا۔ وہ نماز کا پابند بھی تھا اور محلے کے نوجوانوں اور بزرگوں میں وقت بھی گزارتا تھا۔ بیوی بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی۔

اس نے ایک معمول بنالیا تھا۔ صبح ہوتے ہی داڑھی بناتا، نہاتا، تفصیل سے اخبار پڑھتا، ناشتہ کرتا پھر لائبریری میں بیٹھ جاتا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر سو جاتا۔ شام میں کہیں کوئی جلسہ کوئی میٹنگ ہوتی تو چلا جاتا یا اپنے کسی دوست کے گھر چلا جاتا۔ اپنے معمول کے دو تین پیگ لیتا اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا۔ جب کبھی معمول سے زیادہ ہو جاتی تو اس کے قدم ہلکے سے لڑکھڑانے لگتے تو وہ سیدھے بستر میں چلا جاتا۔ اس کے بیوی فرش پر بستر بچھا کر سو جاتی۔ احتجاج کا ایک نیا طریقہ اس نے نکالا تھا۔ محلے والے تو اسے بس باہر جاتے اور آتی ہوئی دیکھتے تھے۔ کسی سے اس کی ملاقات نہ تھی۔

قدیم عبادت گاہ کے گرنے کے تقریباً دس برس بعد جدید طاقت، تہذیب و معاشرت کی علامت دو عمارتیں اچانک گرا دی گئیں۔ اور پھر بہت کچھ بدل گیا۔ عمارتیں گرتی ہیں تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ پھر کچھ نئے لفظ آئے جن میں زیادہ شور تہذیبوں کا ٹکراؤ اور دہشت گردی کے خلاف جنگ، ایٹمی ہتھیار رکھنے والے ممالک کا صفایا کا تھا۔

قدیم عمارت گری کہ جدید عمارتیں، نقصان اسی کا ہوا۔ اس کی پوزیشن خراب ہو گئی۔ یوں اس نے جنگ کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا۔ سیمناروں اور سمپوزیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اسے محسوس ہوا یہ سب کچھ ایک انٹلکچول تفریح کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ لوگ جنگ کی ہولناکی کو محسوس نہیں کرتے۔ ٹی وی پر جنگ کے مناظر ایسے ہی دیکھتے ہیں جیسے فیشن چینلس پر خوب صورت جسم، جیسے بلیڈ سے تراشے گئے ہوں ایک ایک عضو نپا تلا...... جسم پر صرف تین تکونی ٹکڑے پتلی ڈوریوں سے بندھے ہوئے اور ایک گرہ۔ ٹی وی اور انٹرنیٹ نے تصور کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا، ساتھ ہی جنگ اور فیشن شو کے ریمپ کا فرق بھی مٹا دیا ہے۔

دوستوں سے بحث کرنے میں بھی کوئی لطف نہیں تھا۔ اس کی طرح سوچ والے کم ہوتے جا رہے تھے۔ ایک رخ تو یہ ہے کہ لوگ اسی بڑی طاقت کو ظالم تو کہتے ہیں لیکن کسی خلیجی ملک کے حکمران کو ڈکٹیٹر نہیں کہتے۔ لوگ خودکش بم کی تائید تو کرتے ہیں لیکن بے گناہ مرنے والوں پر افسوس نہیں کرتے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ کہیں بھی بم بلاسٹ ہوتا ہے، دہشت گردی ہوتی ہے تو اس کی طرف عجیب نظروں سے گھورتے ہیں جیسے ہر دہشت گردی کا ذمہ دار وہ ہو۔ پولیس راتوں رات اس کے محلے کے نوجوانوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔

ان حالات میں اس کے لڑکے نے جب کہا کہ وہ ایک مغربی ملک کو جارہا ہے تو وہ چونک پڑا۔

''کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''ظاہر ہے بہتر مستقبل کے لیے۔''

''کیوں کیا یہاں تمھارا کوئی مستقبل نہیں ہے؟''

''نہیں پاپا۔ ہمارے ملک کو اعلیٰ تعلیم یافتہ سوچنے والے ذہن کی ضرورت نہیں ہے۔''

''وہاں بھی تو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں۔''

''وہ عبوری دور ہوتا ہے پاپا۔ پیسہ بھی معقول ملتا ہے۔''

''تو تم پیسہ کمانا چاہتے ہو؟''

''ہاں پاپا پیسہ موجودہ دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔''

''لیکن مذہب تو قناعت پسندی......''

''مذہب پیسہ کمانے سے روکتا نہیں'' بیٹے نے بات کاٹ کر کہا ''اچھا......اچھا'' بیٹے کے جارحانہ موڈ کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے اگر قناعت پسندی سے کام لیا، زیادہ پیسوں کا لالچ نہیں کیا تو ضروری نہیں کہ اس کا بیٹا بھی ایسا ہی سوچے۔ پہلے جو تعیش کی چیزیں کہلاتی تھیں اب وہ ضرورت بن گئی ہیں جس کے لیے پیسہ چاہیے۔ اس کے بیٹے کو اس کے انداز میں جینے کا موقع دینا چاہیے۔

زور شور سے تیاریاں ہونے لگیں، کپڑے، جوتے، سفر کا سامان، ضروری چیزیں وہاں کے موسم سے مطابقت رکھنے والی......ایک ایک تفصیل تھی اس کے بیٹے کے پاس اس ملک کی......

پھر سب نے نمناک آنکھوں سے دواع کیا۔ دعائیں دیں، امام ضامن باندھے......

گھر لوٹے تو بڑا سونا پن محسوس ہونے لگا۔ ادھر کئی دنوں سے بڑی گہما گہمی تھی۔ رات دیر گئے تک جاگنا۔ دوست احباب کا آنا جانا۔

بیٹے نے ممبئی سے فون کیا کہ پہنچ گیا ہے۔ پھر اس ملک کے پلین میں بیٹھنے سے قبل فون کرنے کا وعدہ کیا۔ رات میں اس کا فون آیا کہ وہ پلین میں بیٹھنے جارہا ہے۔ وہ آرام سے سو گئے۔

صبح وہ جلد ہی جاگا۔ شیو کیا۔ بیٹے کے فون کا انتظار کرنے لگا۔ بیوی بھی فجر پڑھ کر مصلّے پر بیٹھی تھی۔ کافی انتظار کے بعد بھی فون نہیں آیا تو وہ بے چین ہو کر ٹراویلنگ ایجنسی کے دفتر بھاگا جس کے ذریعے اس کا بیٹا گیا تھا۔ ٹراویلنگ ایجنسی والے بھی کوشش میں لگ گئے۔ وہ گھر لوٹ آیا۔ بیوی گڑگڑا کر دعائیں کرتی رہی۔ وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ پھر ٹراویلنگ ایجنسی والوں کا فون آیا کہ اس کا لڑکا وہاں پہنچ تو گیا ہے لیکن ایر پورٹ پر روک لیا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ فون کھڑکھڑانے لگا جن دوستوں کے بچے اس ملک میں تھے یا خاندان کے افراد وہاں تھے۔ ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن بات نہیں بنی۔ رات بھر وہ بے چین رہا۔ یہ دوسری رات تھی۔ پتا نہیں بیٹے پر کیا گزر رہی تھی۔

رات اس کے بیٹے کا فون آیا

''ہاں بیٹے کیا ہوا؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں پاپا میں واپس آرہا ہوں۔''

''کیا ہوا۔ کچھ بتاؤ تو۔''

''آکر بتاؤں گا......'' بیٹے نے اپنی واپسی کی فلائیٹ کا وقت بتایا۔ صبح اس نے حسب معمول شیو کیا۔ وقت سے پہلے ہی ایر پورٹ پہنچ گیا۔ بیٹا واپس آگیا۔ اس نے اُسے گلے لگایا۔ ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا ''کیوں روک دیا تھا انھوں نے؟''

''ان کا خیال ہے میری شکل بین الاقوامی دہشت گردوں سے ملتی ہے۔''

''تم نے کچھ نہیں کہا؟''

''وہ لوگ کچھ سننے کو راضی نہیں تھے۔ انکوائری کی گئی اُس کے بعد چھوڑا۔''

''کچھ ثابت نہ ہونے پر بھی واپس کر دیا۔''

''ہاں......''

''چلو یہی کیا کم ہے تم صحیح سلامت واپس آگئے۔ اللہ جو بھی کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔''

اس کے بیٹے نے عجیب نظروں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ ہو گیا۔ یہ کیسے الفاظ اس کے منھ سے نکل رہے ہیں۔

بیٹے کے اس طرح لوٹ آنے پر اسے بہت بڑا دھکا لگا۔ کیا ان پر دنیا تنگ ہو رہی ہے۔ یہاں زہریلے بیانات روزانہ پڑھنے کو ملتے ہیں۔ نسل کشی کا ایک کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے ظالم ہی حکومت بھی کر رہے ہیں۔ خلیجی ممالک اپنے ملک میں پیدا ہونے والے بچوں کو بھی شہریت نہیں دیتے۔ مغربی ممالک کا بھی یہی رویّہ ہے۔

بیٹے کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں کر سکا کہ اس واقعے کا اس پر کیا اثر ہوا۔ اس نے پرائی ملازمت جوائن کر لی تھی۔ کام میں مصروف تھا۔ ممکن ہے اس نے بیرونِ ملک جانے کا خواب دیکھنا ہی چھوڑ دیا ہو۔

آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ اچھی خاصی داڑھی نظر آ رہی تھی، سفید سفید ...... تیز دھار کی بلیڈ کے لیے وہ بے چین ہو گیا۔ اس کی بیوی بار بار کہہ رہی تھی کہ وہ دوسرا شیونگ سیٹ خرید لے یا باہر جا کر داڑھی بنوا آئے۔ اس کا چہرہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ لیکن وہ کاہلی سے گھر میں پڑا رہا۔ بیٹا آفس کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ شام تک باہر نہیں نکلا معمول کے دو پیگ بھی نہیں لیے۔ دن بھر پڑھتا رہا یا ٹی وی پر خبریں دیکھتا رہا۔

اس کا بیٹا اجازت لے کر کمرے میں آ گیا۔

''پاپا یہ لیجیے آپ کا شیونگ سیٹ۔ میں لے گیا تھا۔ آپ سے پوچھے بغیر ...... آئی ایم سوری پاپا ......'' لڑکا ایک سانس میں کہہ گیا۔

''تمھیں کیا ضرورت پڑی اس کی ......'' اس نے کہا۔ نظر اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا اس کے بیٹے کے چہرے پر داڑھی برائے نام رہ گئی تھی۔

''تمھاری داڑھی؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''آہستہ آہستہ کم کر دی۔ اب کلین شیو ہو جاؤں گا۔'' بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا ''لیکن کیوں؟''

''نیا پاسپورٹ بنواؤں گا کلین شیو تصویر کے ساتھ ......''

''لیکن یہ کیسے ممکن ہے ریکارڈ ہوتا ہے ...... باضابطہ''

''یہاں سب کچھ ممکن ہے پاپا۔ بس سورس چاہیے۔ اس بار کہیں اور جاؤں گا۔''

''لیکن یہ غیر قانونی ہے۔''

''کیا بغیر داڑھی کے پاسپورٹ بنوانا غیر قانونی ہے؟''

وہ خاموش ہو گیا، بحث نہیں کی۔

''صرف داڑھی رکاوٹ بن گئی ہے پاپا...... یہ لیجیے آپ کا سیٹ۔''

''نہیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا ''اسے تم ہی رکھ لو۔''

لڑکے نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، اپنی بڑھی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ایسے بھی وہ برا نہیں لگ رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

☆☆☆

دلوں کی دیواریں

— غضنفر

خبر دیکھ کر عزیز الدین پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہنستا بولتا چہرہ یکبارگی بت بن گیا۔ مگر جلد ہی اس بت میں جان پڑ گئی، اور ایسی جان پڑی کہ آنکھیں دہک اُٹھیں بھنویں کھنچ گئیں۔ جبڑے سخت ہو گئے ہونٹ بھنچ گئے، جیسے بت میں کوئی پریت آتما در آئی ہو۔

عزیز الدین تیزی سے الماری کی طرف لپکے۔ ایک جھٹکے کے ساتھ الماری کا شیشہ کھینچا۔ ایک خانے سے ایک کھلونا باہر نکالا اور اسے زمین پر پٹخ دیا۔

قدیم مورتیوں کی طرز کا کھلونا ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا۔ آن کی آن میں کھلونے کی نقاشی، اس کا رنگ، اس کی چمک دمک، سب کچھ خاک میں مل گیا۔

عزیز الدین کچھ دیر تک کھلونے کی کرچیوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھتے رہے، پھر انہیں بٹور کر اپنے پڑوسی کے دروازے پر پھینک آئے۔

پریت آتما کا زور کم ہوا تو عزیز الدین کا چہرہ اداسیوں سے بھر گیا۔ آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

عزیز الدین کی بیوی کو خبر نے اس طرح بے خبر کر دیا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھیں جیسے انہیں لقوہ مار گیا ہو۔

ان کا بیٹا اظہر الدین اسکول سے لوٹا تو اس نے اپنے گھر میں قبرستان جیسا سناٹا پایا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے رشتے داروں میں سے پھر کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ ایسی گہری خاموشی اس نے اپنے گھر میں ایک بار پہلے بھی دیکھی تھی جب اس کے نانا کے مرنے کی خبر آئی تھی۔ اس نے پاپا اور ممی کے چہروں کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا:

''کیا بات ہے، کہیں نانی......''

''نہیں بیٹے! یہ بات نہیں ہے'' عزیز الدین کی بیوی کے بے حس و حرکت جسم میں ایک دم سے روح دوڑ گئی۔

''کوئی اور مر گیا کیا؟''

''نہیں، کوئی نہیں مرا۔'' اس بار پاپا نے جواب دیا۔

''تو پھر آپ لوگ اتنے سیریس (Serious) کیوں ہیں؟''

'' بیٹے! دشمنوں نے ہماری مسجد شہید کردی۔''

''شہید کردی؟''

''میرا مطلب ہے توڑ دی۔'' عزیز الدین نے وضاحت کی۔

''نہیں تو، ہماری مسجد تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں میں اسی راستے سے تو آ رہا ہوں۔ میں نے تو دروازہ پر کھڑے امام صاحب کو سلام بھی کیا تھا۔''

''یہ مسجد نہیں بیٹے ......''

''تو پھر کون سی مسجد؟''

''وہ مسجد جو ہمارے بزرگوں کی نشانی تھی جو......''

''کہیں آپ اس مسجد کی بات تو نہیں کر رہے ہیں جسے ٹیلی ویژن پر ڈھانچا کہا جاتا ہے۔''

''ہاں، وہی مگر وہ ڈھانچا نہیں، جیتی جاگتی مسجد تھی۔''

''مگر خبروں میں تو یہ بتایا جاتا ہے کہ کافی دنوں سے اس میں نماز نہیں پڑھی گئی، ایک عرصے سے وہ بند تھی۔''

''بند نہیں تھی، بند کردی گئی تھی۔''

''پاپا، اس میں ایسی کیا بات تھی کہ آپ لوگ اس قدر......''

عزیز الدین نے بیٹے کو غور سے دیکھا پھر جواب دیا:

''وہ ہماری شناخت، ہماری تہذیب اور ہماری کامرانی کی علامت تھی۔''

''آپ نے دیکھی تھی۔''

''نہیں مجھے اس کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔''

''شرف حاصل نہیں ہوا یعنی؟''

''موقع نہیں ملا دیکھنے کا۔'' عزیز الدین کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، آواز گلوگیر ہوگئی، بیوی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

اپنے پاپا ممی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اظہر الدین بھی اداس ہو گیا۔

''بیٹے، تم جاؤ، کہیں گھوم پھر آؤ، مگر سنو، اپنے پڑوسی کے ساتھ نہ کھیلنا۔''

''آپ کا مطلب ہے بنٹی کے ساتھ؟''

''ہاں''

''کیوں پاپا؟''

''وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔''

''دشمن ہیں!''

''ہاں، انہیں لوگوں نے ہماری مسجد کو شہید کیا ہے۔''

''کیا یہ لوگ بھی وہاں گئے تھے؟''

''پتہ نہیں مگر ان کے آدمی تو گئے ہی تھے۔ اب ہرگز ان لوگوں سے کسی طرح کا میل جول نہیں رکھنا، ہم نے تو بنٹی کا دیا ہوا کھلونا بھی توڑ دیا۔''

''کیا؟'' اس کی نگاہیں شوکیس کی طرف دوڑ گئیں۔

کھلونے کی جگہ خالی تھی۔

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''ہاں بیٹے! ہم نے اسے توڑ کر پھینک دیا۔ دشمن کی چیزوں کا ہمارے گھر میں کیا کام! مگر تم فکر مت کرو۔ ہم اس سے بھی بہتر کھلونا لاکر تمہیں دیں گے۔ تم چاہو گے تو ہم آج ہی دوسرا کھلونا لا دیں گے۔''

عزیز الدین نے کیا کہا، اظہر الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ اس کا ذہن تو شوکیس کے اس خانے میں اٹکا ہوا تھا جہاں ایک خوبصورت سا کھلونا رہا کرتا تھا۔ ایک ایسا کھلونا جس میں تاج محل کے پتھروں جیسی چمک تھی اور اجنتا ایلورا کی مورتیوں جیسا نقشہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس میں اس کے دوست کا پیار پوشیدہ تھا، اس دوست کا جس نے اس تحفے کو خریدنے میں اپنے گلک کے سارے پیسے لٹا دیے تھے اور جس کے لیے اس نے اپنے دوست سے وعدہ کیا تھا کہ وہ دوستی کی اس نشانی کو ہمیشہ سنبھال کر رکھے گا مگر شوکیس کا خانہ خالی تھا۔ نشانی کے ساتھ اس کا وعدہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔

خالی خانے کے خلا نے اس پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا دل سینے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔

وہ کھیلنے نہیں گیا، کچھ کھایا پیا بھی نہیں، چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔

اداس نظریں آنکھوں سے نکل کر درودیوار میں پناہ ڈھونڈنے لگیں۔ درودیوار جائے امان بننے کے بجائے اس کی مزید پریشانی کے باعث بن گئے۔

دیواروں پر عجیب عجیب طرح کے ہیولے بننے لگے۔ ان ہیولوں کے دانت پنجے اور ناخن اسے اور خوفزدہ کرنے لگے۔ اس نے اپنی نظریں دیوار سے ہٹا کر چھت کے ایک کونے میں بنے مکڑی کے جالے پر مرکوز کردیں۔ مکڑی اپنے اندر سے تار کھینچنے اور اس تار سے ایک تاج محل تعمیر کرنے میں مصروف تھی۔ اپنے اندرون سے کھینچے گئے تار اور ان تاروں سے بُنے گئے تانے بانے اور ان سے ابھارے گئے بے شمار ننھے منے روشن خوبصورت جالے واقعی تاج محل جیسا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ مگر یہ منظر آناً فاناً میں مٹ گیا۔ اچانک کہیں سے ایک چھپکلی نکلی اور نشانہ سادھ کر مکڑی پر جھپٹ پڑی اور خالق کے ساتھ تخلیق کے تانے بانے بھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے۔

اظہر الدین نے میز سے پیپر ویٹ اٹھا کر چھپکلی کے اوپر دے مارا مگر اس سے قبل کہ اظہر الدین کا غصہ اور عتاب اس پر نازل ہوتا چھپکلی اپنا کام تمام کر کے نکل بھاگی تھی۔

ڈیڈی آپ کو پتا ہے اظہر کے گھر والوں نے میرا وہ گفٹ توڑ پھوڑ کر پھینک دیا جسے میں نے اس کے برتھ ڈے پر Present کیا تھا۔

''ہاں مجھے پتا ہے۔ ان لوگوں سے ہوشیار رہنا وہ بڑے بے وفا ہوتے ہیں اور خطرناک بھی۔ آج تحفہ توڑا ہے کل کچھ اور بھی توڑ سکتے ہیں ان کا کیا بھروسا۔''

''مگر ڈیڈی انھوں نے ایسا کیوں کیا؟''

''مجھے کیا پتا کہ کیوں کیا؟''

''مگر مجھے پتا ہے۔''

''تمہیں پتا ہے۔''

''ہاں''

''کیوں توڑا؟''

''اس لیے کہ ہم نے ان کی مسجد توڑ دی۔''

''اسے تو ٹوٹنا ہی تھا۔''

کیوں ڈیڈی؟

''اس لیے کہ وہ......'' بنٹی کے پتا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''وہ کیا ڈیڈی؟ بتایئے نا۔''

''وہ مندر توڑ کر بنائی گئی تھی۔''

''مندر توڑ کر کیوں؟''

''یہ بڑا پرانا قصہ ہے کسی دن فرصت میں بتاؤں گا۔''

''ڈیڈی! آپ کو پتا ہے اظہر کے ممی پاپا اس کے ٹوٹنے سے کتنے دکھی ہیں۔''

''دکھی ہیں تو ہونے دو۔''

''نہیں ڈیڈی وہ میرے سب سے اچھے دوست کے ممی پاپا ہیں اور وہ مجھ سے بھی اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا کہ اظہر سے۔ ان کو میں دکھی نہیں دیکھ سکتا۔''

''کیا تم ان کے گھر گئے تھے۔''

''گھر تو نہیں گیا مگر اظہر ملا تھا۔ اس سے پوچھا بھی تھا کہ اس نے میرا تحفہ کیوں توڑ دیا۔ اسی نے ساری باتیں بتائیں۔ ڈیڈی! ان کی مسجد کے ٹوٹنے سے آپ کو کیا مل گیا؟''

''سنتوش، سکھ، ...... کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''نہیں بلکہ مجھے تو دکھ ہوا ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اس کے ٹوٹنے سے میرے دوست کے ماں باپ کو دکھ پہنچا ان کا دل ٹوٹا اور میرا دیا ہوا تحفہ بھی ٹوٹ گیا جس سے میرا دوست بھی بہت دکھی ہے۔''

''تمہارا دوست دکھی ہے تو ہوا کرے مگر یہ نہ بھولو کہ وہ ہمارے دشمن کا بیٹا ہے۔ اس سے اب کوئی رشتہ نہیں رکھنا ہے۔ آج سے تمہارا اس سے ملنا جلنا بالکل بند۔ تم نہیں جانتے وہ لوگ سانپ بن چکے ہیں کسی بھی وقت ڈس سکتے ہیں۔ اس لیے بھولے سے بھی تم اظہر کے ہاتھ کا دیا ہوا کوئی سامان مت لینا خاص طور سے کوئی کھانے پینے کی چیز۔ کیا پتہ اس میں زہر ملا ہو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، تم ان سے دور رہنا۔''

''ٹھیک ہے، آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی کروں گا۔'' بنٹی نے بڑے ہی بوجھل من سے باپ کی نصیحت قبول کی۔

اور اس دن کے بعد اس نے اظہر الدین سے ملنا جلنا واقعی چھوڑ دیا۔ اظہر نے بھی اپنے والد کی ہدایت کے مطابق بنٹی سے فاصلہ بنانا شروع کر دیا۔

دونوں کی ایک دوسرے سے بات چیت بند ہوگئی۔ اسکول میں ان کی نشستیں بھی بدل گئیں۔ ایک ساتھ کا کھیلنا کودنا بھی رک گیا۔ اس دباؤ نے ان کی زبان اور ان کے ہاتھ پاؤں پر روک ضرور لگا دی مگر ان کے احساس کو دبا نہ سکا۔

نئی نشستوں پر وہ ٹھیک سے نہیں بیٹھ سکے۔ دونوں بے آرامی محسوس کرنے لگے۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ محض ان کی نشستیں ہی نہیں بدلیں بلکہ ان کا اسکول بھی بدل گیا ہے۔

بنٹی اپنا لنچ بکس کھولتا تو اظہر کے ٹفن کے کباب پراٹھے دکھائی دینے لگتے اور اظہر جب اپنے ناشتہ دان کا ڈھکن اٹھاتا تو بنٹی کے لنچ بکس کی کچوریاں جھانکنے لگتیں۔

ایک دن اظہر کو نماز میں بھی پٹاخوں کی دھمک سنائی دینے لگی، پڑھی جانے والی سورتوں کو درمیان سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ انار پھوٹنے لگے۔ رنگ برنگ کی روشنیاں ابھرنے لگیں۔ قندیلیں جلنے لگیں قمقمے جگمگانے لگے۔

اس نے سلام پھیر کر جلدی جلدی دعا مانگی اور بالکونی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

بنٹی کا گھر چراغوں سے جگمگا رہا تھا۔ دیوالی کی آتش بازی اپنے شباب پر تھی۔ اس کی نگاہیں بنٹی کے دروازے پر بنٹی کے ساتھ پھلجھڑی پٹاخے چھوڑنے والے بچوں میں خود کو تلاش کرنے لگیں۔

ادھر بنٹی کی نگاہیں بھی بار بار اظہر الدین کے گھر کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور جیسے ہی اس نے اظہر الدین کو بالکونی میں دیکھا ہاتھوں میں آتش بازی کے سامان لیے اس کی جانب دوڑ پڑا مگر کچھ دور جانے کے بعد اس کے پیروں میں بریک لگ گئی۔ وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے پلٹ گیا۔

دونوں کے درمیان کے رشتے کا احساس تو نہیں دب سکا مگر زخمی ضرور ہو گیا۔

جب کبھی ان کا احساس آگے بڑھنا چاہتا تو ان کی آنکھوں میں رام لیلا کی لکشمن ریکھا کھنچ جاتی اور اسے لانگھتے ہی سیتا کو دبوچتا ہوا راون دکھائی دینے لگتا۔

راون نے ان کے احساسات کے ساتھ ساتھ ان کے معمولات، تفریحات اور ترجیحات کو بھی دبوچ ڈالا۔

''آج کل تم کرکٹ کھیلنے نہیں جاتے۔'' بنٹی کو اداس ملول دیکھ کر ایک دن اس کے پتا نے پوچھا۔

''نہیں'' بنٹی نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''ہماری ٹیم ٹوٹ گئی ہے۔''

''ٹیم ٹوٹ گئی ہے! میں سمجھا نہیں۔''

''ہمارے بہت سے پلیرز نے آنا بند کر دیا۔''

''پلیرز نے آنا بند کیوں کر دیا۔''

''آپ کو بھی یہ بتانا پڑے گا ڈیڈی۔''

''اوہ! سمجھا۔ تو تم لوگ اپنے لوگوں میں سے پلیرز کیوں نہیں ڈھونڈ لیتے۔''

''کوشش تو کی تھی مگر......''

''مگر کیا؟''

''اتنے پلیرز نہیں نکلے جن سے ٹیم پوری ہوتی۔''

بنٹی کا جواب سن کر اس کے پتا کسی سوچ میں ڈوب گئے اور بنٹی کی نگاہیں کرکٹ گراؤنڈ میں پہنچ گئیں۔

خالی گراؤنڈ میں جھاڑ جھنکاڑ اُگ آئے تھے۔ بیچ جانوروں کے گو، گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ کہیں پر کتے کہیں گدھے لوٹ رہے تھے۔

بنٹی کے چہرے کی اداسی اور گاڑھی ہو گئی۔

بنٹی کی یہ شام کوئی اکلوتی شام نہیں تھی۔ یہ شام اس کی زندگی میں روز ہی آتی تھی۔ روز ہی اس کا چہرہ اداسیوں سے دوچار ہوتا تھا۔ روز ہی اس کی آنکھوں میں ویرانیاں کھلتی تھیں۔ یہ شام روز بروز اسے جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے سست، مند اور کمزور بناتی جا رہی تھی۔

یہ اور بات ہے کہ اس کی یہ شام اس کے پتا کو آج پہلی بار دکھائی پڑی تھی۔

یہی حال اظہر الدین کا بھی تھا۔ اس کے والد نے اس کے کھیل کے اوقات میں اسے دینی تعلیم دینے کے لیے ایک مولوی لگادیا تھا مگر مولوی صاحب کی دینی تعلیمات اس کے اندر کے اس خلا کو پُر نہ کر سکیں جو اس کے تحفے کے ٹوٹنے سے پیدا ہوا تھا۔ کھیل کی کمی، اور اوپر سے لادی گئی تعلیم کے بوجھ نے اس کے قویٰ کمزور کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ وہ اندر ہی اندر گھلتا گیا۔ اس کے چہرے سے بھی اس کے دل کی کیفیت عیاں ہونے لگی۔ مگر عزیز الدین کو اپنے بیٹے کی یہ حالت دکھائی نہ دے سکی۔

ایک دن بنٹی گھر پہنچا تو اس کو دیکھ کر اس کے ماں باپ حیران و پریشان ہو اُٹھے۔ بنٹی کے سر پر پٹی بندھی تھی اور سفید پٹی سے جگہ جگہ خون رس رہا تھا۔

''بیٹے تمھیں یہ کیا ہوگیا؟ کس نے تمہارا یہ حال کیا؟'' بنٹی کے پتا نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

''محلّے کے لڑکوں نے۔ ان کی گیند مجھ پر آ گری تھی۔ غصّے میں میں نے اسے نالی میں پھینک دیا تھا۔ بس وہ مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ٹھیک اسی وقت اظہر کہیں سے وہاں آ گیا اور وہ ان سے بچا کر مجھے لے آیا ورنہ پتا نہیں، وہ میرا کیا حال کرتے؟''

''اور یہ مرہم پٹی کس نے کی؟''

''آنٹی نے۔''

''کس آنٹی نے؟''

''اظہر کی امّی نے۔''

''اظہر کی امّی نے!'' بنٹی کے پتا کے چہرے پر کچھ لکیریں ابھر آئیں۔

''جی ہاں، اظہر کی امّی نے وہ تو جوس بھی پلا رہی تھیں مگر مجھے آپ کا اپدیش یاد آ گیا۔ اس لیے میں نے نہیں پیا، حالانکہ اس وقت مجھے بڑے زور کی پیاس لگی تھی اور موسمی کا جوس بھی آنٹی نے تازہ تازہ نکالا تھا۔ کیوں ممی! میں نے ٹھیک کیا نا؟''

ممی کچھ نہ بول سکیں۔

دفعتاً اس کے پتا کے چہرے کی لکیریں گہری ہو گئیں اور انھوں نے زخم سے پٹی نوچ کر الگ کر دی، رکا ہوا خون پھر سے جاری ہو گیا۔

''یہ کیا کیا؟'' بنٹی کی ممی حیران ہوتی ہوئی بولیں،

''وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔ جایئے جلدی سے کوئی صاف کپڑا لایئے اور تیار ہو کر آیئے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلنا ہے۔''

بنٹی کے ماں باپ بنٹی کو لے کر اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ ڈاکٹر نے زخم کو صاف کر کے پھر سے ڈریسنگ کر دی۔

گھر سے نکلتے وقت بنٹی کے پتا پرانی پٹی اپنے ساتھ اٹھا لائے تھے، اسے ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے:

''ڈاکٹر صاحب، ذرا بتایئے اس پٹی کی دوا تو ٹھیک ہے نا؟''

ڈاکٹر پٹی کو سونگھ کر بولا۔

''دوا تو ٹھیک ہے مگر یہ سب آپ......''

''یوں ہی۔''

بنٹی کو اپنے پتا کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ اس نئی پٹی کو بھی اپنے سر سے نوچ پھینکے۔

ڈاکٹر کے پاس سے آتے وقت اس نے وہ پٹی اٹھا لی تھی جسے اظہر کی ماں نے اس کے زخم پر باندھا تھا اور جسے اس کے پتا نے نوچ کر پھینک دیا تھا۔

وہ پٹی راستے بھر اس کی آنکھوں کے آگے پھیلی رہی۔ پٹی کے ایک سرے سے اظہر کی ماں اور دوسرے سرے سے خود اس کی پتا بندھ گئے تھے۔ دونوں کو وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے اس پٹی کو اس کی محبت میں استعمال کیا تھا۔ مگر ایک کی محبت نے اس کے اندر ٹھنڈک پہنچائی تھی اور دوسرے کی محبت نے اسے تیزابی کیفیت سے دوچار کیا تھا۔

اس رات اسے نیند نہ آسکی۔ نیند نہ آنے کی وجہ چوٹ کے درد سے زیادہ ایک ماں کی ممتا اور محبت کی توہین تھی۔

بنٹی نے اپنی جیب سے پٹی نکال لی۔ اسے غور سے دیکھا۔ آہستہ آہستہ اس پر اپنی انگلیاں پھیریں پھر اس نے اس پٹی کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

آہستہ آہستہ خشک پٹی آنسوؤں سے تر ہوتی گئی۔

اچانک بنٹی کے کمرے کے نائٹ بلب کی روشنی سوواٹ کے بلب کی روشنی میں تبدیل ہوگئی۔ تیز روشنی نے بنٹی کی آنکھوں سے پٹی ہٹادی۔ پٹی ہٹی تو اس نے دیکھا کہ دروازے پر اس کے پتا کھڑے تھے۔

اس کے پتا آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھے اور قریب پہنچ کر خاموشی سے بنٹی کے ہاتھوں میں دبی اس تر پٹی کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگے۔ بنٹی نے پتا کو غور سے دیکھا تو پتا کی کی آنکھیں بھی اسے نیند سے عاری محسوس ہوئیں۔

''آئی ایم سوری بیٹے! آئی ایم اکسٹریملی سوری، مجھ سے غلطی ہوگئی۔''

''میں اظہر کی ماں سے معافی مانگ لوں گا۔'' کافی دیر تک خاموشی رہنے کے بعد بنٹی کے پتا کے لب ہلے۔

''سچ ڈیڈی۔'' مغموم بنٹی کے منہ سے یہ آواز اس طرح نکلی جیسے کسی ستار کے تار سے جھنکار نکلی ہو۔

''بالکل سچ۔''

''تو کیا میں اب اظہر سے مل سکتا ہوں؟''

''ضرور۔'' یہ آواز ان کے دل سے نکلی تھی اس لیے کہ انہیں یہ محسوس ہو چلا تھا کہ عبادت گاہوں کی دیواریں جو دلوں میں کھڑی ہیں انہیں گرایا نہیں جاسکتا۔

''تھینک یو ڈیڈی۔'' وہ بستر سے اُٹھ کر اپنے پتا سے لپٹ گیا جیسے وہ اپنے پتا سے نہیں، بلکہ اپنے دوست اظہر سے لپٹ رہا ہو۔

☆☆☆

ایک چھوٹا سا جہنم

— ساجد رشید

کسی کے چیخنے اور گولیاں چلنے کی تیز آوازیں تھیں جو چار راتوں سے متواتر جاگتے رہنے والے اعصاب کو جھنجھوڑ کر آنکھیں کھولنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ لذّت آمیز تھکن سے بھاری پلکیں بس نیم وا ہو کر رہ گئیں۔ نظر کی سیدھ میں وہ ایسے گھورنے لگا جیسے اپنے حواس مجتمع کر رہا ہو لیکن لوہے کی پُرشور کھڑکھڑاہٹ اور کسی عورت کے رونے اور گڑگڑانے کی آوازیں گاڑھے سیّال کی قطرہ قطرہ بوندوں کی طرح مضمحل اعصاب پر ٹپک رہی تھیں۔ گاڑھے سیّال کے گرنے کے بعد لاکھوں دیدہ نادیدہ بوندیں فضا میں بہت سست رفتار سے اُڑ کر پھیل رہی تھیں۔ سامنے بہت لمبی نیم تاریک راہداری میں دور کوئی سفید کپڑوں میں کھڑا تھا جس کے چہرے اور پیروں پر اندھیرا پڑ رہا تھا۔ سفید لباس والے نے وہیں سے اپنے ہاتھوں کو لمبا کر کے اس کے کندھوں کو اپنے قوی الجثہ پنجوں سے جھنجھوڑا۔ آنکھیں پٹ سے کھلیں اور یکبار رونے چیخنے اور گولیاں چلنے کا شور پانی کے تیز ریلے کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرایا......

''ڈاکٹر نائیک''...... سفید کپڑوں والی نرس اس کے کندھوں کو ہلا رہی تھی۔

''نیچے مین گیٹ پر بھیڑ اکٹھا ہے۔'' نرس کی آواز کانپ رہی تھی۔ نیچے سے کسی عورت اور آدمی کے زور زور سے جھگڑنے اور لوہے کے جنگلے کے ہلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر نائیک نے جلدی سے پیروں میں سلیپر ڈالا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اس درمیان پھر گولیاں چلنے کی آواز! سیڑھیاں اتر کر ایک لمبی راہداری سے گزر کر جب وہ مین گیٹ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اسپتال کا چوکیدار اور ایک جونیر ڈاکٹر جنگلے کے دوسری طرف کھڑی ایک عورت سے زور زور سے بحث کر رہے ہیں۔ بدحواس عورت نے ایک نوجوان کو بغل میں ہاتھ دے کر سہارا دے رکھا ہے جو کمر سے آگے کی طرف جھول رہا ہے۔ نوجوان کی قمیص خون سے سرخ ہو رہی ہے۔

''کیا بات ہے'' ڈاکٹر نائیک نے قریب پہنچ کر کہا اور اسی درمیان پھر کہیں ایک گولی چلی۔

''اس لڑکے کو پولیس کی گولی لگی ہے اور یہ عورت ......'' جونیر ڈاکٹر مڑکر ڈاکٹر نائیک سے بولا۔

''گھر میں گھس کر میرے بیٹے کو گولی مار دیا پولیس نے ڈاکٹر صاحب، ہم ادھر رحمت چال میں رہتے......''

''ادھر سب غنڈے لوگ رہتے ہیں۔'' چوکیدار بات کاٹ کر بولا'' صاحب لوٹ مار کر رہا ہوگا اسی لیے گولی......'' زخمی نوجوان کا جسم اتنا جھول گیا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ زمین کو بس چھونے والے تھے اور عورت اسے اپنی پوری طاقت سے سنبھالنے کی کوشش میں بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ ڈاکٹر نائیک کو محسوس ہوا جیسے وہ اس زخمی نوجوان کو جانتا ہے۔ ارے ہاں یہ تو شہزاد ہے شہزاد! اس نے سر کو جھٹکا جیسے کسی خیال کو جھٹک رہا ہو۔

''اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور وہ اسے اسپتال میں داخل کرانا چاہتی ہے۔ بغیر ایڈوانس کے ہم اسے کیسے ایڈمٹ کر سکتے ہیں۔'' جونیر ڈاکٹر بولا'' اور پھر یہ تو پولیس کیس......''

''شٹ اپ!'' ڈاکٹر نائیک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔''دروازہ کھولو'' اس نے چوکیدار کو ڈانٹ کر کہا۔

اگر آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ نوجوان شاید نہ بچتا۔ ڈاکٹر نائیک نے فوراً آپریشن کر کے سینے کے پنجر میں پھنسی گولی کو نکال دیا تھا۔ عورت کے پاس پیسے تو نہیں تھے لیکن اس نے اپنی خون سے تر آنچل کو پھیلا کر آسمان پر بیٹھے اپنے خدا سے زمین کے اس ہندو ڈاکٹر کے حق میں اتنی دعائیں دے ڈالی تھیں کہ اگر خدا کے فرشتے ان دعائیہ لفظوں کو ثواب میں منتقل کرتے تو اس نوجوان ڈاکٹر کے لیے جنّت کے دروازے وہ شاید اسی لمحہ کھولنے پر مجبور ہو جاتے۔ لیکن ڈاکٹر نائیک کو اس عورت کی دعاؤں سے زیادہ سکون اس تصور سے پہنچا تھا کہ ''میں نے شہزاد کو بچالیا۔''

تین روز سے فسادات میں ایسی شدت آ گئی تھی جیسے کوئی سلگتی لکڑی پر مٹی کا تیل چھڑک دے۔ ڈاکٹر نائیک چار روز سے اپنے پرائیوٹ اسپتال میں پڑا ہوا تھا، پہننے اور کھانے کا ہوش نہ تھا۔ باہر کے کرفیو نے اسپتال کی ویرانی میں وحشت پیدا کر دی تھی۔ دو روز سے شہر کا شاید ہی

کوئی گوشہ فساد سے محفوظ تھا۔ شہر کے مختلف حصوں میں جھونپڑ بستیاں جل رہی تھیں یا پھر جل کر خاکستر ہو جانے کے بعد سلگتے اپلوں کے ڈھیر کی طرح دھواں چھوڑتی دکھائی دیتی تھیں۔ ملک کے کسی بھی گوشے سے فساد کی کوئی خبر آتی تو ڈاکٹر نائیک کو اختلاج ہونے لگتا اور نظروں کے سامنے شہزاد کا چہرہ گھومنے لگتا۔ خون میں لت پت ایک عورت کی بانہوں کے سہارے گھسٹتا ہوا، پتھرائی آنکھوں سے خلا میں گھورتا ہوا شہزاد کا زرد چہرہ اس سے صرف یہی سوال کرتا کہ ''مجھے کیوں مار دیا گیا؟''

شہزاد اس کا بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے ساتھ ہی ہائی اسکول کیا تھا۔ پھر شہزاد اپنے والد کے انتقال کے بعد والدہ کے ساتھ علی گڑھ اپنے ماموں کے یہاں چلا گیا تھا اور علی گڑھ یونیورسٹی میں بی اے پارٹ ون میں داخلہ لے لیا تھا۔ دوسرے سال نائیک بھی شہزاد کے اصرار پر علی گڑھ گیا تھا جہاں اس کی ملاقات شہزاد ہی سے نہیں سیما سے بھی ہوئی تھی جو پتا نہیں کیسے اس بے ڈھنگے شہزاد کو دل دے بیٹھی تھی۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد نائیک کو شہزاد اور سیما کے خط برابر آتے رہے۔ پھر ایک دن علی گڑھ میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ چھ سات ہفتوں تک شہزاد یا سیما کسی کا خط نہیں آیا۔ فسادات کی ہولناک خبروں کے درمیان دونوں کی خاموشی نے نائیک کو بے چین کر رکھا تھا۔ ایک روز سیما کے ایک طویل خط کے ذریعے ڈاکٹر نائیک کو پتا چلا کہ یونیورسٹی کیمپس کے باہر بھری دوپہر میں سیما کی نظروں کے سامنے شہزاد کو گھیر کر بلوائیوں نے گپتی ماردی۔ خط کے الفاظ تصویر بن گئے...... سیما اسے بچانے کی کوشش کر رہی ہے اور خود بھی زخمی ہو گئی ہے۔ خون شہزاد کے پیٹ پر لگے گہرے زخم میں سے ابل کر پتلون کو بھگو چکا ہے۔ اس کی بے بس نظریں سیما کو دیکھ رہی ہیں۔ سیما اپنے زخمی ہاتھ کی پروا نہ کرتے ہوئے شہزاد کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے اٹھاتی ہے۔ عورت کا حوصلہ آدمی کی قوت بن جاتا ہے۔ شہزاد سیما کے سہارے گھسٹ رہا ہے۔ کیمپس کا صدر دروازہ اور پھر لمبی سڑک! سانس اکھڑنے لگتی ہے۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں اور سیما کی بانہوں میں شہزاد کا سر ڈھلک جاتا ہے......

ڈیوٹی نرس نے ریٹائرنگ روم میں آکر جب روشنی کی تو ڈاکٹر نائیک کو ایک کرسی کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھے جھکا ہوا پایا۔ نائیک نے سر اٹھا کر نرس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں خشک لیکن چہرہ پسینے سے تر تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ڈاکٹر'' نرس نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی وحشت کو دیکھ کر پوچھا۔

''آئی ایم آل رائٹ'' اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا اور جگ سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگا۔ نرس نے کندھے اچکائے اور چلی گئی۔ نائیک پانی پی کر کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ آسمان کے کناروں پر آگ کی لپٹوں کی سرخ روشنی فوکس کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ نیچے ٹرک کی آواز ابھری۔ دھندلی روشنی والے لیمپ پوسٹوں کے درمیان فوجی جوانوں سے بھرے ٹرک کا دھندلا سایہ ہاتھی کی طرح رینگتا ہوا گزر گیا۔

ڈاکٹر نائیک نے راؤنڈ لے کر ان تمام مریضوں کو چیک کر لیا تھا جن کی حالت تشویش ناک سمجھی جارہی تھی۔ اپنا اطمینان کر لینے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ کر اس نے گھڑی اتار کر میز پر رکھنے سے پہلے وقت دیکھا۔ رات کے سوا بارہ بج رہے تھے۔ ایزی چیئر پر نیند پوری کرنے کے ارادے سے اس نے پیروں کو سامنے رکھی تپائی پر رکھ کر اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا......

کوئی کراہ رہا تھا۔ دردناک آواز میں کسی کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ آواز گھٹی گھٹی لیکن بے پناہ کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا ''یہ...... یہ...... آواز تو شہزاد کی ہے ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا لیکن آواز شہزاد ہی کی تھی۔ وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے آ کر کرفیو کی پروا کیے بغیر اپنی کار کو ڈرائیو کرتے ہوئے قبرستان کی طرف نکل گیا۔

کچی پکی قبروں کے درمیان وہ جھک جھک کر ہر قبر کا کتبہ پڑھتے ہوئے چل رہا تھا۔ اس نے کندھے پر ایک بڑا سا بیگ ڈال رکھا تھا۔ اچانک ہی وہ ایک قبر کے سامنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا جس پر شہزاد کا نام اور اس کی تاریخ وفات درج تھی۔ اس نے بیگ زمین پر رکھا اور اس میں سے کدال نکال کر جلدی جلدی قبر کو کھودنے لگا۔ وہ پتا نہیں کب تک قبر کھودتا رہا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو چکا تھا لیکن اس کے ہاتھ بڑی سرعت سے چل رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کے سامنے گہرے گڑھے میں کفن میں لپٹی ہوئی لاش تھی۔ اس نے قبر میں اتر کر لاش کو کندھے پر لادا تو اسے اپنے کندھوں پر حرارت کا احساس ہوا۔

''لاش گرم ہے۔'' اس نے سوچا ''نہیں نہیں کفن کے اندر رکھا جسم گرم ہے۔''
لاش کو قبر کے کنارے رکھ کر اس نے بڑی بے صبری سے کفن کی گرہیں کھول ڈالیں۔ چہرے پر سے سفید کپڑا ہٹایا...... شہزاد کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ماتھے پر سلوٹیں تھیں جیسے درد کو ضبط کر رہا ہو۔ اس نے جھک کر لاش کے سینے پر سر رکھ دیا۔ دل کے دھڑ کنے کی آواز اسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اس نے جیسے ہی سر اٹھایا لاش نے ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں کھول دیں اور خود ہی کفن سے اپنے دونوں ہاتھ باہر نکال کر دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''اچھا ہوا تم آ گئے۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔'' شہزاد نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں کہا اور پھر جھک کر اپنے پیٹ کو سہلانے لگا۔ ڈاکٹر نائیک نے دیکھا کہ سینے کے نیچے بائیں طرف ایک گہرا خشک زخم تھا جس کے آس پاس کھرنڈ سی جمی ہوئی تھی۔

''اس روز جب تم سیما کے ساتھ کالج سے جا رہے تھے، تو کیا ہوا تھا شہزاد؟'' وہ سوال جو نائیک کو دس برسوں سے پریشان کیے ہوئے تھا، پوچھ بیٹھا۔

''انھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور یہ دیکھو یہاں گپتی ڈال دی تھی۔'' کہتے ہوئے وہ زخم سہلانے لگا۔ ''کیوں مارا تھا انھوں نے مجھے؟'' شہزاد نے اس کی آنکھوں میں اپنے بے نور دیدوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تمھیں نہیں معلوم؟'' نائیک نے پوچھا۔

''بتاتے تھے دنگا ہو گیا ہے اور مجھے مار دیا۔ میں تو دنگے میں شامل نہیں تھا! میں نے تو کسی کو ایک تمانچہ بھی نہیں مارا تھا پھر انھوں نے مجھے کیوں مار دیا سدھیر؟'' شہزاد نے اس کے بچپن کا نام لے کر پکارا۔

''مجھے پتا نہیں۔''

''تمھیں پتا ہے سدھیر تمھیں پتا ہے۔'' اس نے اپنی ٹھنڈی آنکھوں سے نائیک کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''میں تو بمبئی میں تھا اور تم علی گڑھ میں۔ مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے۔'' نائیک سراسیمہ ہو گیا۔

''تمھارا دوست ہونے کے باوجود بھی انھوں نے مجھے نہیں بخشا۔'' اس کی آواز سرد ہو چلی تھی۔

''لیکن وہ بمبئی سے اتنی دور مجھے کیسے جانتے......''

''وہ تمھارے دھرم کے لوگ تھے۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر بھی تم سے اپنی شناخت قائم کر کے تمھیں چھوڑ سکتے ہیں، اسی طرح جس طرح انہوں نے مجھے میرے دھرم کی وجہ سے مار دیا اور سیما کو چھوڑ دیا۔ اپنے دھرم کے لیے تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو شہزاد؟''

''پھر تم ہی بتاؤ انھوں نے مجھے کیوں مارا ہے۔''

''میں نہیں جانتا'' نائیک گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا ''میں مسلمان تھا اس لیے انھوں نے مجھے مار دیا۔ وہ ہندو تھے اس لیے انھوں نے مجھے مارا۔ سیما ہندو تھی اس لیے اسے چھوڑ دیا اور تم بھی ہندو ہو اس لیے وہ تمھیں بھی چھوڑ دیتے۔'' پھر وہ نائیک کی آنکھوں میں اترتے ہوئے بولا: ''ہم دھرم کے نام پر مارے اور بچائے جا رہے ہیں اس لیے تم بھی ان کے ساتھ مجھے مارنے کے لیے مجبور ہو جاتے......''

''نہیں......نہیں......نہیں'' وہ زور سے چیخا اور درختوں پر پرندے کریہہ آواز میں بُری طرح شور مچانے لگے۔

شور اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ ٹیوب کی روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ایک عجیب سا بے ہنگم شور سنائی دے رہا تھا جیسے کچھ لوگ زور زور سے بول رہے ہوں۔ بھاری بوٹوں کے ساتھ چل رہے ہوں۔ وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل آیا۔ سامنے سے نرس اسی کی طرف دوڑی چلی آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ وہیں سے چیخی۔ ''کوئی وی آئی پی پیشنٹ ہے ڈاکٹر نائیک، جلدی چلیے آپ کو بلا رہے ہیں۔'' کہہ کر وہ ایک دم واپس مڑ گئی۔

''کون ہے؟'' اس نے لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ کافی پولیس سیکورٹی ہے اس کے ساتھ۔'' نرس نے اسی رفتار سے چلتے ہوئے جواب دیا۔

اسٹریچر ٹرالی کے اطراف دو کالے لباس والے باڈی گارڈ چوکنی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک پختہ عمر کی عورت تھی جس کی آنکھوں کا تفکر اس مریض کا

کوئی قریبی رشتے دار بتا رہا تھا۔ چار پانچ کسرتی جسموں والے نوجوان تھے جن کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ نائیک نے اسٹریچر کو اپنے پیچھے لانے کا اشارہ کیا اور یہ سوچتا ہوا ایگزامنیشین روم کی طرف چل دیا کہ...... ''آخر یہ وی آئی پی پیشنٹ کون ہو سکتا ہے؟''

ایگزامینیشن روم میں نائیک نے سفید چادر سے جھانکتے مریض کے چہرے کو جیسے ہی دیکھا تو پتا نہیں باہر سڑک پر یا اس کے اپنے سینے میں تڑتڑ تڑ بے شمار گولیاں چلیں اور یکبارگی ہزاروں لوگوں کی دردناک کراہیں بلند ہوئیں، یہ وہی تھا...... ہاں وہی...... بالکل وہی...... تنگ پیشانی، موٹی سی ناک، خواب ناک آنکھیں، بھینچے ہوئے ہونٹ...... ایک لمحے کو اس کا دماغ شل ہو گیا۔ نفرت، کراہیت اور غصے نے اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں بکھیر دیں۔ مریض کے ساتھ آنے والے تمام لوگ اس کی بدلتی کیفیت کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ عورت نے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا، وہ مریض کی بیوی تھی۔

''شام سے پہلے نارمل تھے۔'' عورت اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے روہانسی آواز میں بولی۔

''نارمل تھے!''...... وہ چونکا۔ ''شہر جل رہا ہے اور یہ نارمل......''

''آٹھ بجے کے آس پاس انھوں نے تھوڑی سی ڈرنک لی تھی۔ پھر کھانا کھا کر ویڈیو پر فلم دیکھی تھی۔ تب بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ کومیڈی فلم تھی، خوب ہنستے رہے تھے۔''

''بارہ بجے وہ سوئے تھے۔ اور پھر ساڑھے بارہ ایک بجے کے آس پاس اچانک اٹھ بیٹھے تھے۔ سینہ میں درد کی شکایت کی اور پھر بے ہوش ہو گئے تھے۔'' عورت کی آنکھیں بھر آئیں۔

''کیا اس سے پہلے بھی اس طرح میرا مطلب ہے دل کا دورہ......'' ڈاکٹر نائیک نے بہت سنبھل کر کہا لیکن لہجے کی کرختگی کم نہ ہوئی۔

''دو سال پہلے پڑ چکا ہے۔'' عورت نے اس کے بہت قریب آکر سرگوشی کی اور پھر آس پاس کھڑے اپنے ساتھ آنے والوں کو دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے آپ اتنی رازداری......''

''ہاں وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیماری کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہو۔'' عورت نے پھر سرگوشی کی۔ ڈاکٹر نائیک نے فوراً ہی کارڈیوگرام لیا۔ بلڈ پریشر چیک کیا۔ یہ سب کچھ

کرتے ہوئے اس نے اپنے دل میں مریض کے لیے ہمدردی کا کوئی جذبہ محسوس نہیں کیا۔ مریض کو آئی سی یونٹ میں داخل کرنے کے بعد اس نے مریض کی بیوی کے علاوہ تمام لوگوں کو چلے جانے لیے کہا۔

''ہم ان کی حفاظت کے لیے ہیں۔'' ایک باڈی گارڈ نے کہا۔

''اس وقت انہیں تمہارے نہیں ہمارے تحفظ کی ضرورت ہے۔'' نائیک کی آواز سرد تھی۔

''لیکن ان کی جان کو خطرہ ہے۔''

''ان کی جان کو کسی دشمن سے نہیں ان کے اپنے دل سے خطرہ ہے، پلیز لیوہم الون۔''

یہ کہتے ہوئے نائیک نے اس عورت کو ضرور دیکھ لیا تھا جس کی آنکھیں یہ سنتے ہی خوف سے پھیل گئی تھیں۔

''او بھگوان۔'' عورت دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر سسکنے لگی۔ ''اب میں کیا کروں۔''

اس نے ایک اچٹتی نگاہ عورت پر ڈالی پھر آئی سی یو میں داخل ہو گیا۔

مریض کے دل کو اس نے کارڈیوگرام اور اسکرین مونیٹر سے منسلک کر دیا تھا۔ اب دل کی دھڑکن کارڈیوگرام اور مونیٹر اسکرین پر منعکس ہو رہی تھی۔ عورت کو اس نے آئی سی یو کے باہر لگی بینچ پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک نرس کو مریض کی کیفیت پر نظر رکھنے کے لیے مامور کر دیا تھا۔ وہ جب آئی سی یو سے باہر آیا تو اس نے دیکھا ایک بیس سال کا نوجوان اس عورت کے قریب بیٹھا اسے دلاسہ دے رہا ہے اور چار پانچ نوجوان ان کے اطراف خاموشی سے کھڑے ہیں۔ عورت نے اسے دیکھتے ہی کہا: ''یہ میرا بیٹا ہے۔''

''ماں بیٹے میں سے کوئی ایک ہی یہاں رہ سکتا ہے۔'' اس نے پیشہ وارانہ سفا کی سے کہا جو اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔

بیٹا جب اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھا تو اس کی چال نے بتا دیا تھا کہ اس کے پیر باپ کی بیماری کے صدمے سے نہیں نشے سے کپکپا رہے ہیں۔

ریٹائرنگ روم میں آکر نائیک نے تھرمس سے چائے پیالی میں انڈیلی اور چسکیاں لیتے ہوئے مریض کی بابت سوچنے لگا جس کی تصویر وہ متعدد بار اخبارات میں دیکھ چکا تھا۔ فسادات

کے دوران وہ اپنی حیثیت سے زیادہ ہی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ اس کی ایک آواز پر زندگی مفلوج ہو جاتی تھی۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ شرارے بن کر زندہ بستیوں کو خاک کر دیتے تھے۔

شہزاد کو ایسے ہی سلگتے لفظوں نے منوں مٹی کے نیچے وقت سے پہلے دبا دیا تھا...... اس خیال نے نائیک کے جسم کے ایک ایک روئیں میں سوئیاں چبھو دیں۔ یہ رات اب مریض سے کہیں زیادہ اس پر بھاری تھی۔

صبح اسپتال کے باہر اس کے معتقدوں کا ہجوم لگ گیا تھا۔ وہ اپنے محبوب رہنما کو دیکھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نائیک نے سختی سے منع کر دیا۔ صرف بیوی اور بیٹا دو ہی لوگ اسے دیکھ سکتے تھے اور اسپتال میں ٹھہرنے کی اجازت صرف اس کی بیوی کو تھی۔

دوپہر میں نائیک نے بلڈ پریشر، کارڈیوگرام اور نبض کو چیک کیا۔ حالت اب بھی خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ آئی سی یو کے نیم روشن کمرے میں اس کے سینے تک کمبل پڑا ہوا تھا۔ اس نے قریب جا کر کمبل کمر تک الٹ دیا۔ اسے جو قمیص پہنائی گئی تھی اس کے سارے بٹن کھلے رکھے گئے تھے تاکہ کارڈیوگرام اور مونیٹر کے وائر کو سینے سے جوڑا جا سکے۔ ہنسلی اور پسلیوں کی ہڈیاں مچھلی کے کانٹے کی طرح نمایاں تھیں۔ گردن سوکھی لکڑی کا ٹھونٹھ لگ رہی تھی۔ دو روز کی داڑھی کے باریک سفید بال اس کی اصل عمر بتا رہے تھے البتہ سر کے بال بالکل سیاہ تھے۔ وہ یقیناً ڈائی کیے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بہت صاف دکھائی دے رہے تھے جو موٹے فریم کی عینک میں چھپ جاتے تھے۔ نائیک نے اس کا دایاں ہاتھ چھوا۔ استخوانی پنجہ اور باریک سی کلائی پر ایک سیاہ دھاگا بندھا ہوا تھا۔

کیا یہی ہے وہ آدمی جس کے اشارے پر کسی ذبح کیے جانے والے جانور سے بھی حقیر بنا دی جاتی ہے انسانی زندگی! کیا یہی ہے وہ آدمی؟ ایسا کیا ہے اس کے جسم میں جس نے اسے اتنا سفاک بنا رکھا ہے؟ یہ منحنی جسم جسے دمہ، ڈائی بیٹس اور اتھرائٹس کے مرض نے جکڑ رکھا ہے۔ جس کی آنکھیں طاقت ور شیشوں والے چشمے کے بغیر زندگی کو حقیقی رنگ میں نہیں دیکھ سکتیں۔ جس کے ہاتھوں میں اتنی قوت بھی نہیں ہے کہ اس کے ایک تمانچے سے کسی کے گال پر ورم آ جائے ...... پھر کیا ہے اس آدمی کے اندر کہ لوگ اس کے نام ہی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں؟ ڈاکٹر نائیک کا جسم اپنے ہی خیالات اور سوالات کی حرارت سے تپنے لگا۔

اس نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ تکیے پر سر تھوڑا سا ڈھلکا ہوا تھا اور نیم وا آنکھوں سے جامد سیاہ دیدے ایک پتلی لکیر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ بالائی ہونٹ ناک میں آکسیجن کی نلکی کی وجہ سے قدرے کھلا ہوا تھا۔ جس کے پیچھے زرد دانت نمایاں تھے۔ انتہائی نفرت سے وہ سر سے پیر تک لرز گیا۔ اس آدمی کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کی موت بہت سارے لوگوں کو بے وقت موت سے محفوظ رکھ سکتی ہے اور نائیک نے اسے بیڈ پر چاروں شانے چت کر دیا۔ اس نے پھرتی سے آپریشن کرنے والی بڑی سی چھری اٹھائی اور اس منحنی سینے پر پے در پے وار کرنے لگا۔ اس کے سینے پیٹ اور نرخرے پر چھری کے ہر وار پر خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑتا۔ نائیک پوری قوت سے اس پر حملے کر رہا تھا اور چھری اس کے جسم میں ایسے گھستی جیسے وہ انسان نہیں ربڑ کا کوئی گڈا ہو۔ خون چھری کے ہر وار کے ساتھ اڑ اڑ کر نائیک کے چہرے کو داغدار کر رہا تھا اور بیڈ پر پڑے اس بے حرکت شخص کا منہ ایسے بگڑتا جا رہا تھا جیسے اس کے ربڑ کے جسم میں بھری ہوا خارج ہو رہی ہو اور وہ گیس کے غبارے کی طرح پچکتا جا رہا ہو......

اپنے ہی خیالات سے گھبرا کر نائیک آئی سی یو سے باہر نکل آیا۔ ریٹائرنگ روم میں جا کر وہ ایزی چیئر پر گر پڑا ''نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ ہمارے پیشے میں بیڈ پر پڑا کوئی بھی مریض ہماری پناہ میں ہوتا ہے تو پھر میں...... میں کسی کی جان کیسے لے سکتا ہوں۔ آخر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کسی کی جان لینے کا......'' اس کی پیشانی اور ہتھیلیاں پسینے سے سرد ہو گئیں۔

''لیکن اسے بھی تو کسی کی جان لینے کا حق نہیں ہے۔'' شہزاد نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بیانات اس کی تقریریں اب تک سینکڑوں لوگوں کی جانیں لے چکی ہیں۔''

''یہ بیماری ہی تو اس کی سزا ہے۔ اس کا جسم جس اذیت میں مبتلا ہے یہی تو قدرت کا انصاف ہے۔'' نائیک نے کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو بے ہوش ہے۔ اس کے احساسات نیم خوابیدہ ہیں۔ میڈیکل سائنس کے آلات بھی اس کی اذیت کی پیمائش نہیں کر سکتے ہیں اور اس کے جسم اور دماغ کو اس اذیت کا پتا اس وقت تک نہیں چلے گا جب تک وہ ہوش میں نہیں آ جاتا۔ وہ ہوش میں تب ہی آئے گا جب

اس کی اذیت کم ہو جائے گی۔ اس وقت اسے نہ تو اس اذیت کا کچھ پتا ہے اور نہ ہی اس کرب کا کوئی احساس ہے جو اس کا جسم جھیل رہا ہے۔'' شہزاد کی آواز ایسے سرسرا رہی تھی جیسے جھاڑیوں میں سانپ کے گھسنے پر آواز ہوتی ہے۔

''ایک اچھا موقع ہے سدھیر تیرے پاس...... اٹھ بڑھ اور ختم کر دے۔ ختم کر دے...... ختم کر دے!'' اسے لگا جیسے شہزاد اس کے کان میں زور زور سے چیخ رہا ہے۔

ڈاکٹر نائیک اچانک ایسے اٹھ کھڑا ہوا جیسے اس نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ دونوں ہاتھوں کو پتلون کی جیب میں ڈال کر وہ تیزی سے آئی سی یو کی طرف چل پڑا۔ اسے لگا جیسے پیچھے شہزاد اسے کھڑا گھور رہا ہے۔ برآمدے کا موڑ کاٹ کر وہ جیسے ہی آئی سی یو کے دروازے پر پہنچا سسکیوں کی آواز نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ آئی سی یو کے باہر پڑے صوفے پر مریض کی بیوی گھٹنوں میں سر دیے سسک رہی تھی۔ نائیک کے قدموں کی آواز سن کر عورت نے سر اٹھا کر اسے ڈبڈبائی سرخ آنکھوں سے دیکھا اور خود پر قابو کرنے کی کوشش میں اس کا نچلا ہونٹ لرزنے لگا۔

''وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا ڈاکٹر؟'' عورت تقریباً رو پڑی۔ ''میرا بیٹا ابھی نا سمجھ ہے۔ بھگوان نہ کرے انہیں کچھ ہو گیا تو......'' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

سفید بستر پر اس کا وہ منحنی لاغر جسم پڑا ہوا تھا جس کے تحفظ کے لیے حکومت کے مہیا کردہ دو مسلح باڈی گارڈ اور اس کے اپنے معتقدوں کا ایک ٹولہ ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔ داڑھی کے بال دو روز میں اور بڑھ آئے تھے۔ نائیک مریض کے قریب جا کر اس کے چہرے پر جھکا ہی تھا کہ مریض نے نقاہت سے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں اور نائیک کے اندر چھپا ہوا نفرت کا سارا طوفان اس کے بدن میں کپکپی پیدا کر گیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟'' نائیک نے دھیرے سے پوچھا۔ مریض نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو کھولا لیکن 36 گھنٹوں کی غشی نے بولنے کی طاقت کو متاثر کیا تھا۔ ہونٹ ہل کر رہ گئے لیکن نائیک کو اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک صاف نظر آئی۔ مریض اب آنکھوں کے ڈھیلوں کو گھما کر بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے نائیک ہی سے ڈر لگ رہا ہو۔ ہمیشہ شناسا چہروں اور اپنے معتبر لوگوں میں رہنے کی عادت نے اسے ایک اجنبی ڈاکٹر کے وجود سے ڈرا دیا تھا۔ نیم روشنی میں صرف مشینیں تھیں اور ایر کنڈیشن کی ہلکی ہلکی آواز تھی۔

مریض کے ہونٹ پھر ہلے اور اس میں سے کچھ الفاظ نکلے بھی لیکن آواز اتنی مدہم تھی کہ وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ مریض کے چہرے کے قریب اپنے کان لے آیا۔

''میرا بیٹا۔ میری بیوی۔'' پھنسی پھنسی آواز میں مریض نے پوچھا۔

''سب ہیں۔'' نائیک سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے مسکرایا۔

''کہاں ہیں؟'' آواز بہت دھیمی تھی لیکن ہونٹوں کی جنبش سے اس نے مفہوم سمجھ لیا۔ مریض کی آنکھیں اس کا جواب سننے کے لیے پارے کی طرح ابل رہی تھیں۔ اس کی بے صبری اپنی بیوی اور بیٹے سے ملنے کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ فسادات میں ان کے محفوظ ہونے کا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نائیک کی خاموشی اس کی بے چینی میں اضافہ کرتی جا رہی تھی۔ مریض کے گال کا پتلا سا گوشت پھڑکنے لگا اور اس کے ہونٹوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ پا رہا ہو۔ بستر پر پڑا اس کا دایاں سوکھا سا ہاتھ لرزنے لگا جیسے وہ چادر کو پکڑ کر اٹھنا چاہتا ہو۔ اس کے ہونٹ پھر ہلے اور ڈاکٹر نائیک کی نظر دل کی رفتار دکھانے والے مونیٹر پر پڑی۔ روشنی کا سبز سیّال نقطہ نارمل کے گراف سے کچھ اوپر چل رہا تھا۔ مریض کے اضطراب کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خدا ہو اور اس کی اپنی مٹھی میں ایک چھوٹا سا جہنم ہو جسے وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق استعمال کر سکتا ہو۔ مریض کی آنکھیں بے یقینی، خوف اور بے چارگی سے پھٹی ہوئی تھیں۔

نائیک نے مریض کی آنکھوں میں غور سے دیکھا جیسے آنکھوں سے دماغ کی کیفیت کو سمجھنا چاہتا ہو۔ مریض کی آنکھوں میں ایسی ہی بے چینی تھی جیسے وہ کسی غیر یقینی صورت حال کو نائیک کی آنکھوں میں پڑھنا چاہتا ہو۔ اس کی ہراساں آنکھوں میں پھر وہی سوال تھا: ''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

نائیک پلکیں جھپکائے بغیر اس کے چہرے پر جھک گیا اور اپنے ہونٹوں کو سختی سے ایسے بھینچ لیا جیسے وہ ایک لفظ بھی اپنی زبان سے ادا نہ کرنا چاہتا ہو۔

''تم...... کچھ...... بولتے کیوں نہیں۔'' مریض کی نحیف آواز کانپنے لگی۔

نائیک کی سفاک خاموشی مریض کے دل میں سوئیوں کی طرح چبھنے لگی۔ میں یہاں پڑا ہوں اور وہ سب پتا نہیں کس حال میں ہوں گے؟ محافظ کتوں کو ختم کر کے مکان کی چار دیواری کو پھاند کر کوئی بھی اندر داخل ہو سکتا ہے۔ پہرے دار اور سیکورٹی والے اس خون خرابے میں

کہیں اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کے لیے نہ چلے گئے ہوں...... پھر میرے گھر اور میرے بیوی بچوں کی حفاظت کون کر رہا ہوگا؟ ...... مریض کی آنکھیں خوف اور اندیشوں سے نم ہو گئیں۔ مونیٹر کے اسکرین پر سبز سیّال نقطہ مریض کے دل کی طرح ایک بار پھر مضطرب ہو گیا۔

''تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ٹیک ریسٹ۔'' ڈاکٹر نائیک نے جھک کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ ڈاکٹر نائیک خود کار دروازہ کھول کر اسے آئی سی یو کے سرد کمرے کی سفّاک خاموشی کے سپرد کر کے باہر نکل آیا اور وہ خوف اور بے چارگی سے بند دروازے کو ایسے تکنے لگا جیسے اسے کسی کی آمد کا اندیشہ ہو!

☆☆☆

پورٹریٹ سے باہر کا ایک منظر

— طارق چھتاری

آج وہ اس پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا کر تصویر بنائے گا۔ وہ برسوں سے بھٹک رہا ہے۔ کبھی نالندہ کے کھنڈروں میں اور کبھی بودھوں کے پرانے مندر کے اردگرد۔ اس نے راج گیر کے برہما کنڈ میں اشنان کرتی دوشیزاؤں کی تصویریں بنائی ہیں تو کبھی کشمیر کی پہاڑیوں سے گرتے جھرنوں کی۔ اس کا برش اجنتا کی خوبصورت وادیوں سے بھی آشنا ہے اور وہ ایلورا کی پتھریلی زندگیوں میں بھی رنگ بھر چکا ہے۔

اس نے تھیلے میں سامان رکھا۔ ڈرائنگ بورڈ ہاتھ میں لیا اور گھر سے نکل کر پہاڑ کی چوٹی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ چوٹی پر جمی برف کو دیکھنے بہت سے لوگ اوپر چڑھ رہے ہیں۔ راستے میں جگہ جگہ پکوڑوں کے خوانچے اور چائے کی دکانیں ہیں۔ اوپر ایک چھوٹا سا میلہ لگتا ہے، جہاں چیزیں بہت مہنگی ملتی ہیں لیکن لوگ سستی چیزیں زیادہ داموں میں خرید کر خوش ہوتے ہیں۔

اب وہ چوٹی پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جہاں لوگ اپنا اپنا قیمتی سامان بیچ رہے ہیں، اس سے ذرا پہلے ایک بوڑھا فقیر پرانا اوورکوٹ پہنے، جو جگہ جگہ سے پھٹ کر گدڑی کی شکل اختیار کر چکا ہے، ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔

''بابو کچھ دیتا جا۔''

فقیر ہر ایک سے سوال کر رہا ہے مگر لوگ اس کو دیکھے بغیر ہی برابر سے گزر جاتے ہیں اور وہ ان کے چہروں کو اس طرح تکتا ہے، جیسے کہنا چاہتا ہو:

''بابو...... اے بابو ادھر دیکھ تو لے......''

اس نے اپنی جیب کو ٹٹولا حالانکہ اسے یقین تھا کہ جیب خالی تھی۔ یہ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں لیکن آج اس فقیر کو کچھ دینے کی خواہش دل میں رہ رہ کر اٹھ رہی تھی۔

لمبی داڑھی اور سفید گھنی بھنویں ...... لمبی لمبی انگلیاں اور ان پر ابھری نیلی نسیں ...... یہ کتنی آرٹسٹک لگ رہی ہیں۔ آرٹسٹک! نہیں ...... مجھے یہ نہیں سوچنا چاہیے۔ آخر کتنی مصیبتیں جھیلی ہوں گی اور کتنے فاقے کیے ہوں گے اس بوڑھے فقیر نے، تب اس کی یہ حالت یعنی اتنی آرٹسٹک حالت بنی ہوگی۔ کاش اسے کچھ دے سکتا۔ جن کی جیب میں بہت کچھ ہے وہی کون سا دے رہے ہیں۔ پھر یہ درد میرے ہی دل میں کیوں۔ میری جیب خالی ہے شاید اس لیے۔

وہ بازار سے گزرتے ہوئے اکثر سوچتا کہ جب اس کی جیب میں پیسے ہوں گے تو یہ ڈرائنگ بورڈ خریدے گا۔ وہ گھنے بالوں والا برش بھی لے گا۔ اب اس کے سینڈل بھی پرانے ہو گئے ہیں اور یہ پینٹ کا کپڑا کتنا خوبصورت ہے۔ لیکن جب کوئی پینٹنگ بکتی اور جیب بھری ہوتی تو پرانے ڈرائنگ بورڈ اور گھسے ہوئے برش سے ہی کام چل جاتا۔ 'سینڈل اور یہ پینٹ' سب تو ٹھیک ہے۔ ابھی۔' وہ دل میں کہتا اور سینہ چوڑا کیے دکانوں کی طرف بغیر دیکھے ہی بازار سے گزر جاتا۔

تو کیا آج بوڑھے فقیر کو کچھ دینے کی خواہش بھی ......؟ نہیں......؟ اس کے دل میں چبھن سی ہوئی شاید کوئی وار ہوا تھا۔ اس کے قدم اچانک رک گئے اور وہ بوڑھے فقیر کے سامنے سڑک کے اس پار ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

یہ تو کچھ اچھے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ اس فقیر کو ضرور دیں گے۔

ان کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کی معصوم سی لڑکی بھی تھی۔

کسی انگریزی اسکول کی اسٹوڈنٹ معلوم ہوتی ہے۔ کتنا درد ہے اس کی آنکھوں میں اور کتنے غور سے بوڑھے فقیر کو دیکھ رہی ہے۔ ہاں ہاں دیکھو وہ فقیر کے قریب سے گزرنا چاہتی ہے۔ ضرور کچھ دے گی۔ لیکن جب وہ اس کے قریب سے گزری تو ناک پر رومال رکھتے ہوئے کانونٹین اسٹائل میں بولی:

''اف ڈیڈی'' انڈیا سے بھک منگے کب ختم ہوں گے—''

ڈیڈی نے فقیر پر حقارت بھری نظر ڈالی اور کہا: ''چلو بیٹی یہ سب ڈھونگی ہوتے ہیں۔'' فقیر کی داڑھی اور مونچھوں میں چھپے ہوئے ہونٹوں میں جنبش ہوئی، شاید بوڑھے نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔

اس نے بورڈ پر ڈرائنگ شیٹ لگائی اور ایک کٹوری میں بوتل سے پانی نکال کر برش صاف کرنے لگا۔ پھر اس پوری شیٹ کو نیلا رنگ دیا۔ ''میں نے شیٹ کو نیلا کیوں رنگا؟'' وہ سوچنے لگا۔ کیا اس لیے کہ نیلا رنگ آسمان کی وسعت اور سمندر کی گہرائی کی علامت ہے؟ نہیں — تو پھر؟ زہر......

اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے فقیر کی جانب دیکھا تو لگا کہ بوڑھے کا چہرہ نیلا پڑ چکا ہے۔ شیٹ پر نیلا رنگ کچھ خشک ہوا تو اس نے سب سے پہلے بوڑھے فقیر کے چہرے میں دھنسی آنکھیں بنائیں۔

'کتنی گہرائی ہے ان آنکھوں میں'

اس نے فقیر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو کتنے ہی مفکر، فلسفی اور دانش ور نظر آئے جو اس کی گہری آنکھوں کی تہہ میں کچھ تلاش کر رہے تھے۔

آنکھوں سے سب کچھ کھرچا جا چکا ہے اور اب وہ دھندلی ہوگئی ہیں۔

بوڑھی پیشانی پر ابھری بے جان شکنیں کسی بلندی پر لے جانے والی سیڑھیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

'سیکڑوں آرٹسٹ ان سیڑھیوں پر بیٹھے تصویریں بنا رہے ہیں اور زمانہ ان کے فن پر داد لٹا رہا ہے۔'...... ''بابو کچھ دیتا جا—'' فقیر نے جاتے ہوئے ایک شخص کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑھے ہوئے موٹے ناخنوں میں بھرا میل، سفید رونگٹے، ابھری ہوئی نیلی نسیں اور چھپکلی کے پیٹ کی طرح ہتھیلی کی زرد کھال۔ محسوس ہوا کہ فقیر کے دونوں ہاتھ کسی خوبصورت سفید شاہی عمارت کے نقش و نگار بنانے میں مصروف ہیں۔ ''کتنی کاریگری ہے ان بوڑھے اور لاغر ہاتھوں میں۔''

اسے لگا بوڑھے فقیر کے دونوں ہاتھ کاٹ لیے جائیں گے۔

''نہیں—''

اور اس نے جلدی سے بوڑھے کے دونوں ہاتھوں کو مٹیالے رنگ سے ڈرائنگ شیٹ پر بنا دیا۔ 'چہرہ مکمل ہونے بھی نہ پایا کہ ہاتھ بنا بیٹھا۔'

احساس ہوا کہ وہ بوڑھے فقیر کی تصویر بڑی بے ترتیبی سے بنا رہا ہے۔ بوڑھے کی گردن میں اودے رنگ کے پتھروں کی مالا پڑی تھی۔ اس کا برش اودے رنگ میں سن چکا ہے

مگر اب پتھر اپنا رنگ بدل رہے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا۔ پتھر پھول بنتے جا رہے ہیں اور کوئی شخص پھولوں سے لدا بوڑھے کے نزدیک کھڑا ہے اور بار بار بوڑھے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مجمع پھولوں سے لدے شخص کی جے جے کار بولتا ہے اور جب لوگ اسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیتے ہیں تو وہ شخص اس بوڑھے فقیر کی جانب ایک نظر بھی نہیں ڈالتا۔ اس کا گدڑی نما اوور کوٹ عین ناف کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا۔ کھال سوکھ کر چمڑا ہو گئی تھی اور پیٹ کنویں کی طرح اندر دھنس گیا تھا۔ اس نے سوچا، دھنسے ہوئے کنویں کو رنگوں سے اٹا دے مگر لگا کہ اگر رنگوں کے گودام بھی خالی ہو جائیں تو بھی یہ کنواں نہیں اٹ سکتا۔

''بابو کچھ دیتا جا—''

تصویر بناتے بناتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اپنی ہی آواز گونجی۔ پیسہ...... پیسہ...... ایک پیسہ......

اسے یاد آیا بچپن میں جب وہ آنکھیں میچ کر پیسے مانگنے والا کھیل کھیلتا تو ہمیشہ کوئی بچہ اس کے ہاتھ پر تھوک دیتا۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے فقیر کے پاس سے کوئی بچہ گزر رہا ہے۔ نہ جانے کیوں لگا کہ بچہ ضرور بوڑھے کے ہاتھ پر تھوک دے گا۔ دل دھڑکنے لگا اور رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ 'خون...... سرخ...... خون' اب اس نے شیٹ پر چاروں طرف سرخ رنگ پوت دیا تھا۔ رنگ کچھ اس طرح بکھرا کہ شیٹ پر بے شمار لال جھنڈے لہراتے نظر آئے۔ اسے لگا کہ بوڑھے فقیر کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھا۔ بوڑھے لاغر اور بے بس فقیر کی تصویر سرخ رنگ کے دائرے میں کچھ سہم سی گئی تھی۔ آرٹسٹ کی رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار دھیمی پڑ گئی اور اب اس کے برش کا سرخ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ بوڑھے نے پیچھے ہٹ کر درخت کے تنے سے کمر ٹکالی۔ درخت پر پھل لٹک رہے تھے۔ اس نے ڈرائنگ شیٹ پر درخت بنایا اور پھلوں کی جگہ بے شمار سکے لٹکا دیے۔ ایک سکہ درخت سے ٹوٹا لیکن جب وہ بوڑھے کے پاس آ کر زمین پر گرا تو سکہ نہیں کسی پرندے کا کترا ہوا کچا پھل تھا۔

اب تصویر مکمل ہو چکی تھی—

''کتنی خوبصورت پورٹریٹ ہے۔'' کسی نے کہا۔

''جی ہاں آرٹسٹ نے Colour Combination پر بہت زور دیا ہے۔'' دوسرا بولا۔

''یہ آپ کے نئے بنگلے کے ڈرائنگ روم میں......''

''ہاں ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ مگر آئل پینٹنگ ہوتی تو زیادہ اچھا تھا۔''

''لیکن صاحب آئیڈیا دیکھیے ۔ وہ دیکھیے وہاں سے کچھ نیچے آ کر پیڑ سے ٹوٹا ہوا سکہ کسی پھل کی سی شکل اختیار کرنے لگا ہے اور زمین پر آتے آتے ......''

''ہاں بھئی پینٹنگ تو بہت اچھی ہے۔ کتنے کی ہے یہ پورٹریٹ؟''

'' کتنے بتاؤں ...... جو مانگوں گا وہی ملے گا آج تو ــــ ''

وہ ذہن میں جو دام مقرر کرتا وہ کبھی زیادہ لگتے کبھی کم ــــ دونوں شخص سامنے کھڑے اس کے جواب کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک اس نے کچھ کہا۔ کیا کہا؟ یہ وہ خود نہیں سن سکا لیکن جب سامنے والے شخص نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے اس کی بتائی ہوئی رقم دہرائی تو اس نے سوچا۔

''ایں یہ کیا! میں نے صرف اتنے ہی مانگے! اس سے زیادہ میں سوچ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ خیر اتنے ہی کافی ہیں۔ یہ سب پیسے بوڑھے فقیر کو دے دوں گا۔ اسے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑے گا۔ ان پیسوں سے وہ کوئی چھوٹا موٹا دھندا کر سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو پتھر کی مورتیاں اور موتیوں کی مالائیں بیچنے لگے گا۔''

''یہ لو، اس سے زیادہ نہیں ــــ ابھی تو فریم بھی بنوانا ہے۔''

''نہیں صاحب اس سے کم نہیں ــــ '' اس نے کہنا چاہا مگر منہ سے کچھ نہ نکلا اور چپ چاپ دی ہوئی رقم ہاتھ میں تھامے کھڑا ہو گیا۔

''کتنا خوش ہو گا بوڑھا فقیر ــــ اتنی بڑی خوشی زندگی میں پہلی بار ملے گی۔''

جب وہ بوڑھے کے پاس پہنچا تو اس نے ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔

''بابو کچھ دیتا جا ــــ کچھ دیتا جا بابو ــــ ''

چاہا کہ جھک کر اس کے ہاتھ پر سارے روپے رکھ دے مگر اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ قریب سے گزر رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ روک لیا۔

''کیا سوچیں گے یہ لوگ۔ سمجھیں گے میں کوئی پاگل ہوں۔''

وہ وہیں کھڑا لوگوں کے گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

میں یہاں کھڑا ہوں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ میں اس طرح کیوں کھڑا ہوں شاید وہ سوچ رہے ہوں گے۔

وہ دو چار قدم ٹہلتا ہوا آگے بڑھا اور پھر پیچھے لوٹ آیا۔ بوڑھا حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا، بوڑھا حیرت زدہ ہے۔ شاید میں نے فقیر کے ہاتھ پر نوٹوں کی موٹی گڈی رکھ دی ہے، اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور فقیر کی طرف دیکھا۔ فقیر بھی مسکرا رہا تھا گویا وہ فقیر نہ ہو قد آدم آئینہ ہو۔

آئینے میں کسی احمق کا چہرہ دکھائی دیا۔

فقیر پھر مسکرا رہا ہے، دل ہی دل میں ہنس رہا ہے گویا سوچ رہا ہو کہ عجب سرپھرا شخص ہے۔

اب آرٹسٹ کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ بوڑھے نے کھنکارا تو اسے لگا کہ بوڑھا فقیر قہقہہ مار کر ہنس پڑا ہے۔

''بابو کچھ دیتا جا۔''

فقیر نے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ خالی تھا۔ آرٹسٹ نے اپنے ہاتھ پر نظر ڈالی۔ اس کے اپنے ہاتھ میں نوٹوں کی موٹی گڈی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ بوڑھے نے اس کی ذہنی حالت پر ترس کھا کر پیسے لوٹا دیے ہیں۔ پل بھر کے لیے لگا کہ وہ خود فقیر کی جگہ بیٹھا بھیک مانگ رہا ہے۔ ہاتھ خود بخود پیٹ پر پہنچ گیا۔

''بھوک لگ رہی ہے۔''

بھوک تو اس وقت بھی لگ رہی تھی جب وہ گھر سے نکلا تھا۔

''پہلے چل کر کھالیا جائے۔'' اس نے سوچا اور سامنے چائے کے ہوٹل میں گھس گیا۔ ہوٹل کا بل چکانے کے بعد باقی روپیوں کو ہاتھ میں تھامے ٹہلتا ہوا پھر بوڑھے فقیر کے قریب آن پہنچا۔ فقیر نے کنکھیوں سے دیکھا اور تار تار اوورکوٹ کی جیب کو گھٹنوں میں دبا کر محفوظ کر لیا۔

کمبخت سوچ رہا ہے میں کچھ چھین کر بھاگ جاؤں گا۔

اس نے نفرت سے فقیر کی طرف دیکھا۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا اور بہت سارے چاندی کے سکے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ پولیس والوں نے تلاشی لی تو گدڑی میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکلنے لگیں۔ اخبار والوں نے فوٹو کھینچے۔ پلیٹ فارم پر بھیک مانگتا تھا۔ نحیف و نزار فقیر۔ اس بوڑھے سے بھی بدتر حالت تھی اس کی۔

اب آرٹسٹ کے ہاتھ میں چند روپے تھے۔ باقی روپے ڈرائنگ شیٹ اور رنگ خریدنے کے لیے جیب میں رکھ لیے تھے اور گھوم کر فقیر کے پیچھے آ گیا تھا۔ بوڑھا پہلو بدلنے لگا اور بیساکھی بھی کھسکا کر قریب کر لی۔

'نہ جانے کیا سمجھ رہا ہے۔ مگر مجھے اس سے کیا غرض۔ مجھے تو اس کی مدد کرنی ہے۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو پورے پیسے ہی دے دیتا۔ خیر اتنے بھی اس کے لیے کافی ہیں۔'

بوڑھا کھانسا تو لگا کہ بوڑھا پھر زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑا ہے۔ اس کا وہ ہاتھ جس میں روپے تھے لرز گیا۔ یاد آیا کہ جب اس نے دو دن سے کھانا نہیں کھایا تھا اور اپنے ایک امیر دوست سے کچھ پیسے ادھار مانگنے گیا تھا تو کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔ کئی بار مانگنے کی کوشش کی مگر کوئی سہارا ہی نہیں مل پایا کہ کس طرح بات شروع کرے۔ کسی امیر سے کچھ مانگنا کتنا مشکل ہے۔ کیسی عجیب کیفیت تھی وہ— مگر آج کسی غریب کو اتنے روپے دینا، ٹوٹے سینڈل اور پھٹی پتلون پہن کر اتنے روپے دینا اس مانگنے سے کہیں زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر فقیر کو پیسے دینے کی کوشش کی مگر لگا کہ اس کے چاروں طرف بھیڑ جمع ہے اور وہ سر پر راجا ہریش چندر کا مکٹ باندھے اسٹیج پر کھڑا کوئی کرتب دکھا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے کشتی لڑ رہا تھا کہ اسے اڈی پہلوان یاد آ گیا۔ اڈی پہلوان نے اس رکشے والے کو جس سے ایک لالہ چند پیسوں پر جھگڑا کر رہا تھا کس شان سے ایک بڑا نوٹ دیا تھا۔ ''کیوں جھگڑ رہا ہے بے۔ یہ لے۔ یہ عزت دار لوگ کیا دیں گے۔ انہیں تو غریبوں کو دیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بے عزتی ہوتی ہے ان کی۔ دینے کے لیے اڈی کا دل چاہئے۔'' سچ ہی کہا تھا اڈی نے۔ دینے کے لیے اڈی کا دل چاہئے۔ علاقے کے بدمعاش اڈی کا۔''

اڈی پہلوان نے راجا ہریش چندر کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا۔ چاروں خانے چت۔ اس نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے سے کچھ لوگ آ رہے تھے۔

''ارے یہ تو وہی لڑکی ہے۔''

لڑکی نے اسے فقیر کے قریب کھڑا دیکھا تو مسکرا دی۔

''یہ کیوں مسکرا رہی ہے۔ کیا اسے معلوم ہے کہ میں فقیر کو اتنے پیسے ...... کیا میں شکل سے احمق معلوم ہوتا ہوں؟'' آرٹسٹ نے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے کی کوشش کی، پھر بھنویں سکوڑیں اور بولا:

''نہ جانے انڈیا سے یہ بھک منگے کب ختم ہوں گے۔''

اب اس کانوینٹین لڑکی کے رومال کی خوشبو آرٹسٹ کے جسم میں اتر گئی تھی۔ اس نے اپنی مٹھی کے سارے نوٹ جیب میں رکھے اور ایک سکہ نکال کر بوڑھے فقیر کے ہاتھ پر اس طرح ڈال دیا جیسے سکہ نہ ڈالا ہو بلکہ تھوک دیا ہو۔ فقیر کا ہاتھ سکے کے بوجھ سے کپکپانے لگا۔

''بابو تیرا بھلا ہو۔''

اس نے دیکھا کہ لڑکی کے ڈیڈی بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ وہ اس طرح چونکا جیسے ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے اور بول پڑا:

''صاحب یہ لوگ کیسا ڈھونگ رچائے رہتے ہیں۔''

اور یہ کہتا ہوا تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑکر دیکھا۔ وہ دونوں شخص جنہوں نے اس کی پورٹریٹ خریدی تھی، بوڑھے فقیر کے وجود سے بے خبر، ہنستے ہوئے اس کے سامنے سے گزر رہے تھے اور بوڑھا ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا تھا۔

''بابو کچھ دیتا جا—''

☆☆☆

ہمارا تمھارا خدا بادشاہ

—ابن کنول

پورے شہر میں خوف و ہراس برسات کے بادلوں کی طرح چھا گیا تھا، ہر شخص حیران و پریشان تھا کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس آسمانی عذاب کا سبب کیا ہے؟ کیوں ہر روز ایک شخص کی زندگی جہنم ہو جاتی ہے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک روز جب آفتاب کی روشنی عالم آب وگل کو منور کر چکی تھی، بازار اور دکانیں معمول کے مطابق پر رونق ہونے لگی تھیں کہ فضا میں ایک عقاب تیز رفتار پرواز کرتا ہوا نظر آیا۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس کے پنجوں میں ایک مارِ سیاہ لٹکا ہوا تھا تھوڑی دیر تک وہ عقاب بازار کے اوپر منڈلاتا رہا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ سانپ بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے ایک شخص کی گردن پر جا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ آدمی کسی کو مدد کے لیے پکارتا، سانپ نے اپنے زہریلے پھن سے اس کی پیشانی کو داغ دیا، ابھی کوئی دوسرا شخص اس کے قریب بھی نہ پہنچا تھا کہ عقاب زمین کی طرف جھپٹا اور سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر غائب ہو گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ کوئی شخص بھی کوئی رائے قائم نہ کر سکا اور اس حادثہ کو محض ایک اتفاق سمجھا گیا۔

لیکن......

روز فردا پھر ایک عقاب اُس شہر پر منڈلاتا ہوا دکھائی دیا۔ جس کے پنجوں میں مارِ سیاہ دبا ہوا تھا اور جب وہ عقاب شہر کے وسط میں پہنچا تو اس کے پنجوں سے نکل کر وہ سانپ ایک شخص کی گردن پر آ گیا۔ پھر وہی ہوا کہ اس نے اس آدمی کو ڈس لیا اور عقاب سانپ کو اپنے پنجوں میں دبا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اسے بھی اتفاق......دوسرا اتفاق کہا جا سکتا تھا لیکن دوسرا اتفاق اہل شہر کے لیے تشویش کا باعث بھی بنا۔

اور جب تیسرے روز بھی یہ حادثہ پیش آیا تو تمام افراد شہر کو اپنی گردنوں پر سانپ اور سروں پر عقاب اڑتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ صاحب دانش غور وخوض میں مشغول ہوئے کہ اب اتفاق نہیں ہے۔ اتفاق مسلسل نہیں ہوتا۔ پورے شہر میں اجتماعی مشورے ہونے لگے، مفتیان شہر نے اعلان کیا کہ اس شہر میں گناہ بڑھتے جارہے ہیں۔ شاید یہ خدا کے عذاب کی ایک شکل ہے کہ اس سے پہلے بھی آسمانی پرندوں نے کنکریاں برسائی تھیں اور جو لوگوں کے سروں میں اُتر گئی تھیں۔ اے لوگو! عبادت گاہوں کی طرف رجوع کرو۔ شاید اس بلائے آسمانی سے نجات ملے۔ شہر کی عورتوں نے اپنے شوہروں کی جان کی امان کے لیے اپنے سروں کو برہنہ کر کے خدائے ذوالجلال کے روبرو دست دعا بلند کیے۔

بازار بے رونق ہونے لگے۔ لوگوں کی آمدورفت کم ہوگئی۔ پھر چند لوگوں نے یہ طے کیا کہ آئندہ جب بھی عقاب اپنے پنجوں میں سانپ لے کر آئے گا تو اسے کسی طرح ہلاک کردیں گے۔ پھر یہی ہوا کہ جب عقاب نے اپنے پنجوں سے سانپ کو آزاد کیا تو اس کی گھات میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر حملہ کردیا۔ لیکن عقاب ان کے حملہ کی زد سے بچ کر نکل گیا تاہم ان سب نے اس سانپ کو ہلاک کردیا جو بازار میں موجود ایک شخص کی گردن میں لپٹ کر اس کی پیشانی کو اپنی زہریلی زبان سے چوم چکا تھا۔ سانپ کو ہلاک کرنے کے بعد سب نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب اہل شہر اس عذاب سے نجات پاگئے تھے۔ سب نے خوشیاں منائیں۔ عبادت گاہوں میں سجدہ ہائے شکر ادا کیے گئے۔ بازار میں گھومتے افراد کے چہروں پر ایک بار پھر خوشی کی چمک لوٹ آئی۔

اگلی صبح بہت سکون رہا، لوگ اپنے گھروں سے نکل کر بازاروں میں پہنچے، خوف تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ کیا؟

اچانک پھر آسمان پر عقاب پرواز کرتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے پنجوں میں بدستور سانپ دبا ہوا تھا اسی لمحہ عقاب کے پنجوں میں دبا ہوا سانپ ایک شخص کی گردن پر گرا اور اس نے اپنے زہر کو اس شخص کی پیشانی پر اگل دیا۔ عقاب نے اُسے اپنے پنجوں میں اُٹھالیا لیکن قبل اس کے کہ وہ لوگوں کی نظروں سے روپوش ہوتا ایک نوجوان نے بڑھ کر اپنی بندوق سے اس کو نشانہ بنایا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عقاب اور سانپ دونوں ہی زمین پر آگرے۔ افراط خوشی سے لوگوں نے نوجوان کو کاندھوں پر اٹھالیا کہ اس کی حاضر دماغی، چستی اور چالاکی کے سبب ایک عذاب اہل

شہر کے سروں سے ٹل گیا۔ اس روز گزشتہ روز سے زیادہ خوشیاں منائی گئیں کہ اب عقاب بھی ختم ہو چکا تھا۔

پھر کئی روز تک سکون رہا، کوئی عقاب آیا اور نہ سانپ کسی کے اوپر گرا، سب خوش تھے، بازاروں اور دکانوں پر رونق ہونے لگی تھی اور لوگ گذرے ہوئے حادثوں کو بھولتے جا رہے تھے لیکن پھر ایک دن......

آسمان پر کئی عقاب بیک وقت پرواز کرتے ہوئے نظر آئے۔ سب کے پنجوں میں مارِ سیاہ دبے ہوئے تھے۔ اور جب وہ ایک مجمع کے اوپر پہنچے تو انھوں نے پنجوں میں دبے ہوئے سانپوں کو چھوڑ دیا اور سانپوں نے کئی لوگوں کی پیشانیوں کو زہر آلود کر دیا۔ عقاب پھر سانپوں کو لے کر غائب ہو گئے تھے۔

اس بار خواف ہوا کی طرح گلیوں اور گھروں میں گھس گیا تھا، ہر شخص پریشان تھا کہ اس کا بچنا مشکل ہے لوگوں نے اپنے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر لیے تھے بازاروں میں گھومنے والوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ اس رات تمام اہل شہر ایک جگہ جمع ہوئے اور بہت دیر تک سوچتے رہے کہ اس عذاب سے نجات کا طریقہ کیا ہے۔ عقل حیران تھی، دست و پا بے بس تھے۔ شاید سانپ ان کا مقدر بن گئے تھے۔ ہر شخص اپنی گردن پر سانپ کی گرفت محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

سانپ انہیں کی گردنوں پر کیوں گرتے ہیں جن کے سروں پر اونچے مکانوں کی چھتیں نہیں ہوتیں۔ جن کو زندگی کا تمام سفر پیدل طے کرنا ہوتا ہے۔ جو موسموں کی تبدیلیوں کو اپنے جسموں پر برداشت کرتے ہیں۔ سوچتے سوچتے جب ان کے ذہن تھک گئے تو سب نے فیصلہ کیا ہم سب جہاں پناہ کے روبرو جا کر اپنی اس مصیبت کا حال بیان کریں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ ہمیں اس عذاب سے نجات دلائے کہ خدا نے رعایا کی سرپرستی و محافظت اس کے ذمہ کی ہے۔

دوسرے روز تمام اہل شہر ایک جلوس کی شکل میں جہاں پناہ کی آرائش گاہ پر پہنچے اور اپنا حال بیان کیا۔ جہاں پناہ ان سب سے محبت اور شفقت سے پیش آئے اور کہا۔

''ہم جانتے ہیں کہ ہماری رعایا ایک عذابِ آسمانی میں گرفتار ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے اور ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو، ہم

تمہارے لیے فکر مند ہیں اور کوشش کریں گے کہ تم لوگوں کو جلد اس مصیبت سے نجات ملے۔ ہم نے اپنے وزیروں کی ایک جماعت کو اس کی تحقیقات کے لیے متعین کیا ہے۔''

جہاں پناہ کی اس بات سے سب خوش ہوئے کہ وہ اسے اپنا ناخدا جانتے تھے۔ سب نے بیک زبان جہاں پناہ کے اقبال کی بلندی کا نعرہ لگایا اور دعائے خیر دی۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ ابھی چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ جہاں پناہ کے عالیشان محل کے چاروں دروازوں پر چار بلند پرواز عقاب اپنے پنجوں سے سیاہ سانپوں کو دبائے ہوئے نکلے اور مجمع کے اوپر چھاگئے۔ آئی ہوئی رعایا نے عالم غیض وغضب میں جہاں پناہ کی طرف دیکھا وہ اب بھی کہہ رہا تھا ''تم سب ہماری اولاد کی طرح ہو۔ ہم تمھارے لیے فکر مند ہیں۔''

☆☆☆

الزورا

—صدیق عالم

''سنجیدہ لوگو، تم گائے کے گوبر سے بھی بدتر مہکتے ہو۔''
—دادا مینی فسٹو کے طور پر پڑھی گئی تحریر

اور اب وقت آ گیا ہے کہ الزورا کی کہانی لکھی جائے۔ الزورا جنھوں نے پشت در پشت اس ملک کا نمک کھایا اور اب یہ آخری الزورا میرے پاس کھڑا ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا بغیر مونچھوں والا انسان جس کی آنکھیں کم پلکیں جھپکتی ہیں۔ شاید اس کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے ورنہ الزورا (وہ مقدمہ باز انسان) ہتک عزت کا مقدمہ دائر کر سکتا ہے۔ اس کے پاس اس کے لیے کافی وقت ہے۔

بٹوارے کے قبل بنگالی زمین دار خاندان سے تعلق رکھنے والا علی ضرار جسے آزاد ہندوستان کے بنگالیوں نے الزورا بنانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ بہت کم عمر میں ایک بڑی عمارت کا مالک بن بیٹھا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس نے دیکھا اس عمارت کا چپہ چپہ مہاجر پنجابیوں کو کرائے پر دے دیا گیا تھا جن میں سے زیادہ تر غریب ڈرائیور تھے یا ان کے رشتے دار جو کوٹلا اور نور پور کے گاؤں دیہات سے آ کر یہاں بس گئے تھے اور اُنہیں کی طرح ایک ٹیکسی چلایا کرتے۔ یہ ان مقدموں کی شروعات تھی جنھوں نے الزورا کو ساری عمر ایک انتہائی مصروف انسان بنائے رکھا۔

اور انہیں مقدمات کے چکر میں الزورا سے میری دوستی ہو گئی تھی۔ اس کے سزا کے طور پر مجھے ہر ہفتے دو تین شامیں اس کے ساتھ شراب پینی پڑتی۔ اور کیوں نہیں، الزورا نہ صرف میرے لیے ایک اہم موکل تھا بلکہ شراب کے معاملے میں کافی دریا دل بھی تھا۔ الزورا جس نے بہت کم عمر میں اپنے پنجابی دوستوں کی صحبت میں شراب پینا سیکھ لیا تھا۔

''صرف اس کے لیے میں نے پریوار کا بکھیڑا نہیں پالا۔'' الزورا نے وہسکی کے گلاس کو اوپر اٹھا کر کہا۔'' اور مجھے پتہ ہے تمھیں اپنی بیوی سے کتنے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔''

''بہت سی بیویوں کو شراب پینے پر اعتراض نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''اور ایسی بیویاں مجھے پسند نہیں۔'' الزورا نے کہا۔''میں بیویوں کے معاملے میں ہمیشہ سے ذرا دقیانوسی قسم کا انسان ہوں۔ ایسی عورتیں جو دوسرے مردوں پر گرتی رہتی ہیں، مجھے پسند نہیں، نہ ہی وہ عورتیں جو اپنے شوہر کو جام بنا کر پیش کرتی ہیں۔''

ایک دن جب عزت مآب چیف جسٹس کلکتہ کی گرمی سے گھبرا کر ٹھنڈے پہاڑوں کی طرف چلے گئے اور ہم مقدموں کے علاوہ بھی کچھ اور سوچنے کے لائق ہو گئے تھے، الزورا نے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ دریا کی طرف جانا چاہتا ہے۔

''دریا کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ شاید مجھے تھوڑا نشہ ہو گیا تھا۔''ہوگلی کا پانی ہمیشہ کی طرح گندا ہے اور دریا کے دونوں کنارے کولکاتہ اور ہاوڑا کے شہر پچھلے پچاس برس سے نہیں بدلے۔ صرف دونوں شہروں کے بیچ انسانی آبادی نے اپنی گندگی کے تبادلے کے لیے ایک عظیم الشان پل بنالیا ہے۔''

''میں نے ایک عرصے سے کسی انسانی مردے کو دریا میں بہتے نہیں دیکھا ہے۔'' الزورا ہنسا۔'' پچھلی بار تیل گھاٹ میں بھٹکتے بھٹکتے میں ایک انسانی بھیڑ میں شامل ہو گیا تھا جو پانی سے ابھرے ہوئے ایک انسانی مردے کو تاک رہی تھی۔ یہ مردہ ہاوڑا پل کے نیچے کسی زیر آب لوہے کے ڈھانچے سے اٹک گیا تھا اور بڑا ہی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا۔ پانی پی پی کر وہ دیو کی طرح پھول کر کپا ہو رہا تھا اور اس کے نچلے ہونٹ کو مچھلیوں نے کتر ڈالا تھا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں اگر تم بھی اسے دیکھتے تو اپنی ہنسی نہ روک پاتے۔''

''ہم مردوں پر بہت بات کر چکے۔'' میں نے غصے سے کہا۔''کوئی ضروری نہیں کہ اس بار بھی ہمیں پھر کوئی مردہ نظر آ جائے۔ میرا خیال ہے ہمیں دریا کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیے۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' اس نے کہا۔''میں ایک ایسی زندگی جی رہا ہوں جس میں اس دریا کی کافی اہمیت ہے۔ بلکہ مجھے یقین ہے اس شہر میں ہر کس و ناکس کی زندگی میں یہ دریا ایک بہت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ میں تمھیں سمجھا نہیں سکتا کہ کس طرح۔''

اس کے بعد ہم دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئے اور میں سوچنے لگا کہ کیا الزورا میری زندگی کے لیے کوئی صحیح واقعہ ہے؟ اس اتنے بڑے شہر میں جہاں ہزاروں گھر آباد ہیں جن میں لاکھوں انسان بستے ہیں جانے وہ کون سے اتفاقات تھے جنھوں نے ہمارے ستاروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے پر مجبور کیا۔

الزورا میری طرف مسکراتے ہوئے تاک رہا تھا۔

''میں تمھیں ایک تجربے کے بات بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کھانے اور نہ کھانے میں شش و پنج پیدا ہو تو نہ کھانا بہتر ہے اور جانے اور نہ جانے میں ہو تو جانا بہتر ہے۔''

''واقعی، یہ کافی دانش مندی کی بات کہی ہے تم نے۔'' میں نے اس کی مسکراہٹ واپس لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''مثلاً اگر دوا کھانے یا نہ کھانے میں شش و پنج ہو تو نہ کھانا بہتر ہے اور چکلا جانے یا نہ جانے میں شش و پنج ہو تو وہاں جانا بہتر ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ تم مجھ سے دشمنی کی شروعات کرنا چاہتے ہو تاکہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کر سکو۔'' الزورا اپنی ہمیشہ کی مسکراہٹ مسکرا رہا تھا جس کے حاشیوں پر خفت کے ذرا بھی نشانات نہ تھے۔ ''مگر میں اتنی آسانی سے درکنار کر دینے والی چیز نہیں ہوں۔ اور میں تمھیں دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ دریا میری زندگی میں کیوں اتنی اہمیت رکھتا ہے۔''

''پہلے میں اس کے لیے اپنے اندر دلچسپی جگا تو لوں۔'' میں نے کہا اور اس کی آنکھوں کے اندر تاکنے لگا۔ پھر میں نے اپنے کندھے اچکا کر کہا۔ ''سوری گاڈ فادر، کوئی فائدہ نہیں۔ میں اپنے اندر کسی بھی طرح کے تجسس کا فقدان پا رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم لوگ کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کریں۔''

الزورا کے مکان کے جس کمرے میں ہم لوگ بیٹھے تھے اس میں آدم قد کھڑکیوں کے پلّے باہر کو کھلے ہوئے تھے جن پر چڑیوں کی بیٹ کی لمبی لکیریں تھیں۔ ہمارے سامنے کی کھڑکی سے نیچے سڑک کا شور سنائی دے رہا تھا جس کے دوسری جانب ایک عمارت کی شکستہ دیوار پر غالب کا سبزہ اگا ہوا تھا۔ میں میز پر پوروں کو رکھ کر اپنی انگلیوں کی ناہمواری کو ناپنے لگا۔ الزورا میری طرف نہیں دیکھ رہا۔ وہ اپنے خالی گلاس کے اندر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر اس کی کرسی کے پاس گیا اور میں نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''الزورا کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم ایک دوسرے کو نہ جانتے۔''

''کیا ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟'' الزورا نے مجھے لاجواب کرتے ہوئے کہا۔'' اور ایک دوسرے کو جاننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم اس جانکاری کے بغیر بھی زیادہ بہتر یا بد تر جانور ثابت ہو سکتے ہیں۔''

''تو پھر تم اپنے بارے میں مجھے اتنا کیوں بتانا چاہتے ہو؟ اس کے لیے دریا کی طرف کیوں جانا چاہتے ہو؟''

''زیادہ بتانا مطلب زیادہ چھپانا، مطلب پانی کو زیادہ گدلا کر دینا ہے۔ الفاظ ہمارے سب سے آزمودہ اور طاقتور بے نقاب ہیں۔ اور دریا کی طرف جانے کا مطلب ہے اس جگہ کو لوٹنا جہاں سے ہم سارے جاندار رینگ کر باہر آئے ہیں۔ یہ میں نہیں، دنیا کے سب سے پہلے فلسفی طالیس کا کہنا ہے۔ یہ پانی ہماری جبلت میں حاوی ہے اسی لیے لوگ ساری عمر پانی کے طلسم میں گرفتار رہتے ہیں، جھیل اور سمندر کی طرف جانا چاہتے ہیں، کنوؤں میں ڈوب کر مرتے ہیں۔'' الزورا مسکرا رہا تھا اور میں اس کے مسوڑوں میں سونے کے دانتوں کو چمکتے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اگر الزورا ہندو ہوتا تو جلنے کے بعد اس کی راکھ کو پانی سے چھنوانا کافی فائدے کا کاروبار ہوتا جیسا کہ بنارس کے کلّو گھاٹ میں لوگ کرتے ہیں۔

''تم سمجھتے ہو میری کہانی بس اتنی سی ہے، ایک شرابی جس کی کڈنی آخر کار ناکارہ ہو جانے والی ہے۔'' الزورا کی آواز آئی۔ ''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یا پھر ممکن ہے تم غلط کہہ رہے ہو اور میں مرنے کے بعد جنت چلا جاؤں۔''

''تم کہیں بھی جاؤ آخر کار اسے جہنم ہی بنا ڈالو گے۔ چلو چلو دریا کی طرف چلتے ہیں۔'' میں میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے اکتا کر کہتا ہوں کیوں کہ مجھے یاد آتا ہے ایک دوست کے ساتھ ساتھ میں ایک پرافیشنل بھی ہوں جس کے لیے اپنے گاہکوں کی خوشنودگی کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ ''تمھیں پتہ ہے کہ الزورا کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔ مجھے اس کے لیے معاف کر دینا۔ اس سے تمھاری ذمہ داریاں میرے لیے بڑھ سکتی ہیں۔''

''میں نے ہمیشہ دوستوں کے مصائب جھیلے ہیں۔'' الزورا مسکرا رہا تھا۔ ''ایک ستم اور سہی۔ دوست بھلا اور کس لیے ہوتے ہیں؟''

☆☆☆

دریا کنارے عام دنوں کی طرح اکّے دکّے لوگ نظر آرہے تھے کیوں کہ یہ آفس کا وقت تھا۔مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ایک عورت دریا کی حفاظتی دیوار پر ہماری منتظر تھی جسے اپنی طرف آتے دیکھ کر الزورا مسکرا رہا تھا۔

''گھبراؤ مت، اسے میں نے بلایا ہے۔'' الزورا نے میرے کان میں سرگوشی کی اور اس پیلے گلاب کی طرف اشارہ کیا جسے اس نے شناخت کے لیے اپنی شرٹ کے کاج میں ٹانک رکھا تھا۔

''مگر یہاں کیوں؟'' مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ وہ کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ اس کے بھڑکیلے میک اپ ساڑی اور بلاؤز کو کس کر پہننے کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کی عادی تھی۔ گرچہ اس نے مانگ میں سیندور بھر رکھا تھا مگر جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا یہ سیندور فرضی تھا۔

''سونیکا۔'' الزورا نے عورت کا تعارف مجھ سے کراتے ہوئے کہا۔''ہم آج پہلی بار مل رہے ہیں۔ میں نے سونیکا کا نمبر ایک عوامی پیشاب خانے کی دیوار سے لیا تھا۔اور یہ ایک نئی طرح کا اڈوینچر ہے۔''

''میرا ایک دوست ہے جسے میں نے اس کام پر لگایا ہوا ہے اور یہ کوئی اڈوینچر نہیں، میری روزی روٹی کا سوال ہے۔'' سونیکا نے کہا۔''مگر فون پر مجھے کیا پتہ تھا کہ میں دو ادھیڑ عمر کے بن مانس سے ملنے جارہی ہوں۔ خیر آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

''آگے کا کوئی پروگرام نہیں۔'' الزورا نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔''ہم صرف یہاں شریف آدمی کی طرح بیٹھ کر گفتگو کریں گے، ایک ایسے شریف آدمی کی طرح جس کی کال کوٹھری کا دروازہ ابھی کھولا نہ گیا ہو۔''

سونیکا نوٹ تھام کر تھوڑی دیر ہچکچاہٹ کے ساتھ کھڑی رہی۔ پھر اس نے پرس کھول کر اسے اندر ڈال لیا، ایک ٹھنڈی سانس لی اور چپ ہوگئی۔ ہم تینوں حفاظتی دیوار کے سامنے کھڑے دریا پار تاک رہے تھے جہاں انگریزوں کے زمانے کے گودام گھر خاموشی کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے اور آزاد ہندوستان کے کارخانے دھواں اگل رہے تھے جو سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے اوپر جارہے تھے۔

''زیادہ بات کرنا میں پسند نہیں کرتی۔'' آخر کار لانبے قد کی سونیکا نے سینہ پناہ پر اپنے بھاری کولھے ٹکا کر دریا کو رد کرتے ہوئے کہا۔''خیر اب پسند ناپسند کا سوال کہاں اٹھتا ہے۔ میرا نام سونیکا ہے۔ یہ میرا اصلی نام نہیں۔ اور کیا جاننا چاہتے ہو تم لوگ؟ یاد رکھو مجھے اپنے کام میں بیک وقت دو آدمی کا سامنا کرنے کی عادت نہیں۔''

''دو تو کیا میں تو ایک تجربے سے محروم ہوں۔'' الزورا ہمیشہ کی طرح اپنی کمینی مسکراہٹ مسکرا رہا تھا۔''گرچہ آدمی ہر روز نئی چیزیں سیکھتا ہے۔ ویسے میں بتا دوں اپنے دوست کو میں اس کی مرضی کے خلاف گھسیٹ کر یہاں لایا ہوں گرچہ ہر بار اس طرح کے معاملات میں وہی مرکزی کردار بن کر ابھرتا ہے جس کے بعد میری حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ کی نہیں ہوتی یا اس ہدایت کار کی طرح ہوتی ہے جسے کھیل شروع ہوتے ہی اسٹیج سے غائب ہو جانا ہے۔''

''مجھے رنڈیاں پسند نہیں۔'' میں ناخوشگواری کے ساتھ کہتا ہوں اور اذیت پسندی کے جذبے سے سرشار نظر آرہا ہوں۔''اور اگر مجھے تمھارے بارے میں علم ہوا تو میں ادھر کبھی نہ آتا۔ شاید الزورا کو پیسے لٹانے کا شوق ہو۔ ممکن ہے وہ تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہو۔ مگر میں...... میں کچھ دوسری طرح کے گناہ کا شوق رکھتا ہوں۔''

میں ان دونوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہوں جہاں حفاظتی دیوار کے سامنے ایک جگہ ایک بوڑھی مارواڑی عورت اپنی جواں سال نوکرانی کے ساتھ کھڑی کوؤں اور کبوتروں کو دانے ڈال رہی تھی۔ میں مڑ کر دیکھتا ہوں، دونوں مسکراتے ہوئے میری طرف تاک رہے ہیں۔ الزورا میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہے۔ وہ میری توجہ دریا کی طرف مبذول کرنا چاہتا ہے جہاں ایک بھینس کا مردہ بہتا جا رہا ہے۔ اس مردے کی گردن پر ایک چڑیاں بیٹھی ہوئی ہے جو اس کے کان کے اندر ٹھونگے لگا رہی ہے۔ مجھے ابکائی آتے آتے رہ جاتی ہے۔ جانے کتنا وقت گذر جاتا ہے۔ دریا بہتے بہتے میرے ذہن سے باہر چلا جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں، مارواڑی عورت کی ٹوکری خالی ہو چکی ہے اور وہ اپنی نوکرانی کے ساتھ اپنی کار کے اندر بیٹھ رہی ہے۔ ڈرائیور اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھا دریا کی طرف تاک رہا ہے۔ ایک سفید بالوں والا کتا اس کے بغل میں کسی فلسفی کی طرح چہرہ لٹکائے بیٹھا ہے جیسے وہ اس کائنات کی حقیقت سے بیزار ہو۔ کتے کے ابرو کے بال کافی گھنے ہیں جنھوں نے اس کی آنکھوں پر سایہ کر رکھا ہے جیسا کہ ستر اسّی سال کے بڈھوں میں نظر آتا ہے۔

''اتنا مت اتراؤ۔'' میں کتے سے کہتا ہوں اس بات سے لاپرواہ کہ میری آواز صرف مجھے سنائی دے رہی ہے۔ ''تم اس چمچماتی کار میں ہونے کے باوجود ایک کتا ہی رہو گے۔''

☆☆☆

ایک مختصر سی نیند اور میری آنکھیں پھر سے کھل گئی ہیں۔ سونیکا آئینہ کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مجھے پتہ نہیں میں کتنی دیر سوتا رہا تھا جب کہ ہمارے درمیان اس طرح کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ وہ اس وقت پینٹ کوٹ اور بلاؤز پہنے ہوئی تھی اور اپنی طبعی عمر سے کچھ زیادہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے آئینے کے اندر مجھے جاگتے دیکھا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتے مسکرائی جس کا مقصد اور کچھ نہیں لپ اسٹک کو اچھی طرح ہونٹوں کی شکنوں کے اندر تک پہنچانا تھا۔

''موبائل پر تمھارے دوست نے تمھیں فون کیا تھا۔''

''اور تم نے اس سے بات کی؟''

''نہیں، میں اپنے پیشے کی نزاکت کو اچھی طرح سے سمجھتی ہوں۔ میں موبائل میں اس کا نام پڑھ کر بتا رہی ہوں۔''

''گڈ گرل۔'' میں اٹھ کر تکیہ پر کہنی رکھتے ہوئے انگڑائی لیتا ہوں۔ ''تم میرے دوستوں سے ملتی رہتی ہو؟''

''میں نے صرف ایک دو بار ریستوراں میں اس کے ساتھ شراب پی ہے اور بس۔'' اس نے کھڑے ہو کر ساڑی کی تہوں کو اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا گرچہ مجھے پتہ تھا وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ ''وہ بہت زیادہ باتیں کرتا ہے اور بوریت کی حد تک نیک بندہ ہے۔ لیکن جانے اتنی زیادہ پی جانے پر بھی اسے نشہ کیوں نہیں ہوتا۔ پھر وہ پیتا ہی کیوں ہے؟''

''الزورا کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تمھارا ذہن تھک جائے گا اور تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاؤ گی۔ وہ ایک دلدل ہے۔ جس نے بھی اس کے اندر غوطہ لگایا پھر کبھی ابھر نہ پایا۔ اس کی جیتی جاگتی مثال میں ہوں۔ ہمارے درمیان کبھی وکیل اور موکل کا رشتہ تھا، اب دیکھو میں کہاں پر ہوں۔ اب میری حیثیت ایک کتے کی طرح ہے جسے وہ جلتے ٹائر کے اندر سے گذرنے کا مشق کروا رہا ہے۔''

''میں تم جیسے پیچیدہ مردوں میں اپنا دماغ نہیں کھپاتی۔'' وہ بولی۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم مردوں کے پاس دماغ صرف ایک ہوتا ہے جب کہ جیبیں دو یا دو سے زیادہ ہوتی ہیں۔''

ہاوڑا اسٹیشن کے باہر واقع اس بدنام زمانہ ہوٹل سے جب ہم باہر نکلے تو ہاوڑا پل کا ڈھانچہ دھوپ سے تمتما رہا تھا اور اس پر بچھی تارکول کی سڑک سلگ رہی تھی۔ سونیکا کو ٹالی گنج کے لیے روانہ ہونا تھا۔ میں نے دیکھا ٹرام کی متروک پٹری پر ایک بھاری بھرکم آدمی کھڑا ہماری طرف تفتیش بھری نظروں سے تاک رہا تھا۔ سونیکا پرس جھلاتے ہوئے ایک سرکاری بس کے اندر غائب ہوگئی جس کا نمبر ونڈ اسکرین پر چونے سے لکھا ہوا تھا اور جس کا ڈرائیور کسی بل ڈاگ کی طرح اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا بے زار نظروں سے کلکتہ کی طرف تاک رہا تھا اور رہ رہ کر پلاسٹک کی ایک غلیظ بوتل سے پانی پی رہا تھا۔ میں نے پٹری پر کھڑے اس بھاری بھرکم شخص کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

''شاید آپ مجھے جانتے ہیں؟'' میں نے اس سے بنگالی میں پوچھا۔

''قطعی نہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور مرطوب علاقے میں جینے والے کسی سمندری گھوڑے کی طرح گیلا نظر آرہا تھا۔ ''لیکن یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک بالکل ہی نیا چہرہ بہت شناسا ثابت ہوتا ہے۔''

''جیسے کسی کاربن پیپر کے نیچے سے نکل آیا ہو۔'' میں نے مسکراہٹ لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''اس طرح دیکھا جائے تو ہم اپنے حافظے پر زیادہ بھروسہ نہیں کرسکتے؟''

''انسانی حافظہ وہ سنڈاس ہے جو بھرتا رہتا ہے، بھرتا رہتا ہے۔'' فربہ آدمی اپنے پیلے دانت باہر نکال دیئے تھے جیسے وہ ان کی نمائش کے لیے وہاں کھڑا ہو۔ ''......اور جب گھڑا پھوٹتا ہے تو ہمیں یہ سمجھنے میں پریشانی ہوتی ہے کہ یہ گندگی ہمارا حصہ ہے کہ ہم ایک کیڑے کی طرح اس گندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔''

''چھوڑو بھی اس طرح اندھیرا مت پھیلاؤ۔'' میں نے لاپرواہی سے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہم کیوں نہ اچھی چیزیں سوچیں۔ کھاتے پیتے لوگوں کے درمیان اس طرح کی گفتگو کا کیا کام ہے۔ لوگ سمجھیں گے ہم حزن وملال کے پیغمبر ہیں جو ہر روز اس پل کو ٹوٹ کر دریا برد ہوتے دیکھنے کی امید میں اس طرف آنکلتے ہیں۔''

☆☆☆
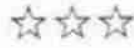
اس شخص سے دوبارہ ملاقات کے قوی امکان کی امید کا جب میں نے الزورا سے ذکر کیا تو وہ فکر مند نظر آیا۔

''کیا کہا تم نے کیم شیم، یہی الفاظ تھے نہ تمھارے؟'' اس نے کہا۔ پھر سیٹی بجائی۔

''اور اب تم اس سے کس چیز کی امید رکھتے ہو؟ یاد رکھو، خواہ مخواہ کے کھلونے اکٹھے کرنا دانش مندی کا کام نہیں۔''

''لیکن کچھ کھلونے تفریحِ طبع کا کام بھی انجام دیتے ہیں اور کچھ کھلونے بلا وجہ سہی مگر ساری زندگی تم اپنی نفسیات کے طاقچے پر انہیں رکھنے پر خود کو مجبور پاتے ہو۔''

''وہ خدا کے بنائے ہوئے خاص کھلونے ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ صحیح کھلونے ہم جیسے گنہگار بچوں کو کبھی ودیعت نہیں ہوتے بلکہ میں تو کہتا ہوں ہمیں اپنے گناہوں کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھانے کے بارے میں سوچنا ترک کر دینا چاہیے۔ یہ وہ معاملات ہیں جنہیں اوپر والا اپنے ڈھنگ سے طے کر چکا ہے۔''

''تم اپنی باتوں کے ذریعے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمھاری نیت میں کھوٹ نہیں، کہ تمھاری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ کی نہیں اور اس طرح دیکھا جائے تو تم پر کسی طرح کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، ایک روبوٹ کی طرح جو اپنے پروگرام کے باہر کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں؟ چلو بھی، یہ اداکاری چھوڑو۔ تمھارے اس فرسودہ میک اپ سے اب کام چلنے والا نہیں۔ یہ دنیا اپنے محور پر بہت آگے نکل چکی ہے۔''

''میری نیت میں کوئی بھی کھوٹ نہیں، کتنا معمولی سا جملہ ہے نا یہ جو اپنے آپ کو ہر پل غلط ثابت کرتا رہتا ہے۔'' اور الزورا اٹھ کر ٹیرس پر ٹہلنے لگا جو نیچے سڑک سے گذرتی گاڑیوں کے سبب اپنے ستونوں پر لرز رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ مگر کیا وہ میری طرف دیکھ رہا تھا؟ کیا میں خود اپنے اندر موجود تھا؟

''میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔'' الزورا نے پھر سے دہرایا۔ ''لیکن جیسا کہ تم کہتے ہو میں ان ڈوریوں کا کیا کروں جو میری مرضی کے خلاف مجھے حرکت کرنے پر مجبور کرتی ہیں، مجھے منہ کے بل گراتی رہتی ہیں، سر کے بل لٹکائے رکھتی ہیں اور آخر میں ہمارے گلے کا پھندا بن جاتی ہیں۔''

تو کیا کچھ نادیدہ ڈوریوں نے مجھے بھی اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ کیونکہ سونیکا کے لیے میری تڑپ سے میں خود بھی حیران تھا۔ کیا ایک انسانی جسم کسی دوسرے پر اس حد تک قابض ہوسکتا ہے؟ سونیکا جس کی آنکھیں یوں تو ہر وقت مسکراتی ہیں مگر ان میں خوشی کی کوئی رمق نہیں جاگتی، جس کے ہونٹوں کے دبیز نشانات میرے دل تک نہیں پہنچتے، اچانک آنکھیں بند کرنے پر وہ کیوں اتنی زیادہ روشن ہو اُٹھتی ہے کہ اسے پتلیوں پر سنبھالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اور اسی دوران اس شہر میں تنہا لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جارہی ہے، وہ بھاگتے ہوئے اپنی جگہ منجمد لوگ ہیں، وہ واپس تاکنے سے خوفزدہ لوگ ہیں، وہ مستقبل کے لیے کسی طرح کے جائز یا ناجائز دعوے پیش نہیں کرتے اور میں ان لوگوں کی منفرد بھیڑ کا وہ نادر چہرہ ہوں جس نے ایک ننگے اور بے پناہ جسم کی تہوں کے اندر اپنی ایک خفیہ کہانی لکھنے کی کوشش کی ہے، ایک ایسی کہانی جسے وہ دنیا سے چھپا کر لکھنا چاہتا ہے۔

''دھیرے دھیرے تم ایک پتھر بنتی جارہی ہو۔'' ایک دن میں سونیکا سے شکایت کرتا ہوں کیوں کہ اس کا جسم کسی بھی طرح کے شہوانی ردِّ عمل سے خالی ہے۔

''سوری۔ میرا لڑکا بیمار ہے۔''

میں اس کے پیٹ پر سیزرین کے نشانات دیکھ چکا ہوں۔

''اور دوسرا؟''

''وہ مر چکا ہے۔''

''اُسے کیا ہوا تھا؟''

''تھلیسیمیا!''

''اور اِسے؟''

''یہ بھی تھلیسیمیا کا شکار ہے۔''

میں اس کے ننگے جسم سے اس کی روح کی طرح الگ ہو کر بیٹھ گیا ہوں۔

''اور تمہارا شوہر؟''

''میں طلاق شدہ ہوں۔''

''وہ اپنے بچے کی خبر نہیں لیتا؟''

''وہ اس ملک سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔ اس کے پاس ایک بہت ہی ملائم دل ہے۔ اس سے ان بچوں کا مرنا دیکھا نہیں جاتا۔''

''مجھے افسوس ہے سونیکا۔''

''نہیں۔'' سونیکا میرے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دیتی ہے۔ ''ہمدردی مت جتاؤ۔ تم واحد شخص ہو جسے میں ہمدردی کی کھائی میں غائب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ میں اس دنیا کی بے رحمی کے سہارے ہی زندہ ہوں۔ تم دیکھ رہے ہو اوپر والا جب شدید دکھ دیتا ہے تو اسے برداشت کرنے کی بے حسی بھی عطا کرتا ہے۔ کم آن، یہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟ دیکھو میں اب جاگ چکی ہوں۔ میں ایک پرافیشنل ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں اس کا ازالہ کرنا چاہتی ہوں۔''

وہ مجھ سے لپٹنا چاہتی ہے۔ اس کی زبان کسی کیڑے کی طرح میرے سارے جسم پر رینگ رہی ہے، میری شہوانی خواہش کو ہوا دینا چاہ رہی ہے۔ مگر بہت دیر کی کوشش کے بعد وہ مجھے جگانے میں ناکام رہتی ہے۔ آخر وہ تکیہ کے اندر منہ ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

''تمہارا دل کسی فاختہ کی طرح نرم ہے۔'' وہ اپنا گیلا چہرا میری طرف اٹھا کر کہتی ہے۔ ''یہ دنیا کمزور بدن لوگوں کی آماجگاہ بنتی جا رہی ہے۔''

''میں واقعی ایک کمزور انسان ہوں۔ تمہارے شوہر کی طرح۔'' میں کہتا ہوں۔ ''لیکن میں تمھارے بچے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے اسے اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے ہیں۔ ''وہ اچھے ہاتھوں میں ہے۔ چلو بھول جاؤ اسے۔ کسی بار میں بیٹھ کر ہم ایک دو گلاس پیتے ہیں۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' میں کہتا ہوں اور دریا سے گذر کر ہم چورنگی روڈ پر ٹیکسی سے نکل کر ایک بار میں داخل ہوتے ہیں جہاں اس وقت Happy Hours ہے، ایک چینی سنگر فولڈنگ چیئر پر بیٹھی میک اپ کر رہی ہے اور ایک آدھ سازندے اپنے ساز ٹھیک کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم دن ڈھلنے تک اتنا پی لیتے ہیں کہ مشکل سے اپنی اپنی ٹیکسی میں بیٹھ پاتے ہیں۔ گھر پہنچ کر اچانک مجھے لگتا ہے دیواریں کافی دبیز ہوگئی ہیں، گھر کے لوگ، میری بیوی، میرے بچے، میرا

کتا بار کی جو میرے بریف کیس کو زمین پر رکھتے ہی اس کے ہینڈل کو جبڑوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے میری خواب گاہ کے اندر اس کی مخصوص جگہ پر لے جاتا ہے، ہر چیز میری سمجھ سے باہر ہے۔ باہر گلی میں ایک سائل کی بے وجہ کی پکار ہے اور ایک طیارہ ہماری چھت کو توڑتا ہوا میرے دماغ کے اندر کریش لینڈ کرنا چاہتا ہے۔

☆☆☆

کیتھڈرل روڈ کے کشادہ فٹ پاتھ پر بہت ہی بھاری بھرکم پیڑ اپنے نادیدہ گھونسلوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہاں پر سڑک کی صفائی ایک دوسرا کلکتہ پیش کرتی ہے۔ بارش کے بعد ہوا بالکل سرد ہو رہی ہے جو اکتوبر کے مہینہ کے لیے غیر فطری ہے۔ میں پی جی اسپتال کے پھاٹک پر پہنچ چکا ہوں اور اس کے گندے گلیاروں میں بھٹک رہا ہوں۔ بچوں کے وارڈ میں وہ لڑکا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف تاک رہا ہے۔ اس کے سارے بدن میں پلاسٹک کے پائپ لگے ہیں۔ اور تمام وارڈوں کی طرح اس وارڈ کی مہک بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ ہر دوسرے یا تیسرے بستر سے آکسیجن کے سیلنڈر لگے ہیں یا بوتلوں سے قطرہ قطرہ زندگی ٹپک رہی ہے۔ یہاں زیادہ تر آنکھیں ایک ایسے مستقبل کی طرف تاکنے کی عادی ہو چکی ہیں جو تنگ ہوتے ہوتے ایک روزنِ سیاہ میں بدل جاتا ہے جس سے واپس لوٹنا ممکن نہیں ہوتا۔

سونیکا کی مسکراتی آنکھیں میری طرف تاک رہی ہیں۔ وہ مریض کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھی کافی تروتازہ نظر آ رہی ہے (کیا وہ اپنے بچے کے سامنے کسی طرح کی اداکاری کر رہی ہے؟) وہ اپنے بچے کے لیے آنے والے جاڑے کے پیشِ نظر ایک سوئٹر بن رہی ہے۔ (شاید اس کا مقصد بچے کے سامنے ایک لمبی زندگی کا illusion قائم کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔) آہ وہ فریب جو ہم خود کو دیا کرتے ہیں! میرا جی چاہتا میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں مگر میں بہت دیر تک وہاں رک جاتا ہوں اور تب مجھے الزورا دکھائی دیتا ہے جسے دیکھتے ہی گیس ماسک کے اوپر بچے کی آنکھیں (یہ آنکھیں سونیکا کی تھیں) چمک اٹھی ہیں۔ دراصل یہ ان کی آنکھوں کی چمک تھی جس نے مجھے الزورا کی طرف دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر الزورا کی آنکھوں میں کوئی حیرت نہیں جاگتی۔

''سونیکا نے مجھے بتایا تھا تم آنے والے ہو۔'' وہ شاید کہیں سے کوئی رپورٹ لایا تھا جسے سونیکا کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیر رہا ہے، اس کے ساتھ باکسنگ کی اداکاری کر رہا ہے۔

''اسے موت سے ڈر نہیں لگتا۔ کیوں الزورا؟'' وہ اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ویڈیو گیم نکال کر کھیلنے لگتا ہے۔

''الزورا تمہیں یہ گیم چاہیے۔'' وہ بچے سے مخاطب ہے گرچہ اس کی طرف نہیں تاکتا۔ الزورا ایک کمپیوٹر جینیس ہے۔'' اس نے مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر کہا تھا۔

میں چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

''اس کے اس نام سے مت چونکو، اس نے مجھ سے یہ نام خود لیا ہے۔'' الزورا گیم کھیلتے ہوئے کہتا ہے۔'' اور ہم دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔

سونیکا اپنی جگہ بیٹھی اس تماشے کو دیکھ رہی ہے جیسے اسے پتہ ہو الزورا، مقدمہ باز انسان، آخر میں خود بخود اپنا راز اگل دے گا۔ اور وہ وہی کرتا ہے۔

''ہم نے طے کیا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہم ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھیں گے۔'' وہ ویڈیو گیم بچے کی طرف بڑھا دیتا ہے جسے وہ اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھ سے تھام لیتا ہے۔

سونیکا رپورٹ کے ساتھ ڈاکٹر کی تلاش میں چلی گئی ہے جو اتنے بڑے اسپتال میں جانے کہاں گھوم رہا ہوگا۔ الزورا نے بچے کا ایک ہاتھ تھام رکھا ہے اور دونوں میٹھی نظروں سے ایک دوسرے کو تاک رہے ہیں۔

''ہمیں ایک دوسرے سے اتنا قریب دیکھ کر تمہیں حسد ہو رہا ہوگا۔'' الزورا مڑ کر میری طرف دیکھ کر آنکھ مارتا ہے۔''چھپاؤ مت میں جانتا ہوں، تم ہمیشہ کے لیے ایک حاسد انسان رہے ہو۔ لوگ بلاوجہ نہیں کہتے کہ تم سارے وکیل آخر میں جہنم رسید کیے جاؤ گے۔''

☆☆☆

الزورا کی پرانی عمارت کے ٹیرس پر ہم کئی جام ٹکرا چکے ہیں۔ نتیجہ: آسمان پر کچھ نئے ستارے نکل آئے ہیں جو دراصل ہماری نشیلی آنکھوں کی ایجاد ہیں۔ نیچے سڑک پر پرچھائیاں مختلف شکلیں لینے لگی ہیں۔ ایک کھڑکی بار بار ہماری سماعت کی دیوار سے ٹکراتی ہے، کھلتی ہے،

بند ہوتی ہے، پھر سے کھل جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ہمیں یاد رہتی ہے، کبھی ہم اسے بھول جاتے ہیں۔ الزورا ایک اور جام بنا رہا ہے.....On the rocks۔

''تمہیں ہم دونوں کے تعلقات کا پتہ تھا؟''

''کسے پرواہ ہے۔'' الزورا ہنستا ہے۔ ''اور پھر اس سے عورتیں نیچے کہاں گرتی ہیں؟ یہ تو ہم مرد ہیں جو اپنا جسم بیچتے ہیں اور پیسے کی شکل میں اس کا کفارہ ادا کرتے ہیں۔ خیر اب اسے جانے دو۔ اب تو الزورا بھی نیم تلہ میں جل چکا۔''

مجھے اس کی اطلاع مل چکی تھی۔ میں نے سونیکا کو اس کے بعد بہت تلاش کی مگر اس کا ٹھکانہ بدل چکا تھا۔ شاید اس نے جینے کا کوئی نیا محور تلاش کرلیا ہو۔ '' میں اس کے جسم سے گدھ کی طرح چپکا رہا اور تم اس کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ تو یہ کردار ہے تمہارا۔ یہ کیسی Hypocracy ہے الزورا؟ مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اب میں جان گیا ہوں تم دریا کی طرف کیوں جانا چاہتے تھے؟''

''بہت خوب، تو ایک بار پھر کل کیوں نہ ہم دونوں ہوگلی پُل سے گذر کر بوٹینکل گارڈن کے مردہ گھاٹ کی طرف جائیں۔''

''وہاں ایسا کوئی مردہ گھاٹ نہیں۔ صرف ایک جگہ ایک سنسان کنارہ ہے جہاں جانوروں کے مردے ڈالے جاتے ہیں جن کے انتظار میں گدھ درختوں کی پھننگوں میں بیٹھے بیٹھے ٹہنیوں اور شاخوں پر اپنی چونچیں گھستے رہتے ہیں۔''

''ہم دونوں جانوروں کے جانے سے اسے مردہ گھاٹ کا رتبہ مل جائے گا کیونکہ صحیح طور پر دیکھا جائے تو ہم دونوں جانور تو ہیں مگر زندہ کب ہیں؟'' الزورا نے جام اٹھا کر آنکھ ماری۔ '' میں نے پیشاب خانے سے ایک نئی عورت کا پتہ لیا ہے، لیکن اس بار یہ پیشاب خانہ عوامی نہیں ایک پانچ ستارہ ہوٹل کا تھا جس کے آئینے میں یہ نمبر ایک قیمتی مارکر پین سے لکھا گیا تھا۔ اس نے فون پر بتایا ہے کہ وہ کلیوپڑا کی طرح خوبصورت ہے اور اب میرے لیے یہ جاننا ضروری ہوگیا ہے کہ کیا یہ صحیح ہے؟ تمہارے پاس کلیوپڑا کی کوئی تصویر ہے؟ میں نے سنا ہے پورے یورپ کی تاریخ اس کی ناک کی نوک سے لکھی گئی ہے۔''

''تم صرف ایک ناکام جوکر ہو جو ایک کارٹونسٹ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔'' میں جھک کر اس کی آنکھوں کے اندر تا کتا ہوں۔ ''میرے جوکر مجھے بتاؤ اب کون سا نیا کرتب دکھانے جارہے ہو تم؟''

الزورا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اور تب مجھے احساس ہوتا ہے کھڑکی کا کھلنا اور بند ہونا اچانک بند ہو گیا ہے۔ پھر الزورا انگڑائی لے کر آسمان کی طرف تا کتا ہے۔

''میں کسی فرشتے میں یقین نہیں رکھتا۔'' وہ دھیرے دھیرے کہتا ہے۔ ''کیونکہ میں جانتا ہوں اب ہم انسان ایسی چیز نہیں رہے کہ اس کے لیے کوئی فرشتہ خدا کی طرف سے پیغام لے کر اترے۔ شاید ہمیں اب اس کے بغیر ہی کام چلانا ہوگا۔ یوں بھی جب اتنی ساری کھایاں ہماری چاروں طرف بن چکی ہوں تو انہیں لانگھنا تو پڑتا ہی ہے، چاہے اس کوشش میں ہم اس کی نذر ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

''جیسا کہ میں ہو چکا ہوں۔'' میں اپنا گلاس اٹھا کر اس کے گلاس سے ٹکراتا ہوں اور تاریک آسمان کی طرف تا کتا ہوں جہاں دھندلے تاروں کے بیچ ہمارے تخلیق شدہ ستارے زیادہ روشن ہو گئے ہیں۔ ''چیئرس، اور عزت مآب الزورا اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اپنی کھائی میں پڑا پڑا ایک جوکر کو چھلانگ لگا کر اپنے اوپر سے گذرتے دیکھتا رہوں گا جب تک وہ میری طرح کھائی کی نذر نہ ہو جائے۔''

''جانے تم کس کھائی کی بات کر رہے ہو۔'' الزورا ہنسا۔ ''ایک جوکر کا سارا کھیل ہی بناوٹی ہوتا ہے۔''

☆☆☆

گیلارڈ ہوٹل

— نسیم بن آسی

یہ کیسے ممکن ہے کوئی جنگل کو دیکھے اور پیڑوں کی بھیڑ کو نظر انداز کر دے۔ جنگل کا تصور تو انھیں پیڑوں سے ہے۔ جب تک پیڑوں کا شاداب جھنڈ پھیل نہیں جاتا، زمین کا موسم نہیں بدلتا جڑوں کی تو خیر کوئی بات نہیں، وہ کبھی نظر نہیں آتیں لیکن شاخوں اور پتیوں کا تو جنگل سے صاف رشتہ ہے۔ پیڑ اپنی وسعت کے اصول میں جنگل ہی کا ایک حصہ ہیں اور تنہا پیڑ بھی اپنے آپ میں پورا جنگل ہوتا ہے لیکن اس کا تحفظ اور آزادی جنگل کے بغیر ممکن نہیں۔

میں کمرے میں بیٹھا دھیرے دھیرے غائب ہو رہا تھا— ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب میرا وجود تھکاوٹ یا ذہنی آسودگی کے باعث اونگھنے لگتا ہے۔ رات دیر سے سونے کا اثر تھا۔ باہر کی دھوپ پیڑوں کی شاخوں سے ہوتی ہوئی کھڑکی کے ذریعہ کمرے میں اپنا قبضہ جما رہی تھی۔ سامنے کے مکان سے کوئی مترنم آواز فضا میں منتشر ہونے لگی اور میرے اندر کی غنودگی اپنے آپ میں معدوم ہوتی چلی گئی۔

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے اپنی زندگی قرینے سے ترتیب دینے کے لیے مجھے بہت وقت چاہیے جو میرے پاس کبھی نہ ہوگا۔ اس نئے شہر میں آنے کے بعد میں نے جن مقامات کو سب سے پہلے دیکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان میں گیلارڈ (Gay Lard) ہوٹل بھی تھا۔ کچھ نام ایسے ہوتے ہیں جو بلا وجہ اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جب میرے میزبان نے بتایا، اس ہوٹل کے نام پر ایک بہت بڑا علاقہ بھی آباد ہے تو میرے تجسس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ معلوم ہوا جہاں یہ ہوٹل ہے، پہلے وہاں کچھ نہ تھا۔ ہر طرف میدان، جنگل اور جھاڑیاں تھیں۔ آس پاس چھوٹے بڑے پہاڑ تھے۔ بعد میں وہاں کل کارخانے لگ گئے۔ ملازمین کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہوٹل معرض وجود میں آیا۔ پھر آہستہ آہستہ جنگل صاف کر کے لوگوں نے وہاں مکان بنائے۔ پھر یہ علاقہ گیلارڈ ہوٹل کے نام سے مشہور ہو گیا۔

مجھے یاد ہے، مرے والد جس نئے شہر میں جاتے تھے وہاں کی روداد اپنی ڈائری میں ضرور لکھتے تھے۔ ان کے پاس ایک ضخیم ڈائری تیار ہوگئی تھی جو اُن کی الماری میں پڑی گرد آلود ہوتی رہتی تھی۔ میرا ارادہ اسے کتابی شکل میں شائع کرانے کا تھا لیکن ایک رات زور کی بارش ہوئی، ہواؤں کا جھکڑ بھی چلا۔ میرا بوسیدہ مکان پانی سے بھر گیا جہاں ان کی بہت سی کتابیں اس طوفان میں تلف ہوگئیں۔ یہ ڈائری بھی ضائع ہوگئی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اُس ہوٹل کو ضرور دیکھوں گا۔ اور اپنے والد کی طرح اپنے تاثرات قلم بند کروں گا۔ میں بستر پر پڑے اپنی کتابوں، کاغذوں اور سگریٹ کے پیکٹوں کو درست کرنے لگا، رات ماریہ نے پلنگ پر جو چادر بچھائی تھی، اس پر سلوٹیں آگئی تھیں جو میری طبیعت پر گراں گزر رہی تھیں میں انھیں بھی ٹھیک کرنے لگا۔

اتنے میں ماریہ چائے لے کر آگئی لیکن چائے دیکھتے ہی موڈ خراب ہوگیا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح پیالی کو لبالب بھر کر لائے گی اور چائے ٹیبل پر رکھتے ہی کچھ ضرور چھلک جائے گی۔ میں اسے کتنی ہی بار کہہ چکا ہوں، کپ کو تھوڑا خالی ہی رکھا کرو لیکن اس کی کھوپڑی میں عقل کہاں۔

کیا بات ہے؟

کچھ نہیں۔

ازدواجی تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لیے بہت سی باتیں نظر انداز کردینی ہوتی ہیں۔ اس دن وہ گلابی رنگ کا بلاؤز اور ہلکے ہرے رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی جو اس کی گوری اور صحت مند جلد پر خوب جم رہی تھی۔ اس لباس کی وجہ سے اُس کی ڈھلتی جوانی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

ماریہ نے چائے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ میں سامنے پڑے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ بید کا بنا ہوا یہ صوفہ اپنے ماڈل میں ایک دم نیا تھا۔ اس پر نیلے کپڑے کے کشن تھے جن پر کشمیری کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ اتنے میں ہوا کا ایک ہلکا جھونکا آیا اور دروازے اور کھڑکیوں پر لگے ہرے رنگ کے پردے ہلنے لگے۔

چائے دیر سے میرے حواس پر حاوی تھی۔ اصل میں ہم چائے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اُس کے بغیر زندگی ادھوری معلوم ہوتی ہے لیکن چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہی میری طبیعت جھنجلا گئی۔ چائے بہت میٹھی تھی۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

کتنی چینی ڈالی ہے—؟

کیوں، کیا بات ہے؟

میں ہمیشہ کہتا ہوں، کم چینی ڈالا کرو۔ مجھے ذیابیطس کا خطرہ لاحق رہتا ہے لیکن تمھیں اس کی پرواہ کہاں؟

اس کے بعد تو ہم دونوں میں جھگڑا ہی ہو گیا اور پھر ثابت ہو گیا کہ عورت کو آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا ہے جس کے باعث اسے کوئی بات سمجھانا عبث ہے۔

میں نے چائے پیتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

میری نگاہ سڑک پر گئی، کوئی ٹھیلا گاڑی ٹریفک کی وجہ سے رک گئی تھی۔ اس میں دو گدھے جُتے ہوئے تھے۔ سامان کا وزن ان کی قوت سے زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے میزبان نے بتایا تھا کہ کراچی میں اسے گلشن گاڑی کہتے ہیں۔ اس پر میں مسکرادیا تھا۔ یہاں کے لوگوں کی حسن مزاجی کی داد دینی چاہیے۔ ساری تعریف اس خدا کی جس نے گدھوں کو بنایا اور جو آدمی کے پاس آکر اور بھی بڑے گدھے بن گئے۔

میں چائے کے گھونٹ بادلِ ناخواستہ حلق سے انڈیلتے ہوئے گیلارڈ ہوٹل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے ماریہ سے بات کی۔ مجھے امید تھی، وہ تیار ہو جائے گی لیکن وہ ٹال مٹول کر رہی تھی لیکن میں نے اس جگہ کی تاریخی اہمیت اُسے سمجھائی تو وہ راضی ہو گئی پھر پورے گھر میں ہوٹل دیکھنے کی خبر پھیل گئی۔ بچے بھی چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میری دونوں بھانجیاں سازینہ اور نازینہ بھی ساتھ لگ گئیں۔ پوری ایک پلاٹون تھی جسے لے کر ہم گھر سے باہر نکل آئے۔ اب ہم سڑک پر سواری گاڑی کے لیے مارے مارے پھر رہے تھے۔

اس جگہ سے پک اَپ ملے گی۔

سازینہ کے اس مشورے کے مطابق ہمیں سڑک پار کرنی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب اور جہاں سڑک پار کرنے کی سوچیے، اسی وقت اور وہیں گاڑیوں کا تانتا لگ جاتا ہے، اور آدمی اپنے آپ کو اور گاڑیوں کو کوسنے لگتا ہے۔ پھر کراچی میں تو آدمی کم اور گاڑیاں زیادہ نظر

آتی ہیں۔ اُس دن بھی ایسا ہی ہوا۔ ہر طرف بسوں ٹھیلوں اور کاروں کی لائنیں لگ گئیں۔ گاڑیوں کا تانتا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ زمین پر گاڑیاں اور آسمان پر سورج آدمی جائے تو جائے کہاں۔ بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ہوا کی بیٹیوں کا چہرہ تپ کر تانبا ہو رہا تھا۔ اوپر سے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں جوان کے چہروں کو بے رونق بنا رہی تھیں۔ مجھے موسم کی بے رحمی پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ صفیہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

ابو سڑک خالی ہوگئی۔

اور ہم سب لپک کر سڑک کے پار ہو گئے۔ بہت دیر تک کوئی پک اپ نہیں آئی، معلوم ہوا، پک اپ والوں نے ڈیزل کی قیمت میں اضافہ کے احتجاج میں ہڑتال کردی ہے۔ اب ہم ایک دوسرے کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ماریہ کا چہرہ یکایک اُداس ہوگیا۔ میرے جی میں آئی۔ اُس کی اُداسی دور کرنے کے لے اُسے گدگدادوں لیکن بچوں کا خیال آگیا۔ اپنے کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ سوچ کتنی معاون ثابت ہوتی ہے۔

اچانک سلیٹی رنگ کی ایک ٹیکسی ہمارے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

کہاں جانا ہے؟

گیلارڈ ہوٹل۔

پچاس روپے ہوں گے۔

خان صاحب! واجب بولیے۔

اچھا پینتالیس روپے دے دیجیے گا۔

عرفان ٹیکسی کے دروازے کھولنے لگا۔ میں نے اُسے ڈانٹ دیا۔

کم بخت! ابھی تو میری کمائی کھا رہا ہے۔ خود کمائے گا جب پتہ چلے گا، روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ پک اپ صرف پچیس روپے میں وہاں پہنچا دیتی ہے۔

ماریہ اور دوسری لڑکیاں اڑ گئیں، اسی سے چلیے نا۔ ہم کب تک انتظار کریں گے—؟

لیکن یہ بہت زیادہ مانگ رہا ہے۔ میری اس بات پر سب خاموش ہوگئے۔ اب وہ بول رہے تھے نہ ٹیکسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر پیوست ہوگئی۔ میں اپنی کم مائیگی پر کفِ افسوس ملنے لگا۔ میں نے پھر ٹیکسی والے کی طرف دیکھا۔

خان صاحب! کچھ اور کم کرو۔

لیکن وہ آگے بڑھ گیا۔ ساری لڑکیاں جواب سے پہلے چہرہ تھیں، صرف آنکھیں ہی آنکھیں نظر آرہی تھیں جن میں عجیب بے بسی اور لاچاری تھی۔

اب ہم کسی دوسری ٹیکسی کا انتظار کررہے تھے جو آبھی رہی تھی، نہیں بھی۔ بعد میں کتنی ٹیکسیاں آئیں لیکن سب بھری ہوئی تھیں اور ہمیں بے کار کھڑا رہنے کا احساس دلا کر گزر گئیں— ہمارے بعد بھی وہاں کچھ لوگ آگئے جس سے اچھا خاصہ مجمع لگ گیا۔ میں بار بار ماریہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو اس ہجوم میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کررہی تھی۔ جب ہی ایک ٹیکسی آئی جو ایک دم خالی تھی لیکن جب تک ہم اس کی طرف بڑھتے دوسرے اُس پر قابض ہوگئے اور وہ اُنہیں لے کر آگے بڑھ گئی۔ ہم پھر کسی اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگے۔

دیر تک کوئی ٹیکسی نہیں آئی۔

اس سے تو اچھا ہے، ہم اس پروگرام کو ہی ملتوی کردیں۔

پھر کہاں چلیں گے—؟

اس پہاڑ پر جہاں مزار شریف ہے۔ یہ قریب بھی ہے۔ پیدل ہی جاسکتے ہیں۔ کہتے ہیں، کوئی خلوصِ نیت سے وہاں جائے تو مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

ماریہ کی باتیں سن کر میرا دماغ ماضی کی ہوا میں اڑنے لگا۔ کبھی کبھی ہوائیں اتنی تیز ہوجاتی کہ وہ پتے کو پیڑ سے ایک جھٹکے میں الگ کردیتی۔ میرے اندر بچپن کے بہت سے پتے ایک ساتھ پھڑ پھڑانے لگے— بچپن کی ایک بات مجھے اب بھی یاد تھی۔ ہمارے محلے میں ایک بابا آیا کرتے تھے۔ اُن کی ہم بہت عزت کرتے تھے۔ ان کی لمبی سفید داڑھی ہمیں بہت مرعوب کرتی تھی۔ اُن کی ہر بات پر ہم آنکھ بند کرکے یقین کرلیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا، رات کو سوتے وقت سر ہانے بندر کی دم رکھنے سے دماغ تیز اور چنچل ہوجاتا ہے۔ ایسا بچہ امتحان میں کبھی فیل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد میں نے ایک مداری سے بندر کی دم خرید لی تھی۔

کہاں کھو گئے—؟

کہیں نہیں۔

پھر واپس چلو۔

لیکن میرے حواس پر گیلارڈ ہوٹل حاوی تھا جسے میں کسی بھی قیمت پر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ماریہ کے خیالات کو بدلنے کے لیے توہم پرستی پر ایک خاصی تقریر جھاڑ ڈالی۔ اور اُسے

گیلارڈ ہوٹل کی تاریخی اہمیت سے آگاہ کیا۔ کچھ پس وپیش کے بعد وہ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

کچھ دیر بعد ایک ٹیکسی آکر رُکی۔ وہ خالی تھی۔ میں نے اُس کا کرایہ دریافت کیا۔ اُس نے پہلے والے سے کم بتایا۔ ہم فوراً اُس میں سوار ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ہماری ٹیکسی دوسری سڑک پر آگئی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ اُن میں عمارتی سامان، فرش اور دیواروں پر لگانے کے لیے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور گھر گرہستی کے لیے سنگ مرمر کے خوب صورت نقش ونگار والے ظروف رکھے ہوئے تھے۔ ہم سب کھڑکی کی طرف جھک گئے اور متجسس نگاہوں سے آس پاس کے ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ ایک سنیما گھر کے سامنے کھڑے کچھ لوگ اُس کے پوسٹروں کو دیکھ رہے تھے۔ بڑی بڑی دکانیں، شفا خانے اور جدید طرز کی عماتیں ہم استعجاب سے دیکھ رہے تھے۔ ایک چوراہے پر بھیڑ تھی جس کے باعث ہماری ٹیکسی کو رکنا پڑا لیکن جلد ہی راستہ صاف ہوگیا۔ میں نے کیمرے کو بیگ سے نکال لیا اور درست کرنے لگا۔ میرے والد صاحب بھی کسی نئے مقام پر جاتے تھے، یہ کیمرہ اُن کے ساتھ ضرور ہوتا تھا۔ جب وہ بستر مرگ پر تھے، انہوں نے مجھے بلا کر یہ کیمرہ میرے ہاتھ میں دیا تھا—

بیٹا! اب میں جارہا ہوں۔ تم اسے سنبھالو۔ میرے کام کو اب تم انجام دینا۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی۔ بس یہیں تک۔ ہم ٹیکسی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ پک اپ کی ہڑتال اور مسافروں کی بھیڑ کی وجہ سے وہ پھر جلد ہی بھر گئی۔ اب ہم کھڑے اجنبیوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میں نے ایک دکان دار سے پوچھا—

گیلارڈ ہوٹل کہاں ہے؟

یہی تو ہے۔

گیلارڈ ہوٹل، جس کے نام پر یہ علاقہ آباد ہے۔

معلوم نہیں۔

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے دکان دار سے دریافت کیا جو بیڑی سلگا کر ناک سے دھواں نکال رہا تھا—

مجھے بھی معلوم نہیں۔

کچھ فاصلے پر ایک آدمی نظر آیا جو بوشرٹ پتلون، اور ٹائی میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر کے بال گردن پر جھول رہے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ میں نے اُس کی شکل وصورت اور حلیہ سے اندازہ لگایا، شاید اُسے معلوم ہو، میں نے اُس سے گیلارڈ ہوٹل کا پتہ پوچھا اور اُس کی طرف پرامید نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُس نے اپنے کالے چشمے کو سر کے اوپر چڑھا لیا اور مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا۔

کس کے پاس اتنا وقت ہے جو اس کے بارے میں معلومات رکھے۔

سورج نصف سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ ہمارے میزبان نے بتایا تھا کہ یہاں اندھیرا ہوتے ہی جرائم پیشہ لوگوں کی نقل وحرکت جاری ہوجاتی ہے۔ اس لیے لوٹنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

ہم دیر تک راہ نوردی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میری بیوی اور بچے پوری طرح تھک گئے اور اب اُن کے قدم مزید چلنے سے انکار کر رہے تھے۔ آخر میں مجھے ایک سفید ریش شخص نظر آیا جو سڑک کے کنارے کسی سوچ میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس سے اپنا تعارف کرایا اور گیلارڈ ہوٹل کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس پر وہ ہمیں لے کر گنجان آبادی سے ہوتا ہوا ایک کشادہ سڑک پر آگیا جس پر کاروں، ٹمپوؤں اور آنے جانے والوں کی کثیر تعداد میں آمد ورفت تھی۔ پھر وہ ایک پارک کے پاس آکر رُک گیا—

وہ سامنے گیلارڈ ہوٹل ہے۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اُس سے رخصت لی۔ گیلارڈ ہوٹل سڑک کے کنارے واقع تھا اور دھوپ میں جل رہا تھا۔ اس کی دیواروں سے معلوم ہوتا تھا، عرصہ دراز سے اُن کی مرمت اور سفیدی نہیں ہوئی ہے۔ اُس کا نام بھی دھندلا ہوگیا تھا اور صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ جگہ جگہ سے دیواروں کا پلاسٹر جھڑ گیا تھا۔ اندر کا حصہ بھی دھواں سے کالا ہوگیا تھا۔ اس کے باہر کوئی بوڑھا ایک خستہ چارپائی پر آدھا لیٹا، آدھا بیٹھا نظر آرہا تھا۔ شاید وہی اس ہوٹل کا مالک تھا۔ اُس کے پاس ہی بیٹھا ایک خارش زدہ کتا ہمیں دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ زبان نکال کر پریشان نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا، اس کے چکتوں کو تھپتھپاؤں— اُس پر ہاتھ پھیروں—؟

یہی ہے تمھارا ہائی وڈ کا جراسک پارک—؟

میں ماریہ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خلاء کی طرف دیکھنے لگا۔ سائنس داں عجیب وغریب دعوے کرتے ہیں۔ اُن کے مطابق کہیں کچھ بھی ضائع نہیں ہوتا۔ ہماری بات چیت، رونا، ہنسا، سب خلاء میں آواز کی لہروں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ہزاروں سال پہلے کے انسانوں کی باتیں بھی سائنسی آلات میں محصور کر کے سنی جاسکتی ہیں۔ ہم اپنے آباء کی آوازوں کو سننے کے لیے ترستے ہیں۔ ان آلات کے ذریعہ ہم اُنہیں دوبارہ سن سکتے ہیں۔ کیا لوگ گیلارڈ ہوٹل کی داستان بھی کبھی سن سکیں گے؟

سڑک کی دوسری طرف گیلارڈ ہوٹل کے مقابل ایک پانچ ستارہ ہوٹل تھا جس کے سامنے نئے ماڈل کی چمکتی کاریں کھڑی تھیں۔ اُس کی پوری عمارت سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی۔ اُس کی گیٹ پر دودھیا برقی ہنڈے نصب تھے۔ جدید انداز کے دروازے پر سنہری کلغی والا دربان سفید قمیص اور پتلون پہنے کھڑا تھا۔ قمیص کے اوپر واسکٹ تھی جس پر بڑے بڑے پھول دار بٹن لگے ہوئے تھے۔ وہ دور ہی سے چمک رہے تھے۔ دروازہ کے زینوں کے دونوں طرف شاداب گملوں کی قطاریں تھیں۔ لان کی سنہری مخملی گھاس پر کچھ غیر ملکی سیاح چہل قدمی کررہے تھے۔

مجھے وہ جانور نظر آ گیا جو پہاڑ جیسی جسامت کا تھا۔ اس کا جبڑا بہت بھاری اور زبان لمبی تھی۔ وہ آگ اُگل رہا تھا۔ وہ جس راستے سے گزرتا تھا، وہاں آگ لگ جاتی تھی۔ جنگل کا پورا وجود جل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دوسری شکل میں تبدیل ہونے لگا۔ اس کے رنگ، حرکات وسکنات میں فرق آنے لگا۔ وہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ وہ ہوا، پانی، آگ اور مٹی سب پر مسلط ہوجانا چاہتا تھا۔ یہاں تک اس نے سورج کو جالیا......

ہم صبح سے بھوکے تھے۔ ہمیں اپنے پیٹوں میں خالی پن محسوس ہورہا تھا۔ میں بچوں اور ماریہ کو لے کر ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ تین چار نوکر میلے کچیلے کپڑوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہیں ہمارے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ جس میز کے پاس ہم بٹھائے گئے اُس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم دوسری خالی میز کی طرف دیکھنے لگے جو کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ دو تین میزیں اور تھیں جن پر لوگ خوردونوش میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد کھانا لگ گیا۔ کھانا بھی کیا تھا، بھنڈی کی سبزی، چاول، دال اور روٹی۔ اس پر بھی بھوک کی وجہ سے وہ ہمیں اچھا معلوم ہورہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے ہرزاویے سے گیلارڈ ہوٹل اور اس کے آس پاس کی تصویریں اُتاریں۔ سورج اپنی آخری منزل کی طرف سے جانے کی تیاری کرر ہا تھا۔ ہم لوگ وہاں سے جلد لوٹنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ میں نے ایک بار پھر گیلارڈ ہوٹل کی طرف دیکھا جس پر شام کی ہلکی ہلکی دھند چھارہی تھی۔۔۔ ہم آگے بڑھتے جارہے تھے۔۔۔اور وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا جار ہا تھا۔

گھر آکر میں نے تصویروں کی دُھلائی کی۔ وہ بہت ہی خوبصورت آئی تھیں لیکن اُن میں بھی گیلارڈ ہوٹل کہیں غائب تھا۔

☆☆☆

راستے بند ہیں سب
(مہدی جعفر کے نام)

—اسرار گاندھی

رات خیمہ زن ہو چکی تھی۔

وہ بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت کی طرف جا رہا تھا۔ چھت پر پہنچ کر وہ چہار دیواری کی آڑ میں بیٹھ گیا تا کہ دوسری چھتوں پر سے دیکھا نہ جاسکے۔ اس نے نظریں آسمان کی جانب اٹھائیں تو دیکھا کہ نیلگوں آسمان میں آگ کی لپٹوں کی سرخی شامل ہو چکی ہے۔ یہ سرخی کئی دنوں سے یوں ہی آسمان کے نیلگوں رنگ کا حصہ بن رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ سرخی آج کچھ زیادہ ہی گہری ہے۔ اس نے اپنی گردن اٹھائی اور چھت کی چہار دیواری کے اس پار دیکھا تو اندازہ ہوا کہ وہ شعلے جو کل تک اس گھر سے خاصے دور تھے آج کافی قریب آ چکے ہیں۔ کل اسے صرف سرخ شعلے ہی دکھائی دے رہے تھے، آج ان شعلوں میں چیخ پکار کی انتہائی دردناک آوازیں بھی شامل تھیں۔ اسے تھرتھری سی لگ گئی۔ فضا میں ایک عجیب طرح کی سنسنی تھی جس کی سنگینی محسوس کی جاسکتی تھی۔

وہ بڑی مشکل سے نیچے اترا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے رقص کر رہے تھے۔ نیچے آ کر اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی کوکنگ گیس کے دو سلینڈر لیے کمرے میں کھڑی ہے۔ اسے بیوی کے ساتھ سلنڈروں کو کمرے میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے بیوی پر سوالیہ نظریں ڈالیں۔

''میں یوں ہی بغیر جدوجہد کے مرجانے کی قائل نہیں ہوں۔'' وہ اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''میں ان حالات میں اس دنیا سے تنہا نہیں جاؤں گی بلکہ ان گیس سلنڈروں کی مدد سے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے کر جاؤں گی۔''

وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے بس ایک ٹک بیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک جھرجھری سی لی اور اپنے حواس میں پوری طرح سے واپس آ گیا۔ وہ آگے بڑھا اور بیوی کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم بے حد نڈر ہو لیکن شاید آج اس کی ضرورت نہ پڑے۔''

''دہشت بھری آوازیں تو کافی قریب آتی جا رہی ہیں۔'' وہ بولی۔

''ہاں شور اور شعلے تو کافی قریب آ چکے ہیں لیکن اتنے قریب بھی نہیں کہ اس گھر تک آج ہی پہنچ جائیں۔ ممکن ہے کہ کل رات وہ لوگ اس کالونی کو اپنا نشانہ بنائیں۔ ویسے بھی اس بڑی کالونی میں ہمارے جیسے گھر ہی کتنے ہیں۔ بس چار یا پانچ۔ انہیں نیست نابود کرنے میں وقت ہی کتنا لگے گا۔ ہمارے نام تو آسانی سے پہچان لیے جاتے ہیں۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا جہاں اب صرف سرخی ہی سرخی باقی رہ گئی تھی، آسمان کا نیلگوں رنگ رخصت ہو چکا تھا۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اس نے بیوی کی طرف دیکھا جو دھیرے دھیرے سلنڈروں کو کھینچتی ہوئی کچن کی طرف واپس لے جا رہی تھی۔

وہ بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔ پھر چند منٹوں کے بعد اس کی بیوی بھی وہیں آ گئی۔

''کیا نفرت اتنی بھی بڑھ سکتی ہے کہ انسان اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق ہی نہ رہا، ہاں بس جانور اپنے نام نہیں رکھتے اور یہ دوسری بات ہے کہ نام کبھی کبھی بڑے خلفشار کی وجہ بنا دئے جاتے ہیں۔'' وہ دھیرے سے بولی جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہو۔

''نفرت اپنے آپ کبھی نہیں بڑھتی۔ بڑھائی جاتی ہے، بے حد منظم طریقے سے۔ یہ نفرت اس نظام زندگی کی دین ہوتی ہے جہاں لوگ اپنے سوا کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں؟''

''ہاں شاید تم سمجھ نہ سکو کہ سادہ دلی انسان کو بہت سی باریکیوں کی سمجھ سے بے نیاز کر دیتی ہے۔'' وہ اسے سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا ہوا بولا۔ پھر کرسی پر سے اٹھ کر اضطراری انداز میں ٹہلنے لگا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک لمحے کے لیے رکا اور بے سلاخوں والی کھڑکی کو کھول کر تھوڑی سی گردن باہر نکالی اور چاروں طرف کا جائزہ لینے لگا۔

دوسری منزل پر ہونے کی وجہ سے اسے پوری کالونی صاف نظر آ رہی تھی۔ نیم تاریکی میں اس پوری کالونی کو قدرے غور سے دیکھنے کی کوشش کی تو سناٹے میں آ گیا۔ کالونی کے احاطہ میں کئی پرچھائیاں متحرک تھیں۔ اس نے ان پرچھائیوں کو پہچاننے کی کوشش کی لیکن تاریکی آڑے آئی اور وہ انہیں پہچان نہ سکا۔

اس نے سوچا کہ شاید یہ لوگ کالونی سے باہر کے ہوں، لیکن یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ کس مقصد سے دروازے دروازے جا رہے ہیں؟ اسے الجھن سی محسوس ہوئی۔

اس نے اپنی نظریں اس کی طرف سے ہٹالیں اور سامنے والے خاں صاحب کے گھر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں پوری طرح سے سناٹا تھا۔ شاید وہ لوگ سرِ شام ہی کہیں اور چلے گئے تھے۔

یہاں سے چلا تو اسے بھی جانا چاہئے تھا لیکن وہ اپنے پڑوسی اور چند دوسرے لوگوں کے سمجھانے بجھانے کی وجہ سے ٹھہر ارہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس سے یہ غلطی ہوئی ہے۔

خاں صاحب کے گھر سے اس کی نظریں ہٹیں تو پھر ان پر اسرار پرچھائیوں پر جا ٹکیں جو اب کالونی کے بیچوں بیچ بنے ایک چھوٹے سے پارک میں براجمان تھیں۔ اسے لگا کہ جیسے وہاں کوئی میٹنگ ہو رہی ہو۔

وہ کھڑکی بند کر کے مڑا تو دیکھا کہ بیوی لیٹ چکی ہے۔ وہ بھی اس کے پاس آ کر لیٹ گیا۔

اب بھی کہیں دور سے چیخ پکار کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

اس نے شور کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے اپنے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ پھر اس کی نگاہیں بک شلف پر ٹک گئیں۔ اتنی بہت سی کتابیں۔ ان کتابوں میں کیا کچھ نہیں لکھا تھا۔ لیکن کیا واقعی ان کتابوں کا کچھ مطلب بھی ہے؟ کیا یہ کتابیں کسی خاص لمحے میں اپنی معنویت کھو دیتی ہیں؟

اس نے سوچا کہ ان کتابوں کے درمیان سے اس کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں بھی تو وجود میں آئی ہیں۔ کتنی محنت کی تھی اس نے ان کتابوں کے لکھنے میں، لیکن فائدہ کیا ہوا؟ کیا یہ آگ کے شعلوں کو بجھا سکیں۔ چیختے، تڑپتے اور زخموں سے چور لوگوں کا مرہم بن سکیں؟

اسے لگا کہ اس نے اپنی اہم زندگی کا خاصہ وقت ضائع کر دیا۔

اس نے محسوس کیا کہ جیسے ایک گہری مایوسی اس کے اردگرد دھیرے دھیرے اپنا شکنجہ کستی جارہی ہو۔

اس نے سوچا کہ کل تک کتنے لوگ مر چکے تھے کتنے آج مر جائیں گے۔ کتنی قیمتی چیزیں کل تک راکھ ہو چکی تھیں کتنی چیزیں آج جل کر سیاہ ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ کل کتابوں کی یہ شلف باقی نہ رہے اور اس کی جگہ پہ راکھ ہی راکھ رہ جائے اور کون جانتا ہے کہ وہ خود کہاں ہو؟ ہو بھی یا نہ ہو۔

اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کے گھر میں خوف، بے بسی اور نفرت کے ناگ چھپے بیٹھے ہیں اور اسے جکڑنے کے لیے اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

اس نے رات بڑی بے سکونی میں گزاری۔

اس نے کئی بار کوشش کی تھی کہ وہ بیوی کے جسم میں پناہ لے لے لیکن یہ کیسی یخ زدگی تھی جو اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ نہ کہیں کوئی جنبش، نہ کسی طرح کی گرمی جیسے وہ غیریت بھری لاش ہو گیا ہو۔

پھر کسی کے دروازہ کھٹکھٹانے پر ہی وہ اٹھا۔

''کون ہو سکتا ہے اتنی صبح صبح۔'' وہ دھیرے سے بدبدایا۔

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔ ساتھ ہی کسی کی آواز آئی۔

''سو رہے ہو کیا؟''

یہ آواز اس کے پڑوسی کی تھی۔

اس نے آہستہ آہستہ چل کر دروازہ کھول دیا۔

''کہو کیسے ہو؟'' پڑوسی نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

وہ کچھ بولا نہیں بس چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

پڑوسی نے دھیرے سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور دبے لہجے میں بولا۔

''تم آج کہیں اور چلے جاؤ، میں نے تمہیں صرف کل تک کے لیے یقین دلایا تھا۔''

وہ پھر کچھ نہیں بولا۔ پڑوسی رخصت ہونے والے انداز میں مسکرایا اور اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ واپس کمرے میں آیا تو دیکھا بیوی جاگ رہی ہے۔

''کون تھا؟''

''بغل والے''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''آج کہیں اور چلے جاؤ، اب گارنٹی نہیں لی جاسکتی۔'' وہ رک رک کر بولا۔

''میرے خیال میں وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں، بے سبب جان دینے کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔''

''ہاں سوچیں گے۔''

وہ باتھ روم کی طرف چل پڑا۔

ناشتہ کرتے وقت اس کی نظریں وال کلاک کی طرف اٹھیں تو دیکھا کہ نو بج رہے ہیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا۔

''کہاں؟''

''بس ذرا نیچے۔ مسز بنرجی کے پاس۔''

''کوئی اور موقع ہوتا تو وہ چڑھ جاتی مگر اس وقت وہ کچھ بولی نہیں۔ بس بیزار آنکھوں سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

گراؤنڈ فلور پر ہُو کا عالم تھا۔ ہر طرف کھڑکیاں اور دروازے جو کھلے رہ کر ڈھارس دیا کرتے تھے، آج لوگوں نے سختی سے بند کر رکھے تھے۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو کہیں دور دور تک وردی والا کوئی پہرے دار نظر نہ آیا۔ وہ سرعت سے مسز بنرجی کے دروازے پر پہنچا اور دروازے کو آہستہ سے کھٹکھٹایا۔

دروازہ کھلا اور وہ تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں بیٹھی مسز بنرجی کینوس پر کچھ پینٹ کر رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی انھوں نے برش رکھا اور اٹھ کر اس کے پاس آگئیں۔

''کیا پینٹ کر رہی تھیں؟''

''ایسے ماحول میں کیا پینٹ کیا جاسکتا ہے؟'' انھوں نے انگلیوں سے رنگ صاف کرتے ہوئے الٹا سوال کر لیا۔

کچھ جواب دینے کے بجائے وہ کمرے کی دیواروں کا جائزہ لینے لگا جن پر مسز بنرجی کی تخلیق کی ہوئی بہت سی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ مسز بنرجی کی

گرفت رنگوں پر بڑی مضبوط ہے اور انھیں معلوم تھا کہ رنگوں کے لہجے میں بات کیسے کہی جاتی ہے۔ ان کی کئی تصویریں میجک ریلزم کا شاہکار سمجھی جا رہی تھیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' وہ اسے دیکھتی ہوئی بولیں۔

''کیا جواب دوں آپ کو؟ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ میں کس ذہنی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں۔'' وہ اسے رحم آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اس خاموشی کو مسز بنرجی نے ہی توڑا۔

''تمہیں معلوم ہے، رات میں نے کھڑکی کھولی تو دیکھا کہ تمہارا پڑوسی چھ سات لوگوں کو لیے ہوئے کالونی کے لوگوں سے مل رہا ہے۔ بعد میں اس نے سامنے والے پارک میں چھوٹی سی میٹنگ بھی کی۔

''میرا پڑوسی؟''

''ہاں تمہارا پڑوسی، تم شاید نہیں جانتے کہ وہ انتہا پسند ہے۔ اس کے پاس نفرت کے ڈھیروں بیج ہیں، جنہیں بونے کے لیے وہ موقع تلاش کرتا رہتا ہے۔''

اسے اچانک یاد آیا کہ ایک بار اس کے پڑوسی نے کسی بات پر اس سے کہا تھا کہ جب دیش ترقی کی راہ پر آگے بڑھتا ہے تو کبھی کبھی بہت سے بے گناہوں کی بلی چڑھ جاتی ہے۔ دیش کی ترقی بے گناہوں کی موت سے زیادہ اہم ہے۔

''صبح وہ میرے پاس آیا تھا۔'' وہ ماضی سے حال میں آ کر بولا۔

''کیوں؟ کیا کہہ رہا تھا؟''

''آج یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ۔''

اس کی بات سن کر مسز بنرجی کو چپ سی لگ گئی۔ پھر دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اس خاموشی پر پہلا کنکر مسز بنرجی نے ہی پھینکا۔ ''تمہیں وہ صبح یاد ہے نا جب اچانک زہریلی گیس پوری فضا میں پھیل گئی تھی اور لوگ اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ موت سانسوں کی راہ سے ان کے جسموں میں اتر رہی تھی۔ لوگوں کا ذہن اتنا بے سدھ ہو گیا تھا کہ مائیں اپنی اولاد کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگی جا رہی تھیں۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ دوسری طرف بہت سے لوگ یہ دیکھے بغیر کہ کون کیا ہے، ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔''

مسز بنرجی نے ایک لمحے ٹھہر کر گہری سانس لی اور گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔
''اس وقت صرف انسان زندہ رہ گیا تھا، باقی سب کچھ مر گیا تھا۔ آج صرف انسان مر گیا ہے باقی سب کچھ زندہ ہے۔ کیا ہو گیا ہے اس شہر کو؟ پہلے ایسے حادثات تو کبھی نہ ہوئے تھے، سنو، میری بھی رائے یہی ہے کہ شام کو جب تھوڑی دیر کے لیے پہرے ہٹیں تم کسی محفوظ جگہ چلے جاؤ۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔''
وہ بے بسی سے مسز بنرجی کو دیکھتا رہا۔
''تمہارا یہاں رہنا ہم دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔'' وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولیں۔
''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، میں خود بھی حالات کو سمجھ رہا ہوں۔ مجھے جان بچانے کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر جانا ہوگا، اس سے بڑھ کر اذیت اور کیا ہو سکتی ہے۔ مسز بنرجی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ایک تناور درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ لیکن لوگ یہ بھول رہے ہیں کہ اس درخت کو اکھاڑنے کے بعد جو جگہ خالی ہوگی، وہ اتنی زہریلی ہو جائے گی کہ وہاں صرف اور صرف کٹیلی جھاڑیاں ہی اگ سکیں گی۔ زمین بھی اپنا بدلہ لیتی ہے۔''
مسز بنرجی اس کی بات سن کر چپ رہیں، لیکن ان کے چہرے سے ان کی تشویش بھری ذہنی کیفیت پوری طرح عیاں تھی۔
کچھ دیر بعد وہ اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔
شام ہو چلی تھی اور پہرے ایک گھنٹے کے لیے ہٹا لئے گئے تھے۔
وہ دونوں گھر میں تالا لگا کر نیچے اترے اور سیدھے مسز بنرجی کے دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔
وہ باہر نکلیں اور ان لوگوں سے اپنی کار میں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا جو دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر لگی ہوئی کھڑی تھی۔
کار میں بیٹھنے سے پہلے ان لوگوں نے اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ دیر تک اسے دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔
مسز بنرجی کو ان آنکھوں میں ملال کے سائے تیرتے ہوئے نظر آئے۔ انہیں اپنا دل بھی ڈوبتا ہوا محسوس

پھر وہ کار میں بیٹھ کر مسز بنرجی کو اپنی منزل کا پتہ سمجھانے لگے۔
راستے بھر گہری خاموشی نے کنڈلی مار رکھی تھی۔ کوئی بیس پچیس منٹ بعد اس نے مسز بنرجی سے کار روک لینے کو کہا۔

''ارے یہاں کہاں؟ تمہیں تو اور آگے جانا ہے۔'' وہ کار روکتے ہوئے بولیں۔

''ہاں جانا تو ہے، یہاں سے ہم دونوں ٹہلتے ہوئے چلے جائیں گے۔ یہاں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ارے بھئی یہاں کہاں اترو گے۔ میں تمہیں تمہارے عزیز کے گھر پہنچائے دیتی ہوں۔''

''نہیں مسز بنرجی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی اسی خطرہ سے دو چار ہوں، جس خطرے سے نکال کر آپ مجھے یہاں لائی ہیں۔ یہاں سے واپس چلی جایئے۔ میں بھی آپ کو کھونا نہیں چاہتا۔''

وہ تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ اچانک ان پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ مسز بنرجی نے اپنی کار آگے بڑھائی اور دھیرے دھیرے یوٹرن (U Turn) لیتی ہوئی واپس لوٹ پڑیں۔ وہ دونوں اس وقت تک کار کو دیکھتے رہے جب تک کہ وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

وہ دونوں بوجھل مگر جمے جمے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے کاندھوں پر شولڈر بیگ لٹکے ہوئے تھے، جس میں انھوں نے گھر سے نکلتے وقت اپنے کچھ قیمتی سامان رکھ لیے تھے۔ انہیں قیمتی سامانوں میں اس کی نئی کتاب کا مسودہ بھی تھا۔

اگلے دن اس نے اخبار میں پڑھا کہ رات کچھ لوگوں نے مشہور مصور مسز بنرجی کی کار میں آگ لگا دی۔ اس نے سوچا کہ شاید انہیں بچانے کے لیے مسز بنرجی کو یہ سزا دی گئی ہے۔

کوئی پندرہ دن بعد ایک صبح انہیں معلوم ہوا کہ شہر کو پہرے سے مکمل طور پر نجات مل گئی ہے۔
وہ گھر سے نکلا تو اس کا شیو بری طرح بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ وہ ارد گرد کو اس طرح دیکھتا چل رہا تھا کہ جیسے وہ کسی اجنبی شہر میں داخل ہو گیا ہو۔

سیکڑوں بار کی دیکھی ہوئی چیزیں اسے دوسری نظر آرہی تھیں۔ وہ تمام خطروں سے بے نیاز بس اپنی دھن میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔

پھر وہ راستہ بھٹک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس راہ پر وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ جانے کتنے اور ہیں جو بھٹک کر اجنبی اور خطرناک راہوں پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

اس بھٹکاوے کے درمیان اسے مسز بنرجی بڑی شدت سے یاد آتی رہیں۔

☆☆☆

یہ تنگ زمین

— ترنّم ریاض

میں نے جب اپنے خریدے ہوئے خوبصورت کھلونوں کو ڈھیر کی شکل میں لاپرواہی سے ایک کونے میں پڑا ہوا دیکھا تو مجھے دکھ سا ہوا۔ یہ کھلونے کتنے چاؤ سے لائی تھی میں اس کے لیے۔ یہ چھوٹا سا پیانو ...... یہ جلترنگ ...... یہ چھوٹی سی گٹار، چہکنے والی ربر کی بلبل، ٹیں ٹیں بولنے والا طوطا، اور ڈرم بجاتا ہوا ٹیڈی بیئر۔ اور سب سے بڑھ کر یہ Synthesisor جس میں سو قسم کی دھنیں تھیں، جن سے کئی اور دھنیں بن سکتی تھیں۔ جس میں موسیقی کے ہر آلے کی آواز تھی۔

مگر اس نے انھیں چھوا تک نہ تھا۔ وہ تو ایسے کھلونوں کا عاشق تھا۔ کیا وہ خود کو اب میرا نہیں سمجھتا یا اب اسے مجھ سے محبت نہیں رہی۔ وہ جسے میں نے دل کے ایک ٹکڑے کی طرح برسوں سینے میں چھپائے رکھا۔ وہ جس نے میری مجروح ممتا پر اُس وقت اپنی معصومیت کا پھاہا رکھا تھا جب میرے دامن میں کھلنے والا پہلا پھول چند سیکنڈ کے بعد ہی مرجھا گیا تھا۔ جب میرے ہونٹوں پر لوریاں صدا پانے سے پہلے ہی بے سُر ہو گئی تھیں اور روٹھی ہوئی نیند کو میں نصف شب تک رو رو کر، کروٹیں بدل بدل کر منانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ تب ایک سرد رات کے گیارہ بجے میرے شوہر اسے گود میں لیے ہوئے لوٹے۔ اس نے ٹوئیڈ کا دھاریوں والا ننھا سا پھرن پہن رکھا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی غیر معمولی لمبائی والی منی منی پلکیں پھڑ پھڑا کر کسی روبوٹ کی طرح جلدی سے کہا تھا:

''آنٹی مت لوئیے۔ میں آگیا۔ اب مت لوئیے۔''

کہ اس کے انکل جنھیں وہ انکل جی کہتا تھا اسے راستہ بھر یہ ہی سکھا کر لائے تھے۔ میں مسہری سے اٹھ کر آنسو پونچھتی ہوئی ان کے قریب گئی اور اسے گود میں لے کر سینے میں چھپالیا۔ اُس کے سردی سے ٹھٹھرے چہرے کو میں نے جلتے ہوئے کلیجے سے لگالیا۔ میرے دل سے خون [illegible] گیا۔ اُس کے گھنگھریالے بالو[illegible] سے دھو دیا۔

''نہیں روؤں میں؟ کیا تم میرے پاس رہو گے۔ اپنی ماما کے پاس نہیں جاؤ گے؟ آنٹی کے ہی پاس رہ جاؤ گے بولو؟''

''ہاں آنتی پاش رہ جاؤں گا۔ لوج لوج مجھ کو بکی اور چال کیٹ دو گے؟''

اس نے اپنا ادھ چبا چاکلیٹ منھ میں ڈالنے کی کوشش میں اپنے گال پر مل لیا اور خرگوش کی سی تیزی سے ادھر اُدھر ہلا کر پوچھا۔ پھر پھرن کی اُس جیب میں ہاتھ ڈال دیا جس میں کچھ اور چاکلیٹ اور بسکٹ تھے۔

میری تڑپتی ہوئی ممتا کو صبر آ گیا۔

وہ میری بہن کا بیٹا تھا اور میرے شوہر بظاہر میری تڑپ کو بہلانے اور اصل میں خود اپنے دل کے قرار کی خاطر اُس دن اُسے اُس کے گھر سے لے آئے تھے۔ اس کی قربت پا کر میں بھول گئی کہ میری ممتا کے ساتھ اتنا بڑا ناخوشگوار حادثہ پیش آیا تھا۔ بھولی نہیں بھی تھی مگر بہل ضرور گئی تھی۔ وہ مہینوں میرے پاس رہتا اور کبھی اس کی امی اسے لینے آتی تو باقاعدہ وعدہ کر کے جاتا کہ کب لوٹے گا۔ پھر میرے پاس آنے کے لیے ان کی ناک میں دم کر دیتا اور طے شدہ وقت سے پہلے ہی چلا آتا۔ اس کی ماں بھی اسے کچھ زیادہ نہ روکتی کہ میرا درد وہ جانتی تھی۔

وہ واپس آ جاتا تو بہار آ جاتی گھر میں۔ اس کی عادتیں بھی دل موہ لینے والی تھیں۔ فطرت کا اس قدر عاشق کہ ہر وقت باہر لان میں کھیلتا۔ کمروں میں تو جیسے اسے اپنا آپ مُقیّد محسوس ہوتا۔ میری انگلی پکڑ کر کھینچتا ہوا، ننھے ننھے جوتے پہنے چھوٹے چھوٹے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر لے جاتا۔ کبھی پھولوں پر غور کرتا یا کسی تتلی کا پیچھا کرتا ہوا، کبھی گھاس میں چھپے مینڈکوں کو بھگاتا ہوا گیٹ سے باہر نکل جاتا جہاں چنار کے بہت سے پیڑوں کے پرے جھیل نظر آتی تھی۔ وہاں پہروں ایک جگہ کھڑا جھیل کو دیکھتا رہتا یا چنار کے بڑے سے تنے پر چھوٹا سا ہاتھ دھر کر گول گول گھومتا، یا اس کے کھوکھلے تنے میں چھپ کر مجھے تلاش کرنے کو پکارتا۔ میں کتنی بار اندر چلی جاتی کہ پیچھے پیچھے آتا ہوگا مگر مجھے پھر باہر جانا پڑتا اس کی تلاش میں اور میں اسے اپنی دھن میں مگن ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا نیلے نیلے آسمان کو تاکتا ہوا پاتی۔ وہ صبح سے شام کر دیتا کہ پرندے بولنے لگتے۔ کئی طرح کے پرندے چناروں کی اونچی نیچی شاخوں پر آ بیٹھتے اور اپنے اپنے آشیانوں میں شب بھر چھپ جانے سے پہلے کچھ دیر ان ٹہنیوں پر ستاتے چہکتے

ایک لطیف سا شور برپا کر دیتے اور وہ اُس میں کھو جاتا۔ مجھ سے ان کے نام پوچھتا اور یاد رکھتا۔ یہ بلبل ہے، یہ پپیہا ہے، یہ کستوری ہے، یہ ابابیل ہے، یہ فاختہ ہے، یہ مینا ہے...... اور ہر پرندے کی بولی پہچان لیتا اور ہو بہو نقل اتارتا۔ جب کوئی پرندہ نیچے کی ٹہنیوں سے اڑ کر اوپر گھنی شاخوں میں کہیں گم ہو جاتا تو وہ پہروں گھوم گھوم کر اسے تلاش کرتا۔

کوئی نیل کنٹھ پاس کی جھیل سے اپنی لمبی نیلی چونچ میں کوئی تڑپتی ہوئی رو پہلی مچھلی آڑھی دبوچ کر لاتا اور اسے سیدھی نگل جانے کی دھن میں بار بار اگلنے لگتا اور ناکام ہو کر کسی اونچی موئی سی ٹہنی پر اسے پٹخ پٹخ کر کھاتا تب وہ بھاگ کر اندر سے اپنی ننھی سی دوربین اٹھا لاتا اور باقاعدہ مشاہدہ کرتا۔ مجھے بھی اس کے ذہین بھول پن کو نہارنے کے علاوہ اور کسی کام میں لطف نہ آتا۔ اس کے ایسے ہی بھول پن اور محویت کا فائدہ اٹھا کر میں اسے کھلا پلا دیتی ورنہ فطرت کے اس پرستار کو میں باہر سے اندر لانا اگر بھول جاتی تو وہ کہیں باہر ہی سو جاتا، چاند کو گھورتا ہوا، تاروں کو دیکھتا ہوا اور صبح جب اسے شبنم جگاتی تو شاید وہ پھر کسی ہُد ہُد کو مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریوں میں سے چھوٹے چھوٹے کیڑے ڈھونڈتے ہوئے دیکھنے میں کھو جاتا۔

میرے شوہر کہیں شہر سے باہر جاتے تو فون پر اسی کی باتیں کرتے مجھ سے۔ ہماری زندگیوں کا حصّہ بن گیا تھا وہ۔ ذہین بے انتہا تھا وہ، یادداشت غضب کی۔ موسیقی کا دلدادہ ایسا کہ کسی دن دھول میں اٹا ستار کا غلاف اتار کر میں اسے بجانے لگتی تو دیکھتی کہ وہ بغیر تھکے تقریباً پون گھنٹہ اپنے ہی انداز میں اپنا ایجاد کیا ہوا کوئی رقص کرتا رہتا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پیر نہ تھکتے۔ کبھی ایک ٹانگ آگے کو جا رہی ہے کبھی پیچھے کو تو کبھی سامنے کے تکیے پر ایک آدھ لات رسید کی جا رہی ہے۔ کبھی ایک ٹانگ سے یا کبھی دونوں ٹانگوں سے کودا جا رہا ہے اور دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے جا رہے ہیں۔ سر بائیں کو مڑتا پھر تھوڑی دیر بعد دائیں کو اور اس طرح کی ہر حرکت میں میں دیکھتی کہ ایک ردھم ہوتا۔ وہ جھوم جھوم جاتا۔ پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ میں دیکھ دیکھ کر ہنستی۔ پھر ستار چھوڑ کر اسے گود میں بھر لیتی۔ وہ حیرت سے دیکھتا کہ آخر ایسا کیوں، پھر اور بجانے کی ضد کرتا۔ میں بہلانے لگتی:

''ذرا آنکھیں بند کرو۔'' وہ آنکھیں میچ لیتا۔

''یہ لمبی پلکیں کہاں سے لائے؟''

'باجار سے۔'' وہ بھول پن سے جواب دیتا۔

''کتنے میں......؟''

''دولوپے میں۔'' وہ آنکھیں پھیلا کر ابرو اٹھا کر دو پر زور دے کر کہتا۔ یہ بھولی بھالی باتیں مجھے زندگی کا احساس دلائے رکھتیں۔ اس کی آمد سے میرا ذہنی تناؤ دور ہو گیا تھا۔

اللہ نے میری بھی گود بھر دی۔

وہ کچھ بڑا ہوا تو اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ اب وہ صرف Week End پر آتا۔ پھر سال بھر بعد ہمارا ٹرانسفر ہو گیا۔ ہم وہاں سے چلے آئے۔

اس کی جدائی کا غم پتھر کی سِل کی طرح سینے پر رکھا تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے پہلوٹھی کے بیٹے کی طرح چاہا اور اس سے الگ ہو کر اس کے لیے ایسے ہی تڑپی جیسے ماں بچے سے بچھڑ کر تڑپتی ہے۔ اُسی نے تو اپنے بچپن کو پہلے پہل میری گود میں جگہ دی تھی۔ مجھے ممتا اور محبت سے آشنا کرایا تھا۔

وہ بھی ہم دونوں کو برابر یاد کرتا۔ ہم سے ملنے کو مچلتا۔ فون ہی کچھ تسلی تھا دل کو۔ کافی دیر بات چیت چلتی۔ میں فون پر کہتی کہ ذرا آنکھیں بند کرو۔ وہ فوراً آنکھیں بند کرتا۔ میں پوچھتی کہ یہ پلکیں کہاں سے لائے تو ویسی ہی سنجیدگی سے کہتا کہ باجار سے۔ دولوپے میں۔ اس کے چھوٹے سے دماغ میں یہ خیال نہ آتا کہ میں تو اس کی بند پلکوں کو دیکھ ہی نہیں سکتی۔ اُس کی امی مجھے بتایا کرتیں۔

پھر ایسے ہی دو تین سال گزر گئے۔ کبھی فون Connect ہوتا کبھی کئی دن گزر جاتے۔ میرے دل سے اس کی محبت ذرا کم نہ ہوئی۔ اس کی یاد میں میری آنکھیں بھر آتیں، چھلک جاتیں۔ دل اُسے ایک نظر دیکھنے کو تڑپ اٹھتا۔ باہیں اسے سینے سے لگانے کو مچلتیں۔ روح جدائی کے غم سے درد کرتی اور میں دل پر پتھر رکھ لیتی۔ اپنے بچوں میں صبر ڈھونڈ لیتی کہ صبر کرنا میں نے اسے پا کر ہی سیکھا تھا۔

ایک عرصے سے ہم بھی اور وہ لوگ بھی ملنے کا پروگرام بنانا چاہتے تھے اور ملاقات تھی کہ طے ہی نہ ہو پاتی تھی۔ کچھ یہاں کا موسم کچھ ادھر کے حالات......

اب کے سردیاں شروع ہوئیں تو وہ لوگ سچ مچ ہی آ گئے۔ مجھے تو انھیں دیکھ کر بھی ان کی آمد کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کا قد تھوڑا سا لمبا ہو گیا تھا۔ تتلاہٹ ختم ہو گئی تھی۔ پہلے سے کچھ کم گو ہو گیا تھا مگر دیکھنے میں ویسا ہی پیارا۔ دل موہ لینے والی صورت، کالی کالی بھولی سی

آنکھیں، لمبی گھنی پلکیں۔ سیب جیسے گال اور سرخ سرخ کان۔ ہاتھ پاؤں وہی گورے، مکھن کے پیڑوں ایسے۔ مجھ سے لپٹا تو میں رونے ہی لگ پڑی اور وہ کتنی ہی دیر ہنستا چلا گیا۔ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا:

''ذرا آنکھیں بند کرو۔''

اس نے آنکھیں جھکا لیں۔ میں نے پوچھا یہ پلکیں کہاں سے لائے تو شرما کر مسکرا دیا۔ میرے گھر میں بہاریں آ گئی تھیں۔ گھر میں کھانا اسی کی پسند کا بنتا۔ میں اسے طویل Drive پر لے جاتی۔ میرا سارا وقت اس کا ہو گیا تھا۔ مجھے میری گم گشتہ جنت مل گئی تھی۔

ایک دن صبح صبح گولیاں چلنے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بھاگی بھاگی باہر نکلی تو دیکھتی ہوں کہ وہ بالکنی میں کھڑا منہ سے مختلف قسم کی گولیاں چلنے کی آوازیں نکال رہا تھا۔ ایسی مہارت سے کہ ان کے نقلی ہونے کا شک تک نہ گزرے۔

یہ سارا قصور میرا ہی تھا۔ وہ کتنے دن سے آیا تھا اور میں اس کے لیے ایک بھی کھلونا نہیں لائی تھی۔ اسی دن شام کو میں اس کی پسند کے کھلونے خرید لائی۔ جب وہ سو گیا تو میں نے وہ سارے کھلونے اس کی مسہری پر سجا دیے کہ صبح جاگتے ہی دیکھے گا تو کتنا خوش ہوگا۔ دوسرے دن اتوار تھا۔ میں ذرا دیر سے جاگی۔ دیکھا کہ سارے کھلونے ایک طرف کو ایک ڈھیر کی شکل میں رکھے ہوئے ہیں اور وہ غائب۔ میں نے اس کی ماں سے پوچھا تو بولیں کہ سب بچے بڑے کمرے میں کھیل رہے ہیں۔

بڑے کمرے کے دروازے پر اس کی مُنّی سی بہن ہونٹوں پر انگلی رکھے پہرا دے رہی تھی۔

''شی ادھر نہیں جانا۔ فائرنگ ہو رہی ہے۔'' وہ مجھے خبردار کرتے ہوئے سرگوشی سے بولی۔ اندر جھانکا تو عجیب منظر دیکھا۔ سارے گھر کے تکیے اور سرہانے ایک کے اوپر ایک اس طرح رکھے ہوئے تھے جیسے ریت کی تھیلیاں رکھ کر مورچے بنائے جاتے ہیں۔ وہ درمیان میں اوندھا لیٹا ہوا ایک بڑی سی لکڑی کو بندوق کی طرح پکڑے منہ سے مختلف طرح کی گولیوں کی آوازیں نکال رہا ہے اور اس کے دائیں بائیں میرے دونوں بچے اپنی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی بندوقیں لیے اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ جیسے حکم کرتا وہ دونوں ویسا ہی کرتے۔ کبھی ایک بھاگ کر ایک کونے میں گھستا، کبھی دوسرا دوسرے کونے میں یہ ہی عمل دہراتا۔ کبھی ایک بک

ریک کی آڑ میں ہو کر دوسری طرف کودتا، کبھی دوسرا الماری کے پیچھے چھپ کر، جست لگا کر دیوار کے ساتھ چپک جاتا اور وہ خود مورچہ سنبھالے کبھی ان کو ہدایت کرتا کبھی ان پر بندوق تان دیتا۔

اب یہ ہی اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔

وہ میٹھی بولیاں، وہ رقص، وہ موسیقی ...... وہ بھول گیا تھا اور یہ سب یاد دلانے کے لیے میں شاید اسے کہیں نہیں لے جاسکتی تھی۔

☆☆☆

خدا کا بندہ

— رحمان عبّاس

(1)

بارش بمبئی کی بعض بستیوں کے لیے قہر ہے— شاید ان علاقوں میں جرائم پیشہ افراد کی کثرت ہونے کی وجہ سے اللہ انھیں اپنی جباریت یاد دلاتا رہتا ہے۔ گلیوں میں ٹخنوں تک کیچڑ جمع ہو جاتا ہے۔ بعض گھروں کی چھتوں سے بارش گھر بستر پر اتر آتی ہے۔ کپڑوں سے عجیب سی بُو آنے لگتی ہے۔ موری میں کیچوے اور جانے کتنے چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے رینگتے رہتے ہیں۔ میونسپلٹی کے نل کے پانی میں تال تپڑی کے ٹپکتے ہوئے قطرے بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چوہے، گھونس اور مُرغیاں گھر دروازے کے اردگرد سکڑے سہمے دعائے مغفرت میں ادھ مرے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں اپنے کبوتروں کے بھیگتے ہوئے ڈربے کو تال پتڑی سے ڈھانپتے ہوئے سید عبدالباری کی بے قراری کو بھیگتا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ انھیں ان کبوتروں سے بے پناہ محبت ہے اور وہ ساری باتیں جو وہ کسی سے نہیں کہتے من ہی من اپنے کبوتروں کو مخاطب کر، کیا کرتے ہیں۔ آس پاس کی مسلم آبادی کے نوجوان ان کے سامنے سے گزرتے ہیں تو ان کی نگاہیں نیچی اور زبان پر ''السلام علیکم باری بھائی...... '' رہتا ہے۔ باری بھائی کی دھاک کیوں ہے؟ یہ کسی کو نہیں پتہ، مگر سب پر ان کی دھاک سی ہے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے کبھی مرڈر نہیں کیا۔ کبھی لڑکوں کا غنڈا گردی میں ساتھ نہیں دیا۔ کبھی کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ نہیں رہے مگر وہ لوگ بھی جو کئی قتل کا تجربہ رکھتے ہیں یا سیاسی پارٹی کے کارکنان ہیں، تبلیغ جماعت کے علاقائی امیر صاحب، جماعت اسلامی کے جنرل سکریٹری، سبھی ان کی عزت کرتے ہیں جبکہ باری بھائی نے اپنی زندگی میں سنِ بلوغ کے بعد کبھی نماز نہیں پڑھی۔ کبھی دعا کے لیے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ کبھی سر پر ٹوپی نہیں رکھی۔

آس پاس کی لڑکیاں ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگئیں باری بھائی نے کسی کو بھی پریشان نہیں کیا مگر جو بھی ان کے سامنے سے گزرتی سر پر دوپٹا سیدھا کر، سر جھکا کر سلام کرتی— اور دبی زبان میں کہتی: ''باری بھائی کبھی ہمارے گھر بھی آیئے نا؟'' — گویا باری بھائی کو بستی کی تمام لڑکیوں کے گھر یاد ہوں۔ اب تو باری بھائی کو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کون کس کی بیٹی ہے؟

(2)

بارش کے ان ہی قہر رسیدہ اور خدا کی جباریت کے عروج کے دنوں میں باری بھائی اپنے کبوتروں کے ڈربے پر تال پتری چڑھا کر، خوب اطمینان کر لینے کے بعد دو مہینے کے لیے گورکھپور چلے جاتے۔

باری بھائی امیر و کبیر آدمی نہ تھے۔ بستی کی مسجد سے ملحق اُن کی بہت ہی معمولی سی پان کی دکان تھی۔ یہ مسجد کا دروازہ اور یہ بائیں ہاتھ پر ان کی پانچ بائی پانچ کی دکان جس میں سگریٹ، گوٹھکا، اور چھوٹے موٹے چاکلیٹ وہ فروخت کیا کرتے تھے۔ دکان سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ان کی کھولی تھی۔ دس بائی پندرہ کی۔ 16 سال پہلے اس کھولی کی دیواروں نے ان کی اہلیہ کو دیکھا تھا جو شادی کر کے ان کے ساتھ آئی تھی۔ حمل ٹھہر جانے کے بعد اس کے والدین اسے گاؤں لے گئے۔ لڑکے کی ولادت کے بعد وہ کپڑے مٹھائی لے کر گاؤں گئے۔ بیوی کے ساتھ کچھ روز ٹھہرے، واپسی کا جب ارادہ ظاہر کیا تو بیوی نے بمبئی کے اس کیچڑ میں واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے بہت اصرار کیا مگر اس کی منطق تھی۔ ''جب باہر گاؤں (مطلب سعودی عرب وغیرہ) جو مرد جاتے ہیں ان کی بیویاں تو گاؤں میں ہی رہ جاتی ہیں۔ آپ بھی سال میں ایک بار آیا کرو— '' باری بھائی راضی ہو گئے اور ان کی زندگی ایک سیدھے راستے پر گامزن ہو گئی — سال میں دو مہینے گاؤں میں گزارتے ہوئے بھی اللہ نے انھیں چار بچوں سے نوازا مگر پھر وہ کبھی اتنے خوش نہیں ہوئے جتنے پہلی اولاد کی ولادت پر ہوئے تھے۔

بہ ظاہر ان کی زندگی تن تنہا آزاد بے ارادہ اور بے راہ تھی۔ انھیں کسی سے کوئی شکایت نہ تھی اور نہ ہی کسی کی بہت زیادہ ضرورت۔ صبح سات بجے دکان کھولتے۔ مؤذن جب ظہر کی اذان دیتا یہ دکان بند کر، اپنے مکان پر چلے جاتے۔ کھانا تیار کر کھاتے اور خوب آرام کرتے۔

4 بجے کے آس پاس پھر دکان کھول کر رات 11 بجے تک بوڑھوں، بدمعاشوں، غنڈوں اور گلی کے سیاسی منتریوں کو پان اور ماوا کھلاتے رہتے، حتیٰ کے فسادات کے دنوں میں بھی ان کا معمول نہیں بدلتا۔'' ہاں البتہ جب ایک بار بستی میں پولس نے احتیاط کے طور پر کرفیو لگا دیا تھا اس روز ان کی دکان بند رہی۔ اس کرفیو کے دن پولس کی فائرنگ میں بستی کے 3 مسلم لڑکے موت کے گھاٹ اترے، جو اپنے گھر کی کھڑکیوں کے کواڑ کھول کر یہ دیکھنے کے لیے جھانکتے تھے کہ باہر کرفیو کیسا لگتا ہے۔'' باری بھائی کے کبوتروں نے اپنی زندگی میں گولی چلنے کی دلدوز آواز پہلے کبھی نہ سُنی تھی، وہ ڈر سے پھڑ پھڑاتے ہوئے ایسے بھاگے کہ پھر تین چار دن واپسی کے نشانات ڈھونڈتے رہ گئے ہوں گے۔

(3)

باری بھائی مسجد میں اسی وقت داخل ہوتے جب انھیں حاجت محسوس ہوتی۔ دھندا چھوڑ کر میونسپلٹی کے بیت الخلاء تک جانے سے انھیں ہمیشہ چڑ تھی؛ اس کی بُو سے انھیں شدید نفرت بھی تھی۔ مسجد کے بیت الخلاء کی ایک چابی ان کے پاس برسوں سے تھی۔

مسجد کے امام، خزانچی، ٹرسٹیاں، مؤذن اور ممبران ان کے سامنے آتے جاتے اور مرتے بدلتے رہے ہیں مگر چابی کا اختیار ان کے پاس ہی رہا ہے۔ مسجد سے جڑے ہوئے تمام اشخاص ان کی بے پناہ عزت کرتے ہیں۔ کیا یہ عجیب شخص نہیں لگتا؟ آخر کیا بات ہے کہ بغیر کسی وصف و خوبی کے لوگ اس کے اس قدر گرویدہ ہیں؟

(4)

جعفر کی عمر چھ سال تھی، جب اس کی دادی نے باری بھائی کو کھولی 3 ہزار روپیوں میں بیچی تھی۔ جعفر تب سے باری بھائی کو دیکھتا آیا ہے مگر اس کی بھی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ اس کم بخت باری بھائی میں ایسا کیا ہے؟ اور اسی لیے وہ اکثر و بیشتر باری بھائی کو عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خود سے کئی سوالات پوچھا کرتا۔ ایک دن جمعہ کی نماز کی اذان ہوتے ہی جب باری دکان بند کر اپنی کھولی پر لوٹے تو جعفر ان سے آملا۔ جعفر کو دروازے کے پردے کے باہر گلی میں کھڑے مسکراتے دیکھ کر انہوں نے آواز دی۔

''ارے جعفر وہاں کیوں کھڑے ہو، آؤ آؤ اندر آؤ......''

جعفر کھولی میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے؟''

''باری چاچا میرے کو کچھ جاننے کا ہے۔''

''بول کیا جاننے کا ہے؟''

''باری چاچا۔''

''ہاں بول''

''باری چاچا میں سوچتا ہوں سارے لوگ تمہاری اتنی اجت کیوں کرتے ہیں؟''

''ارے اجت وجت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''مگر آپ تو نماج بھی نہیں پڑتے...... اللہ سے......''

''نماج نہیں پڑتا تو کیا ہوا......؟''

''جو نماج نہیں پڑتے اللہ تو ان کے ساتھ نہیں رہتا نا؟''

''تو کیا ہوا......؟''

''تو پھر اِجت آپ کو اللہ کیوں دے گا؟''

باری نے غور سے جعفر کو چند ساعتوں دیکھا اور پھر خلاء میں جانے کون تھا جس کو وہ گھورتے رہے۔ تکبیر کے بلند ہونے کی آواز بلند ہوئی تو ......تو خود بھی جھٹ سے سنبھلے اور مسکراتے ہوئے جعفر سے کہا: ''اچھا دن ہے، آج دیکھ لے...... بس دیکھتے رہنا......''

(5)

نمازِ جمعہ ختم ہوئی۔ جعفر نے باری بھائی کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ انہوں نے خود کے لیے کھانا وانا بنایا۔ دروازے کے پردے کے پاس سے مؤذن رمضان کی آواز آئی۔

''باری بھائی ...... اوہ باری بھائی......''

''چلئے میٹنگ کا ٹائم ہو گیا۔''

''اندر آؤ بھئی...... رمضان! کیا دروازے سے ہی جاؤ گے؟''

''ٹائم ہو گیا ہے دو جن کو اور بولنا ہے۔''

''اچھا تو چل...... میں آیا......''

رمضان گلی کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ (جہاں [illegible] کی لڑکیوں کی دوشیزگی کب کس موڑ پر کہاں کھو جاتی ہے محلے [illegible]

باری بھائی نے لنگی کو دوبارہ ٹھیک کیا، شرٹ جھٹکا اور جعفر کے ساتھ مسجد کی جانب بڑھ گئے۔

(6)

مسجد میں منبر سے لگ کر امام حیدر علی سیّد بیٹھے تھے۔ ان کی بغل میں چیرمین (Chairman) شیخ زاہد عمران، ان کے پاس ہی خزانچی داؤد اور سیکریٹری حمید صدیقی چار ممبران اور دکاندار (جن کی دکانیں مسجد کی دیوار سے لگی ہوئی تھیں) بیٹھے تھے ان کے سامنے باری بھائی اور ان کی پشت پر جعفر...... جعفر کے بائیں ہاتھ پر مؤذن رمضان بیٹھا تھا۔

امام صاحب نے کوئی دعا کی اور اس کے بعد میٹنگ شروع ہوئی۔ خزانچی نے گزشتہ تین جمعہ میں جمع کیے گئے چندے کی رقم بتائی، دکانداروں سے وصول کیے گئے کرایے اور دیگر امداد کی تفصیل بیان کی۔ کچھ اور بھی کام کی باتیں ہوئی ہوں گی۔ پھر باری بھائی نے سوال کیا۔

''زاہد...... رمضان کی پگار بھی بڑائیں گے۔''

زاہد نے باری بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: ''ارے باری بھائی پچھلی میٹنگ میں تو بولا تھا۔ کچھ زیادہ بچتا نہیں ہے۔ آگے دیکھیں گے......''

باری نے مڑ کر رمضان کو دیکھا۔ رمضان کی آنکھوں میں کوئی مفہوم تھا جسے پڑھنے کی لیاقت شاید باری بھائی میں سب سے زیادہ تھی۔

''امام صاحب تین میٹنگ میں یہ سنتا آرہا ہوں۔ بولو آپ کیا بولتے ہو......؟''

''ارے آپ باشعور حضرات کی موجودگی میں، میں کیا کہوں؟ آپ سارے حالات سے واقف ہیں۔''

باری کو امام کا یہ جواب بڑا غیر متوقع لگا ہوگا اور کیوں نہ لگے۔ 8 سال پہلے جب پچھلا امام انصاری، خورشید کی لڑکی کو بڑی بنا کر بھاگ گیا تھا تب ایک گارمینٹ میں کام کرنے والے اس حافظ قرآن کو وہاں سے اٹھا کر یہی لے آئے تھے۔ تین سال بعد مرحوم چیرمین عابد بھائکر سے درخواست کر، اس کی تنخواہ 1300 سے بڑھا کر دو ہزار کی پھر دو سال کے عرصے میں سیکریٹری سے خوب بحث و تکرار کے بعد 1000 اور بڑھائی تھی۔ آج وہی امام تین برسوں سے 1200 روپیوں میں کام کرنے والے مؤذن کی تنخواہ میں اضافے کے لیے سفارش تک نہیں کررہا ہے۔

باری نے رمضان کی آنکھوں میں اٹکے ہوئے پیغام کو پڑھ لیا تھا۔ امام کی اور دیکھتے ہوئے اس سیکریٹری سے مخاطب ہو کر کہا: ''حمید، ترے کو تو مالوم ہے، رمضان کی بیوی ہے۔ ابھی ایک بچی بھی ہوئی وہ بھی بیمار رہتی ہے اور گھر بھی بھاڑے کا ہے۔ 350 تو اس میں جاتے ہیں۔'' رمضان کی آنکھوں میں پیغام پگھل گیا تھا اور جعفر کی آنکھوں میں ایک خاص تجسس جاگ گیا تھا۔

حمید نے امام صاحب سے نظر ملائی اور کہا: ''باری بھائی بات تمہاری صحیح ہے مگر مسجد کے Resources بہت کم ہیں نا؟''

''Resources کم ہیں نا'' کو دہراتے ہوئے باری بھائی بول پڑے: ''حمید کس کو سکھاتا ہے؟'' اور ان کا قہقہہ پھٹ پڑا جس سے میٹنگ میں ایک طرح کی سنجیدگی در آئی۔ درحقیقت باری کو ''مالوم تھا'' کہ ہر سال رمضان کے مہینے میں سعودی عرب کی کانسلیٹ سے ایک موٹی رقم، کھجور اور قرآن کی بے شمار جلدیں دین کے فروغ کے لیے ڈائرکٹ ان ہی کے گھر اتار لی جاتی ہیں۔ کھجور ان کے رشتے داروں میں تقسیم ہو جاتا ہے قرآن کی کچھ جلدیں محلے میں بانٹ دینے کے بعد باقی محمد علی روڈ کے ایک کتب فروش کو اونے پونے بھاؤ بیچ دی جاتی ہیں۔ اب رہی بات روپیوں کی تو ...... اُس کا بڑا حصہ ان کے ذاتی کاروبار میں لگ چکا ہے اور ایک تہائی چیرمین اور چند ہزار امام صاحب کو...... کیونکہ وہی عربی زبان میں کاؤنسل جنرل سے محلے کی بے دینی اور مسجد کی کسمپرسی کا رونا رونے میں معاون ہوتے ہیں۔ حمید کے بھائی سلیمان کا کیبل نیٹ ورک بھی اسی رقم سے کھڑا ہوا ہے اور اس کی چچازاد بہن کے چار بیوٹیشن گالے بھی انہی سے خریدے گئے ہیں۔ حتیٰ کے حمید کے گاؤں میں بنائے گئے عالیشان بنگلے کی اینٹوں میں بھی ریگستان کے اونٹ کے پیشاب اور پٹرول کی بُو سونگھی جاسکتی ہے۔

قہقہے کے شور سے مسجد کی دیواروں اور کھڑکیوں کی گرد میں مایوسی کی لکیریں کھینچ دی گئی تھیں۔ امام صاحب داڑھی میں انگلیاں ڈالے چیرمین زاہد عمران کو دیکھ رہے تھے جو گزشتہ سال حج ہو آئے ہیں۔ چھ سال پہلے انہی کا اندھیری ریلوے اسٹیشن کے باہر والی جامع مسجد کے سامنے سوشل کلب تھا جس میں چوبیس گھنٹے رَمی اور پھلس چلتا تھا۔ وہاں سے خوب روپیہ پیسہ کما کر اس کیچڑ والی بستی سے دو کلومیٹر دور بنی عالیشان عمارت میں 32 لاکھ کا فلیٹ خریدا ہے

اور اب دو برسوں سے اس مسجد کے چیرمین بن بیٹھے ہیں۔ دو بار تبلیغ جماعت میں چلہ لگا آئے اور اپنے گناہوں سے توبہ کر کلب کو بند کیا اور اس کی جگہ امپورٹ اکسپورٹ کا دھندا کھول دیا۔ مگر حج انہوں نے اپنے دوست حمید صدیقی کی طرف سے دیے گئے ٹکٹ پر ہی کیا تھا۔ حج سے آنے کے بعد اپنی بیٹی کا رشتہ بھی حمید کے ''دو نمبر'' بیٹے سے کر دیا جس نے چند روز قبل زری کا کارخانہ کھولا ہے جس میں دس سال سے لے کر اٹھارہ سال کے غریب بچے اٹھارہ گھنٹے بہت ہی معمولی اجرت پر کام کرتے ہیں۔

باری کے دماغ کی اسکرین پر سارے واقعات پل بھر میں گزرے۔ اس نے زاہد شیخ سے نظریں ملاتے ہوئے کہا: ''زاہد بھائی ...... آپ کیا بولتے ہو......؟'' زاہد، باری بھائی کے سامنے کچھ بولنے کی مجال نہیں کر سکتا، ان کی جس بیٹی کی منگنی اب حمید کے بیٹے کے ساتھ ہوئی ہے پچھلے عید کی چاند رات کو اسے وہ ہی جوہو بیچ سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔ سب کو ایسا لگا تھا کہ عید کی شوپنگ کے لیے کسی اچھے بازار گئی ہوگی مگر یہ بات باری بھائی کے دل میں دفن ہو کر رہ گئی کہ وہ امبولی ناکے کے شیو سینا شاکھا پرموکھ سدھیر ڈانڈیکر کے ساتھ جوہو سمندر کے کنارے ایک طرف پتھروں کے درمیان بیٹھ عید کے چاند کو اس کی آنکھوں میں کھوج رہی تھی۔ سدھیر ڈانڈیکر کے والد پر ہلاد ڈانڈیکر باری بھائی کے گہرے دوست ہیں، باری بھائی نے معاملہ رفع دفع کر دیا یہ بات زاہد شیخ کے علاوہ ان کے گھر کا کوئی دوسرا فرد بھی نہیں جانتا۔ زاہد نے نظریں نیچے رکھتے ہوئے کہا: ''باری بھائی آپ کی بات کو تو ماننا ہی چاہیے؟ بولو کتنے روپے رمضان کی پگار میں بڑھانے کے ہیں۔'' سب کی نگاہیں حیرانی سے زاہد شیخ کی اور مرکوز ہوئیں تو انھوں نے رمضان کی اور دیکھتے ہوئے کہا: ''محنتی آدمی ہے اللہ کے گھر میں پانچ وقت اذان دیتا ہے۔ بچّی بیمار ہے۔ ہماری ذمّے داری ہے......''

اس پر امام صاحب نے حمید صدیقی سے آنکھ ملاتے ہوئے گردن ہلائی۔ حمید صدیقی نے کہا: ''باری بھائی جب زاہد بھائی کہہ رہے ہیں اور آپ کی بات کا وزن اس پر ہے تو ہم کیسا بھی کر کے اگلے مہینے ......'' وہ ایک پل کو رُکا...... اور رمضان کو دیکھنے لگا۔ رمضان کی آنکھوں میں بڑی امیدوں کے چھوٹے چھوٹے جگنو تھے۔ باری بھائی کی آواز نے اس کے کانوں کی سماعت کشی رسیوں پر بازگشت کی، ''800 ملا کر دو ہزار کر دیں گے۔'' حمید صدیقی نے گردن

موڑ کر زاہد شیخ کو دیکھا۔ زاہد شیخ نے حمید کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے ایک اتفاقی قہقہہ لگایا اور کہا: ''باری بھائی بھی نا، سب کی جندگی کا خیال رکھتے ہیں۔''

رمضان کے چہرے پر جو مسکراہٹ پھیلی اس میں اس کی بچّی کے شفا کے امکانات کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ میٹنگ برخاست ہونے پر جب جعفر باری بھائی کے ساتھ ان کے گھر واپس آرہا تھا اس وقت جعفر کی خاموشی میں جو اضافہ ہوا تھا اس کی پیمائش آسان نہیں ہے۔ اس کا پیر ایک نالی میں پھنس جانے ہی والا تھا مگر آج صبح ہی باری بھائی نے وہاں پر چند لادیاں لگا دی تھیں۔

اس بستی کو اس طرح کی لادیوں کی ابھی اور کتنی ضرورت ہے!

☆☆☆

برسورام دھڑاکے سے

— معین الدین جینا بڑے

پچھلے دنوں ہندوستان میں میرے مختصر سے قیام کے دوران اچانک ٹھنڈی رام سے ملاقات ہوگئی۔ برسوں بعد غیر متوقع طور پر جب وہ مجھے ملاتو میں اس سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی مجھے بھینچ لیا۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے سے گتھے رہے۔ ویسے اگر آپ اس وقت ہم دونوں کو دیکھتے، تو یہی کہتے کہ یہ بھرت ملاپ چندلمحوں کا تھا اور آپ کی بات کچھ غلط بھی نہ ہوتی کیونکہ گھڑی کی سوئیوں کے حساب سے تو ہم چندسیکنڈ ہی آپس میں لپٹے رہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم دونوں اس وقت ایک دوسرے سے ملنے کی خوشی میں کچھ ایسے پاگل ہوگئے تھے کہ وقت کو ناپنے والے اس آلے کی ٹک ٹک ہمارے لیے بے معنی ہوگئی تھی۔

جب ہم الگ ہوئے تو ذرا فاصلے سے ہم نے ایک دوسرے کونظر بھر کر دیکھا۔ اب اس عمر میں دیکھنے جیسا کیا رہ گیا ہے۔ پھر بھی، میرے بالوں کی سفیدی اس کے بالوں سے جھانک رہی تھی اور اس کی آنکھوں کی نمی میری آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ میں نے پہلی بار جانا کہ وقت واقعی بڑا سفاک ہوتا ہے اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔

ہم ایک دوسرے کی سننے اور اپنی سنانے کے لیے اندر ہی اندر چھٹپٹا رہے تھے۔ لیکن پہل دونوں میں سے کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ ہمارا رواں رواں بول رہا تھا اور لفظ گونگے ہو گئے تھے ...... اور جب لفظ گونگے ہو جاتے ہیں تو ہر چیز کو زبان مل جاتی ہے؛ مسکراہٹ کو بھی ...... میری مسکراہٹ کے جواب میں ٹھنڈی نے گردن ہلائی اور کہا: ''ہم لوگ تو سچ مچ ہی بوڑھے ہو گئے رام کا نام لے کے۔''

مجھے شرارت سوجھی۔ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ٹھنڈی مل جائے اور میں اس کے چٹکی نہ لوں، چاہے وہ پچاس برس بعد ہی کیوں نہ ملا ہو۔ میں نے کہا: ''اپنے ساتھ مجھے کیوں بڈھا کہہ رہا ہے بڑھؤ اور تو کوئی آج بوڑھا تھوڑے ہی ہوا ہے، 'تو، تو پیدائشی بوڑھا ہے۔''

''تو میں پیدائشی بوڑھا ہوں، رام کا نام لے کے۔ اور تو؟''

''اور میں سدا کا جوان ہوں، رام کا نام لے کے!''

میرے اس طرح رام کا نام لینے سے وہ بڑا محظوظ ہوا۔ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ میں نے بھی اسے بھینچ لیا۔ اب ہم دونوں مل کر ہنس رہے تھے اور راستہ چلتی بھیڑ میں سے کچھ راہ گیر ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے...... رام کا نام لے کے!

رام کا نام لے کے، بچپن ہی سے ٹھنڈی کا تکیہ کلام رہا ہے۔ کبھی اس کا جملہ اس فقرے سے شروع ہوتا تو کبھی اس پر ختم اور بعض اوقات جملے کے بیچ ہی میں کہیں جب وہ اٹکنے لگتا تو رام کا نام لے کے اسے پورا کر دیتا تھا۔ اس کی یہ عادت پورے گاؤں کے لیے مستقل تفریح کا باعث تھی۔ ہم اسے رام کا نام لے لے کر چڑاتے تھے اور چھیڑ کا مزہ اس وقت دوبالا ہو جاتا جب وہ ہمیں رام ہی کا نام لے کر صلواتیں سناتا۔ اس پر ہم اسے بڑے سخت لہجے میں ٹوکتے کہ ابے رام جی کا نام لے کر گالیاں بکتا ہے اور اس کا جواب اس سے نہ بن پڑتا۔ وہ جھلا جاتا اور خفت مٹانے کے لیے اور اونچی آواز میں اپنے تکیہ کلام کے سہارے ہمیں بے نقط سنانے لگتا۔

بعض اوقات چھیڑ چھاڑ میں ہاتھاپائی کی نوبت آجاتی اور کبھی کبھار بات اس سے بھی آگے بڑھ جاتی جیسے اس شام ہوا تھا جب ٹھنڈی نے رام کا نام لے کے ایک نوکدار پتھر اٹھایا تھا اور نشانہ باندھ کر مجھے لہولہان کر دیا تھا۔ وہ برسات کے دن تھے شام کا وقت تھا، خوب گھنے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن برس نہیں رہے تھے اور ہم سب کورس میں رام جی کی دہائی دے رہے تھے۔

برسو رام دھڑا کے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے

مجھے یہ سوال ہر بار پریشان کرتا تھا کہ ہم دہائی تو بڑھیا کے مرنے کی دیتے ہیں لیکن کہا یہی جاتا ہے کہ رام جی کی دہائی دے رہے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ اس سوال کا جواب ٹھنڈی کے پاس ہوگا۔ اپنے ساتھیوں سے ذرا الگ ہو کر میں نے ٹھنڈی کو اپنے پاس بلایا تھا اور واقعی بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے اپنا سوال رکھا تھا۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سوال سے ٹھنڈی چڑ جائے گا۔ میرا سوال سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس وقت میں ٹھنڈی کو چھیڑنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا لیکن اب ٹھنڈی، گرمی کھا چکا تھا۔

''دہائی چاہے جس کی دیتے ہوں، تم رام کا نام نہ لیا کرو''

''کیوں نہ لیں؟''

ٹھنڈی کے پاس کوئی معقول وجہ نہیں تھی، ہو بھی نہیں سکتی تھی لیکن چپ رہنے میں بڑی سبکی ہوتی اس لیے اس نے جو منہ میں آیا سو کہہ دیا۔

''تو مسلمٹا جو ہے۔''

''مسلمان ہیں تو کیا رام جی کا نام نہ لیں!''

''ہاں نہ لیں!''

''اور تو جو محرم کی دسویں کے روز نشان کے ساتھ سب سے آگے آگے چلتا ہے!''

''وہ تو ہم اپنے باپو کے ساتھ چلتے ہیں۔''

''چلتے تو ہو۔''

''ہم کوئی آج سے تھوڑی ہی چل رہے ہیں۔''

''ہم بھی کوئی آج سے تھوڑے ہی رام کا نام لے رہے ہیں۔''

''جو بھی ہو تم رام کا نام نہ لیا کرو۔''

''کیوں؟''

''کہہ جو دیا!''

''یہ کیوں نہیں کہتا کہ تجھے مرچیں لگتی ہیں، رام کا نام لے کے''

میرا ارادہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس وقت ٹھنڈی سے لڑنے جھگڑنے کا ہرگز نہیں تھا لیکن میں خود کو روک نہیں سکا اور میں نے بھی وہی کہہ دیا جو منہ میں آیا۔ اگر یہ آخری جملہ میرے منہ سے نہ نکلتا تو وہ نوکدار پتھر وہیں سامنے زمین پر پڑا رہتا اور میری دائیں آنکھیں کے اوپر بھوں کے بالوں سے جھانکتا ہوا زخم کا جو نشان آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں، وہ نہ ہوتا..... ٹھنڈی کی نظریں اسی نشان پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے مجرم کی سی کانپتی آواز میں کہا: ''میں سمجھا تھا، ان برسوں میں رام کا نام لے کے یہ دھندلا گیا ہوگا۔'' میں نے ٹھنڈی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، وہاں اب بھی نمی تیر رہی تھی اور اس نمی کے پیچھے بہت دور تک اداسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے نشان پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا:

''ٹھنڈی تیرا دیا ہوا یہ نشان اب میری پہچان بن گیا ہے، میرے پاسپورٹ اور تمام سرکاری کاغذات میں اس کی وہی اہمیت اور حیثیت ہے جو میرے نام اور ولدیت کی ہے۔ اس کے بغیر نہ میں، میں ہوں نہ میری تصویر میری۔ سرکاری کاغذات سے قطع نظر اب تو خود میں بھی اس کے بغیر اپنے ہونے کا تصور نہیں کرسکتا۔ شاید میرے ہونے میں کہیں کچھ کمی رہ گئی تھی جسے اس نشان نے پورا کردیا ہے۔''

ٹھنڈی نے بجھی بجھی سی آواز میں بہت دھیرے سے کہا:

''اپنے نشان کو تو سنبھال کے رکھے ہو بھیا پر کبھی ہمارے نشان کی بھی فکر کی ہوتی، رام کا نام لے کے۔''

میں ٹھنڈی سے کیا کہتا۔ اسے کیسے سمجھاتا کہ جب زمینداروں اور جاگیرداروں کی اولاد کو گاؤں کی زمین بے دخل کردیتی ہے تو ان پر کیا گذرتی ہے، انھیں کیا کیا سہنا پڑتا ہے اور وہ ان باتوں اور ایسے طعنوں کو سہنے کے لیے کہاں سے جگر لاتے ہیں!

ٹھنڈی مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ بڑا شاندار فلیٹ تھا اس کا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس کی بیوی پرلوک سدھار چکی ہے۔ لڑکے نے شادی کرلی۔ بہو سگھڑ اور خوش اخلاق ہے لیکن ساس سے اس کی نبھ نہ سکی۔ ٹھنڈی نے بیوی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی، یہاں تک کہہ دیا کہ یہ غریب صرف مسلمان گھر میں پیدا ہونے کی گنہگار ہے ورنہ تو اسے رام کا نام لے کے نہ کلمے یاد ہیں نہ قرآن کی آیتیں۔

اس کی بیوی گنوار تھی لیکن اس نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ بس ایک ہی بات کہتی رہی کہ اس لڑکی کے پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کس مذہب اور کیسے گھر کی ہے۔ ٹھنڈی نے لاکھ اس سے کہا کہ آج کل کا ڈھنگ ہی یہ ہے۔ ان باتوں کو اب برا نہیں سمجھا جاتا لیکن اس کی بیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دوسرے چاہے ان باتوں کو برا نہ سمجھتے ہوں، اس کے نزدیک یہی باتیں ادھرمی ہونی کے لکشن تھے...... ورنہ اتنی بات تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ مسلمان ہونا کوئی پاپ نہیں۔ من مار کر لڑکے کی پسند کو وہ بھی پسند کرلیتی پر مشکل یہ تھی کہ لڑکی ڈھنگ کی مسلمان بھی نہیں تھی اور بڑھاپے میں ادھرمیوں کی سنگت کے خیال ہی سے اس کی روح کانپنے لگتی۔

ٹھنڈی نے چائے کے لیے بہو کو آواز دی اور مجھ سے کہا:

''مسلمان تو خیر بڑی چیز ہوتا ہے۔ رام کا نام لے کے ہم نے مسلمان دیکھے ہیں۔ اب تو ڈھنگ کا آدمی پیدا نہیں ہوتا!''

ٹھنڈی کی بہو نے آکر مجھے ہلو کہا اور ذرا توقف کے بعد انکل کا اضافہ بھی کردیا۔ پھر اس نے خبر دی کہ ڈرائیور ہوٹل گیا ہے۔ ذرا سی دیر میں میرا سامان لے کر آجائے گا۔ اس نے مجھ سے میرے خورد ونوش کے معمولات دریافت کئے۔ یہ بھی پوچھا کہ گڈ فار بڈ ذیابیطس یا دل کے مرض جیسے کسی عارضے کی وجہ سے پرہیزی کھانا تو نہیں کھاتا۔ میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے لب ولہجہ اور ناک نقشے نے مجھے میری بیٹی کی یاد دلا دی تھی۔ اب یہ کہنا تو مشکل ہے کہ میری بیٹی اور ٹھنڈی کی بہو میں واقعی بڑی مشابہت تھی یا میرے اندر کے کسی جذبے نے اپنے طور پر دونوں کو ایک روپ میں ڈھال لیا تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی مجھے دونوں کے چہرے مہرے اور رنگ ڈھنگ میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا تھا سوائے اس کے کہ میری بیٹی نے جس بوائے فرینڈ سے شادی کی ہے وہ اتفاق سے مسلمان ہے!

میں نے ٹھنڈی کی بہو سے کہا کہ وہ میرے لیے کوئی خاص زحمت نہ اٹھائے بس اس بات کا خیال رکھے کہ میں ذیابیطس کا مریض ہوں۔ اس پر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور یہ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی کہ ہمارے یہاں ویسے بھی شکر استعمال نہیں کی جاتی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ٹھنڈی کی طرف دیکھا۔ اس نے اس تعلق سے کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا اور مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوا کہ میں اسے اس تعلق سے کچھ کہنے پر مجبور کروں۔ دراصل اپنی بیوی کو یاد کر کے ٹھنڈی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔

''آج جیسے تو اتفاق سے مجھے مل گیا ویسے ہی چار چھ مہینے پہلے مل جاتا تو کتنا اچھا ہوتا!''

''کیوں!''

''میں تجھے ارون کی ماں سے ملواتا۔ وہ بیچاری کسی ڈھنگ کے مسلمان سے ملنے کی حسرت اپنے ساتھ لے گئی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر اس کی یہ حسرت پوری ہو جاتی تو رام کا نام لے کے وہ کچھ برس اور جی لیتی۔''

میں نے خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا:

''مجھ سے مل کر کسی کی حسرت کیا پوری ہوتی۔ میں تو بڑا بے ڈھب آدمی ہوں۔تو یہ بتا تجھے اتنے بڑے شہر میں ایک مسلمان نہیں ملا؟''

''مل جاتا تو بات ہی کیا تھی!''

''اور یہ جو تیرے پڑوس کے محلے میں مسجد ہے......؟''

''مسجد تو ہے، میں وہاں گیا بھی تھا۔ مسجد کے دروازے ہی پر ''بحکم اراکین مسجد ہٰذا'' رام کا نام لے کے ایک ''اہم اعلان'' ٹنگا ہوا دیکھا۔

''نمازی حضرات کو معلوم ہو کہ اس مسجد کے اراکین، امام، مؤذن اہل سنّت والجماعت ہیں اور حنفی مسلک پر ہی نماز ادا کی جاتی ہے جو عین قرآن اور حدیث کے مطابق ہے۔لہٰذا ان حضرات سے ادب کے ساتھ عرض ہے جو لوگ آمین بلند آواز سے کہتے ہیں اور تکبیر سے پہلے یا شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ مسلک حنفی کی خلاف ورزی کر کے فتنہ پیدا نہ کریں ورنہ اس کی ذمہ داری انہی کے سر ہوگی۔''

ٹھنڈی نے مجھے بتایا کہ یہ اعلان پڑھنے کے بعد اندر جانے یا باہر ہی کسی سے بات کرنے کی ہمّت وہ نہیں جٹا پایا۔ جہاں مسلک کے فرق سے فتنے اٹھ کھڑے ہو سکتے ہیں وہاں مذہب کا فرق جو نہ کرے وہ کم ہے! اور پھر ٹھنڈی ڈرا ہوا بھی تھا۔ دسمبر اور اس کے بعد جنوری کے فساد کی ہولناکیاں اس کے حواس پر چھائی ہوئی تھیں ...... پولس کی مدد بلکہ اس کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا تھا اور فساد کے بعد ٹھنڈی جیسے بےقصور اور معصوم ہندو مسلمانوں کے محلوں سے گذرنے سے کتراتے تھے۔ بہ حالتِ مجبوری اگر ان کا وہاں سے گذر ہوتا تو ندامت کے بوجھ سے ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہوتی تھیں اور دل میں یہ دھڑکہ بھی لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی شہدا گلی میں کھینچ کر کام ہی تمام نہ کر دے۔

ٹھنڈی وہاں سے الٹے پیروں لوٹ آیا۔ اس علاقے میں ذرا فاصلے پر ایک مسجد اور ہے۔ ناکے سے بائیں مڑ کر بیس قدم چلیں تو مارکیٹ کے سامنے کی گلی میں پڑتی ہے۔ عصر اور مغرب کے بیچ کا وقت تھا۔ عصر کے نمازی جا چکے تھے۔ مغرب کے نمازی ابھی آئے نہیں تھے۔ ٹھنڈی نے باہر ہی سے بغور جائزہ لیا۔ اراکین مسجد کے حق میں دل سے دعا نکلی کہ انھوں نے دروازے پر کوئی بورڈ نہیں ٹانگ رکھا تھا۔ ٹھنڈی نے سر پر رومال باندھا اور رام کا نام لے کر مسجد میں قدم رکھا۔

اندر دائیں جانب کونے میں ایک باریش شخص چند نوجوانوں کو دین کے ارکان یاد کروا رہا تھا۔ لڑکوں سے فارغ ہو کر وہ ٹھنڈی کی طرف متوجہ ہوا۔ ٹھنڈی کے سلام کا جواب دے کر اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ٹھنڈی نے اپنا تعارف پیش کیا۔ نام سن کر باریش شخص اس کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آیا۔ وہیں مسجد کے دائیں کونے میں پنکھے کے نیچے بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے۔ انھوں نے بابری مسجد کی شہادت پر ایک دوسرے کو پُرسہ دیا۔ سماج میں پھیل رہی لامذہبیت پر تنقید کی۔ جب یہ سب ہو چکا تو ٹھنڈی نے بڑی امید کے ساتھ اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

ٹھنڈی نے اس سے کہا کہ بھائی ہم نہ مسلمان ہیں، نہ حسینی برہمن؛ لیکن ہم لوگ حضرت امام حسین کے پشتینی عقیدت مند ہیں۔ آج عاشورے کا دن ہے۔ میرے گھر میں میٹھا پکا ہے۔ میں کسی دیندار مسلمان کی تلاش میں ہوں کہ اس سے فاتحہ پڑھواؤں۔ اگر آپ میری مدد کریں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

اس شخص نے ٹھنڈی کی مدد نہیں کی۔ فاتحہ کا نام سن کر اس کی گرم جوشی کی جگہ سرد مہری نے لے لی۔ ٹھنڈی تاڑ گیا کہ یہ مسجد ان مسلمانوں کی ہے جن کی وجہ سے اب گاؤں میں تعزیے نہیں رکھے جاتے اور نہ ہی محرم کا جلوس نکلتا ہے۔ نشان کی مسجد اب صرف نام ہی کی نشان کی مسجد رہ گئی ہے۔ مسجد کے جس کمرے میں ضریح اور علم رکھے جاتے تھے پچھلے دس برسوں سے اس کے دروازے پر ایک بڑا سا تالا جھول رہا ہے۔ ٹھنڈی کے اس انکشاف نے میرا کلیجہ چھلنی کر دیا کہ چاچا بلائیتی رام پر دل کا دورہ اور اس دروازے پر تالا دونوں ایک ساتھ پڑے تھے!

ٹھنڈی کے والد بلائیتی رام ولد سالگرام کی گاؤں میں نون مرچ کی دکان تھی۔ دکانداری کے ساتھ تھوڑی بہت ساہوکاری بھی کر لیا کرتے تھے۔ کاروباری حس بہت تیز تھی اور خوش مزاج بھی بہت تھے۔ بدیسی مال کے بائیکاٹ کے دنوں میں وہ اپنے نام کی وجہ سے اچھا خاصا مذاق بن کر رہ گئے تھے۔ یار دوست تو یار دوست، گاؤں کے بچوں تک نے انہیں نہیں بخشا تھا۔ پہلے کوئی انھیں چاچا جی بلاتا تو کوئی چاچا بلائیتی رام۔ لیکن اب وہ ہر ایک کے لیے بلائیتی چاچا ہو گئے تھے۔ جب کوئی لونڈا انھیں بلائیتی چاچا بلاتا تو وہ چمک کر جواب دیتے بول دیسی بھتیجے!

اس خیال سے کہ کہیں اس ہنسی مذاق کا اثر ان کی دکانداری پر نہ پڑے چاچا بلائیتی رام نے اپنی دکان پر جس پر پہلے کبھی کسی نے کوئی سائن بورڈ نہیں دیکھا تھا، ایک تختہ ٹانگ دیا۔ اس تختے پر جلی حرفوں میں لکھا تھا ''خالص اور صرف دیسی مال کی دکان۔ مالک فرزند سالگرام مرحوم''

اب تو فرزند سالگرام مرحوم خود مرحوم ہو چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ سریو کے کنارے مسجد کی شہادت کے بعد ملک بھر میں مسلمانوں کو قتل کرنے اور ان کی املاک لوٹنے یا جلانے کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔ بعض جگہوں پر ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ایسی کچھ کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اور کچھ کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے پائیں۔ نشان کی مسجد کے مینار ایک ایسی ہی ناکام کوشش کے گواہ ہیں۔

ہجوم نے چاچا بلائیتی رام سے بہت کہا کہ وہ ایک بے گناہ ہندو کی ہتیا کا پاپ اپنے سر لینا نہیں چاہتا لہٰذا وہ اس کے راستے سے ہٹ جائیں لیکن چاچا بلائیتی رام بس یہی کہتے رہے کہ میرے جیتے جی آپ لوگ نشان کی مسجد تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس تکرار میں خاصہ وقت نکل گیا۔ آخر کار مجبور ہو کر ان لوگوں نے چاچا بلائیتی رام کو روندتے ہوئے اپنی راہ بنائی۔

اس دوران مسلمانوں کو اتنا وقت ضرور مل گیا کہ وہ مسجد کے دفاع کے لیے صف آرا ہوسکیں۔ ان کے مقابلے پر اتر آنے کی دیر تھی کہ ہجوم تتر بتر ہو گیا۔ اب ہجوم کی جگہ پولس نے لے لی۔ تربیت یافتہ پولس کے جوانوں نے لاٹھی اور بلّم بردار مسلمانوں پر وہ اندھادھند گولیاں برسائیں کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ نمازیوں کا حوض خون سے بھر گیا اور شام کی شفق مسجد کے در و دیوار سے لپٹ کر رونے لگی!

بچے کھچے مسلمانوں کو پولس نے بلوہ کرنے اور بلائیتی رام ولد سالگرام کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا اور فائل قانونی کارروائی کے لیے آگے بڑھادی۔ وہ تو کہئے کہ چاچا بلائیتی رام نے دس برس قبل ہی جب ان پر دل کا دورہ پڑا تھا بمبئی سے ٹھنڈی کو بلوا کر وصیت کر دی تھی ورنہ ان کی زندگی کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا۔ ٹھنڈی کو ان کا ایک ایک لفظ آج بھی یاد ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

''بیٹا! ہم امام حسین کے غم کے امین ہیں۔ یہ ہمارے پُرکھوں کی وراثت ہے۔ حضرت امام حسین کی عظمت پر مٹھی بھر لوگوں کا اجارہ نہیں ہوسکتا۔ اس غم کو سہارنے کے لیے پہاڑ جتنا

بڑا کلیجہ چاہئے۔ ہر کسی کے بس کی یہ بات ہے بھی نہیں۔ ایسے لوگوں کی حرکت کا کیا برا ماننا جو اس غم کی عظمت کو نہ سمجھ سکیں۔ میں آخری سانس تک اپنے دھرم کا پالن کروں گا۔ میرے بعد مجھے یقین ہے تم اپنا پتر دھرم نبھاؤ گے لیکن ایک بات کی تاکید ضرور کرنا چاہوں گا۔ فاتحہ کے لیے کسی دیندار مسلمان ہی کو بلوانا۔ ذرا سا وقفہ دے کر انھوں نے کہا تھا، پریشان کیوں ہوتا ہے ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔''

اس سال بمبئی میں عاشورہ جون کی آخری تاریخ یا جولائی کی پہلی کو پڑا تھا اور اس سے پہلے ۸ دسمبر کے روز ٹھنڈی گاؤں کے شمشان سے پھول چن کر لوٹا تھا۔ وہ یہ سوچ کر حیران رہ گیا کہ ان چھ مہینوں کے عرصے میں اتنا وقت گذر چکا تھا کہ دیندار مسلمان کی تلاش میں اسے خدا یاد آ گیا!

ٹھنڈی کی بیوی بڑی مذہبی عورت تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی ٹھاکر جی کو بھوگ لگائے بغیر ایک دانہ منہ میں نہیں رکھا تھا۔ اسے اپنی سیوا اور شردھا پر بڑا وشواس تھا۔ وہ نیاز کا برتن لیے تمام رات بیٹھی یہی مناتی رہی کہ ایشور چاہے اس کے پران لے لیں پر ایسا کچھ کریں کہ ہم اپنے اجداد کی روحوں کے سامنے شرمسار اور گنہگار ہونے سے بچ جائیں۔ رات آنکھوں ہی میں کٹ گئی۔ برتن رکھا رہ گیا اور پڑوس کے محلے سے مؤذن نے اذان دی!

چاچا بلائیتی رام نے کہا تھا ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے تو پھر ٹھنڈی کو دیندار مسلمان کیوں نہیں ملا؟ اب ٹھنڈی کس سے کہے کہ خدا کسی بھی جگہ مل سکتا ہے کیونکہ وہ ہر جگہ ہے لیکن دیندار مسلمان کا ہر جگہ پایا جانا شرط نہیں، وہ تو وہیں ملے گا جہاں ہوگا۔ پتا نہیں اتنی بڑی دنیا میں وہ کہاں ہے؟

ٹھنڈی کے نزدیک بمبئی کچھ ایسا برا شہر نہیں ہے لیکن وہاں کے مسلمان کو آسمان پر ڈھونڈنے سے چاند نہیں ملتا اور مہینے کے تاریخیں رام کا نام لے کے بڑھتی جاتی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسے شہر سے کوئی کیا امید رکھے جو گذشتہ ڈھائی برسوں سے ایک شرعی گواہ فراہم نہ کر سکا۔ کیا شہر میں ایک بھی ایسا شرع کا پابند مسلمان نہیں رہا جس کی بینائی سلامت ہو اور اگر ہے تو کیا وجہ ہے کہ بمبئی کے مسلمانوں کے نزدیک اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں!

یہ نہیں کہ ٹھنڈی کے دوستوں میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔ بہت ہیں۔ سب کے سب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں اور تقریباً ہر ایک کے بارے میں وہ یقینِ کامل کے ساتھ کہہ سکتا

ہے کہ انھوں نے کبھی زندگی میں عیدین کی نماز ناغہ نہیں کی لیکن مسلمان اور دیندار مسلمان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہی فرق جو زمین اور آسمان میں ہے...... یا پھر...... وہ فرق جو بصارت اور بصیرت میں ہے!

قصہ مختصر یہ کہ اس عاشورے کے دن بمبئی میں وہ سب کچھ ہوا جو ہر سال ہوتا آیا ہے لیکن ٹھنڈی کے یہاں فاتحہ نہ ہو سکی۔ ٹھنڈی کی بیوی اس صدمے کو جھیل نہیں پائی اور دو چار مہینوں میں وہ غریب پرلوک سدھار گئی۔ ٹھنڈی بھی بجھ سا گیا۔ اس دن کے بعد ٹھنڈی کے گھر میں میٹھا نہیں پکا۔ میں نے ٹھنڈی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ یہاں کی شکر میں اب مٹھاس باقی نہیں رہی۔ مجھے یاد ہے، ٹھنڈی نے کہا تھا:

''اب ہماری زندگی میں نہ رس ہے نہ جس، بس جیے جا رہے ہیں۔ جی بھی کیا رہے ہیں بیٹھے تھوک نگل رہے ہیں۔ جب شکر ہی سے مٹھاس نکل جائے تو زندگی میں کیا رہ جاتا ہے۔ تو میرا ایک کام کر وہاں مملکتِ خداداد میں اگر شکر جیسی شکر ملتی ہو تو ذرا سی میرے لیے بھیج دینا۔ مرنے کے بعد مجھے اپنے پُرکھوں کی روحوں کا سامنا کرنا ہے!''

ٹھنڈی اپنے پُرکھوں کی روحوں کا جب سامنا کرے گا تب کرے گا، میں اس زندگی میں دوبارہ ٹھنڈی کا سامنا کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں پاکستان کا شہری اور کراچی کا باشندہ ضرور ہوں لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں ذیابیطس کا پرانا مریض بھی ہوں۔ مجھے شکر کا ذائقہ تک یاد نہیں رہا اور دوسرے جس چیز کو شکر قرار دیتے ہیں اسے شکر کے طور پر قبول کرنے میں مجھے تامّل ہے۔ یہ شہر جو روزانہ ٹنوں کے حساب سے شکر کھا جاتا ہے اگر واقعی شکر کھاتا رہا ہے تو یوں دن رات زہر نہ اگلتا۔

کچھ دن ہوئے ناشتے کی میز پر سب جمع تھے۔ مسجد میں نمازیوں کو گولیوں سے بھون ڈالنے کے واقعے پر بحث ہو رہی تھی۔ میری بیوی، بیٹے، بہو حتیٰ کہ پوتے اور پوتی کے پاس بھی اس واقعے پر کہنے کے لیے بہت کچھ تھا۔ رات میں نے دو ایک پیگ زیادہ پی لیے تھے۔ کسلمندی سی چھائی ہوئی تھی اس لیے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا سب کی سنتا رہا، یہاں تک کہ خود مجھے اپنا سکوت اکھرنے لگا۔ ابھی میں بحث میں حصہ لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پتا نہیں کیسے میرے منہ سے نکل گیا: ''آپ لوگ نمازیوں کی شہادت کو رو

رہے ہیں اب تو بمبئی میں جو ہو سو کم ہے۔'' گھر والوں نے مجھے تقریباً پچکارتے ہوئے سمجھایا کہ یہ واقعہ کراچی کا ہے بمبئی کا نہیں اور پھر میں نے اپنے آپ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''کیا فرق پڑتا ہے بمبئی میں نہ ہوا کراچی میں ہو گیا۔ یہاں کے بھی تو کئی واقعے یہاں نہ ہو کر وہاں ہو چکے ہیں۔''

میری اس قسم کی بہکی بہکی باتوں کے گھر والے عادی ہو چکے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بمبئی والے بمبئی کے اور کراچی والے کراچی کے عادی ہو گئے ہیں!

☆☆☆

ہذیان

— خالد جاوید

باہر کوئی کتا زور زور سے بھونک رہا تھا شاید اسی وجہ سے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ ابھی ابھی تو سویا تھا۔ دسمبر کی بے حد سرد رات تھی اور وہ اپنے کمرے سے باہر چلتے ہوئے وحشت زدہ جھکڑوں کو سن سکتا تھا۔ اس نے لحاف کو سر سے الگ کر دیا۔ کمرہ میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن وہ انداز سے اپنی بیوی کا بستر محسوس کر سکتا تھا۔ بیوی کے ہلکے ہلکے سے خراٹے اس کے لیے بے حد مانوس رہے تھے اور اس بات کی دلیل بھی تھے کہ ابھی بہت رات پڑی تھی اور صبح ہونے میں دیر تھی۔ اس کی بیوی اس بڑھاپے میں بھی بہت جلد اٹھ جانے کی عادت سے مجبور تھی حالانکہ یہ بہت عام بات تھی کیونکہ بوڑھے لوگ صبح دیر تک نہیں سو سکتے۔ وہ خود بھی منہ اندھیرے ہی اٹھ جایا کرتا تھا۔ آج سے چار سال پہلے تک وہ باقاعدگی سے ہوا خوری کے لیے جاتا رہا تھا لیکن جب سے اسے ہلکا سا اٹیک ہوا تھا وہ مشکل ہی سے چل پھر سکتا تھا۔ کیونکہ چلتے وقت اس کا سارا وجود عجیب بے ڈھنگے پن سے لڑکھڑا جاتا تھا۔ کوشش کرنے پر وہ چل تو لیتا تھا لیکن اس کی چال میں کوئی ربط یا توازن نہیں رہا تھا، یہی نہیں اس کی تحریر اور گفتگو میں بھی کوئی ربط نہیں رہا تھا۔ ویسے تو اسے ایک معمولی سا حادثہ پیش آیا تھا۔ چار سال پہلے اس کا شمار ملک کے چوٹی کے صحافیوں میں ہوتا تھا، ایسا صحافی جس نے زندگی بھر سیاست سے سمجھوتہ نہیں کیا تھا اور صحافت کی اعلیٰ اقدار کو برقرار رکھا تھا مگر دھیرے دھیرے ملکی صحافت تبدیلی ہوتی جارہی تھی۔ وہ نرم گوشہ غائب ہوتا جارہا تھا جو صحافت کو انسانی اقدار سے جوڑتا تھا اور یہ بات اس کے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھی اور پھر ایک دن اس کے ساتھ وہ حادثہ پیش آیا۔ 'صحافت اور اقدار' کے موضع پر ہو رہے ایک سیمنار میں بولتے وقت وہ زیادہ جوش میں آ گیا۔ ہائی بلڈ پریشر کا وہ مریض پہلے سے تھا۔ اس کی عمر اور صحت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ کسی موضوع پر اتنے جوش اور غصے کی حالت میں بولے۔ وہ سیمینار

میں بے وجہ ہی زیادہ جذباتی ہو گیا اور زور زور سے چیخ چیخ کر کہنے لگا کہ اب صحافت کا معیار 'قابلِ صرف' اشیاء کے برابر ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک چھوٹے سے شہر سے بھی پانچ پانچ روزنامے نکلنے لگے ہیں جو ایک بے تکی سی بات ہے۔ پھر وہ ایک عجیب سا سوال کرنے لگا کہ آخر آدمی اتنا خبر یافتہ کیوں ہونا چاہتا ہے؟ اس کے خیال میں آدمی کو زیادہ علم یافتہ ہونا چاہئے نہ کہ خبر یافتہ۔ یا تو اس کی یہ بات کچھ لوگوں کو مضحکہ خیز لگی یا ہو سکتا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کچھ مضحکہ خیز ہو گئے ہوں۔ یہ تو تھا کہ کافی بوڑھا ہو جانے کے باعث اکثر زور زور سے بولتے وقت اس کا کمزور اور دھان پان سا جسم لرزنے لگتا تھا اور بارہا ایسا ہوتا تھا کہ اسے اس حالت میں دیکھ کر لوگ مسکرانے لگتے تھے۔ بہر حال جو بھی ہو کچھ ایسا ضرور ہوا تھا کہ اس کا جملہ ختم ہوتے ہی سیمینار میں اچانک بہت سے لوگ زور سے ہنس پڑے۔ پھر یہ ہنسی چھوت کی طرح تمام سیمینار میں پھیل گئی اور یہاں تک کہ چند نوجوان صحافیوں نے ایک آدھ طنزیہ فقرہ بھی کس دیا۔ بس وہیں پتہ نہیں کیا ہوا اس کا چہرہ بالکل سرخ ہو گیا اور وہ بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگا، پھر وہیں اسی جگہ کھڑے کھڑے چکرا کر گر پڑا تھا۔

متواتر تین ماہ اسپتال میں رہنے کے بعد اس کی جان بچ گئی تھی۔ دماغ کی جانچ کروانے پر پتہ چلا تھا کہ شدید قسم کے اعصابی دباؤ کے زیرِ اثر دماغ کی ایک نازک رگ سے ہلکا سا خون کا رساؤ ہو کر وہیں منجمد ہو گیا تھا۔ آپریشن سے یہ دور کیا جا سکتا تھا مگر ایک تو آپریشن اس عمر میں خطرناک تھا دوسرے اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ آپریشن کے بعد مکمل طور پر صحت یابی حاصل ہو سکے گی۔ اس کی جان بہر حال بچ گئی تھی، بس اتنا فرق پڑا تھا کہ اس کی باتیں بے ربط ہو گئی تھیں۔ اکثر وہ چیزوں اور لوگوں کا نام بھول جاتا تھا یا پھر ان کے غلط نام لینے لگتا۔ چلتے پھرتے وقت توازن برقرار نہیں رکھ پاتا تھا اور گھر میں دیواروں کو تھام تھام کر ہی چل سکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو اپنا نام بھولا تھا اور نہ ہی پیشہ۔ اب بھی وہ ملک کے مختلف حالات پر مضمون لکھنا نہیں بھولتا تھا لیکن اب اچانک وہ لکھتے لکھتے بہک جاتا تھا اور مضامین بے ربطی کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس کے لکھے ہوئے یہ مضامین یا آرٹیکلز اخبارات کے مدیروں کے ذریعہ بے حد ہمدردی کے ساتھ ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیے جاتے تھے۔ وہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بھولا تھا جو محض اس کا ساتھ نبھانے کے لیے رک گئی تھی ورنہ دونوں بیٹوں کے ساتھ امریکہ چلی گئی ہوتی۔ اس کے دونوں لڑکے عرصے سے اپنی اپنی بیویوں سمیت امریکہ

میں مقیم تھے۔ کئی سالوں سے انہوں نے ماں یا باپ سے قریب قریب رابطہ منقطع کر رکھا تھا۔ ماں کے خطوں کے جواب میں کبھی کبھی کوئی بیٹا ڈھائی منٹ کے لیے ٹیلی فون کر لیتا تھا۔ ادھر کافی دنوں سے ایسا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔

لحاف سے سر باہر نکال لینے پر اسے سردی کا احساس ہونے لگا۔

''وہ ابھی ابھی تو سویا تھا۔'' اس نے سوچا پھر اسے عجیب قسم کی بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ دھڑ کے نیچے رانوں کے پاس کہیں بہت ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگ رہا تھا۔ ٹھنڈا اور گیلا، لحاف کے اندر سمائی ہلکی سی حرارت میں یہ گیلا پن اسے بہت لجلجا سا لگ رہا تھا۔

''پیشاب ہے۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

''سنو پھر نکل گیا...... پیشاب'' اس نے زور سے سوتی ہوئی بیوی کو پکارا۔ بات کرتے وقت اس کی زبان میں لکنت آجاتی تھی اور اکثر حلق میں سرسراتے ہوئے بلغم کی وجہ سے اس کی آواز اس کی بیوی کے لیے بالکل اجنبی ہو جایا کرتی تھی مگر ساتھ ہی اس آواز میں ''کچھ'' ایسا ڈراؤنا اور قابلِ رحم تاثر ہوتا تھا کہ بیوی فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتی تھی اور سہم کر اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ اس وقت بھی وہ بے خبر سو رہی تھی لیکن اس کی آواز سن کر گھبرا کر جاگ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' وہ بستر سے اٹھی۔

''پیشاب ہے...... پیشاب نکل گیا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

بیوی نے دیوار پر لگے بلب کا سوئچ آن کر دیا۔

''بڑی سردی ہے۔'' وہ ہلکے سے بڑبڑائی۔ پھر اس کے بستر کے قریب آ کر اس کے دھڑ کے نیچے پڑے ایک میلے سے چادر کے ٹکڑے کو باہر کھینچ لیا جو بالکل گیلا ہو رہا تھا۔ گیلے کپڑے کو فرش پر ڈالتے ہوئے اس نے پلنگ پر ہی پڑے ایک دوسرے صاف اور سوکھے کپڑے سے اس کا نچلا جسم پونچھ دیا۔

''جلدی کرو...... ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ کانپتا ہوا بولا۔

''صبر تو کرو...... نیچے دوسرا کپڑا رکھوں گی۔ آخر کہاں سے اتنی چادریں اور گدے بدلنے کو لاؤں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ تم ان دنوں وہی نلکی لگوالو۔ جاڑوں میں تو بڑی قلت ہو جاتی ہے۔'' بیوی نے ناخوشگواری سے جواب دیا۔

دراصل پانچ سال سے اس کے اعصاب بے حد کمزور ہو گئے تھے۔ خاص طور پر پیشاب کی حاجت ہونے پر تو وہ اسے روک ہی نہیں سکتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے پیشاب خطا ہونے لگتا تھا۔ ڈاکٹر نے پریشانی سے بچنے کے لیے کیتھیڈرفٹ کر دیا تھا۔ جن دنوں اس کے کیتھیڈر لگا ہوا تھا اسے ایک اچھا مشغلہ مل گیا تھا۔ پلنگ کی پائنتی پر پلاسٹک کی تھیلی لٹکی رہتی جس پر مقدار ناپنے کے لیے پیمانہ بنا ہوا تھا۔ عام طور سے یہ تھیلی دو لیٹر کی ہوتی ہے اور بوند بوند کر کے اس میں پیشاب گرتا رہتا ہے۔ وہ کروٹ سے لیٹا ہوا دیر تک یہ منظر دیکھتا رہتا۔ اسے ایک عجیب سی سنک ہو گئی تھی۔

''دیکھو کتنا ہو گیا۔'' وہ محویت کے ساتھ دیکھتا ہوا اکثر بیوی سے کہا کرتا۔

''ذرا دیکھنا...... مجھے صاف نظر نہیں آرہا ہے۔ کتنے ملی لیٹر ہو گیا۔''

''اوہ...... آخر تمھیں اس سے کیا مطلب کہ کتنا ہو گیا۔ تمھیں کوئی پریشانی ہے؟'' بیوی جھلایا کرتی۔

''نہیں میں سوچ رہا تھا کہ کل کے مقابلہ میں آج کہیں کم تو نہیں ہوا۔'' وہ فکر کے ساتھ کہتا اور پھر پلنگ کی پٹی پر سے آدھا نیچے جھک کر پیشاب کی تھیلی کو دیکھنے لگتا۔ کسی کسی دن جب پیشاب کم آتا تو اس دن وہ بے حد مایوس سا نظر آتا اور بیوی سے بار بار مانگ کر پانی پیتا رہتا۔ نلکی لگے رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ بستر اور کپڑے خراب نہیں ہوتے تھے۔ وہ نلکی کو تھامے ہوئے ہی دھیرے دھیرے چلتا ہوا باتھ روم تک بھی چلا جایا کرتا یا کبھی کبھی برآمدے میں بڑی کرسی پر بیٹھ جایا کرتا لیکن وہاں بھی اس کی تمام تر توجہ اور دلچسپی اس بات میں ہوتی کہ پیشاب کتنے ملی لیٹر ہو گیا ہے۔ لیکن یہ نلکی ایک ساتھ بیس بائیس دن سے زیادہ عرصے کے لیے نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ اس کا بلڈ شوگر بھی عام طور سے نارمل سے زیادہ ہی رہتا تھا اس لیے زخم ہو جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک معیّن مدت کے بعد ڈاکٹر کو اسے نکالنا ہی پڑا۔

جب اس کی بیوی اس کی دبلی پتلی کمزور ٹانگوں کو رگڑ رگڑ کر ایک تولیے سے صاف کر رہی تھی تو اسے بے اختیار اپنا بڑا بیٹا یاد آ گیا۔ بالکل ایسے ہی چھوٹا سا شیر خوار بچہ اس کے برابر میں بستر پر پڑا رہتا تھا اور گندا ہو جانے پر بالکل اسی طرح وہ اس کی ٹانگوں اور رانوں کو تولیے سے صاف کیا کرتی تھی، اس کے نچلے جسم اور ٹانگوں کی بناوٹ بالکل اپنے باپ کے نچلے جسم

اور ٹانگوں سے ملتی جلتی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے بیوی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پل بھر کو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا چہرہ کچھ اس طرح بگڑنے لگا تھا جیسے وہ رونے والا ہو۔ بالکل اپنے بچے کی طرح جو ایسے موقعوں پر پیشانی پر بل ڈال کر اور منہ کھول کر رونے لگتا تھا۔

''کبھی کبھی دوسری طرف بھی کروٹ لے لیا کرو۔ ایک ہی کروٹ پڑے رہتے ہو۔ اس سے بیڈ سور...... جسم پر زخم ہوجاتے ہیں۔'' بیوی نے اسے دوسری طرف کروٹ دلواتے ہوئے کہا۔ کروٹ دلاتے ہوئے اسے اس کے جسم سے کھرانداور ہلکی سی بدبو کا احساس ہوا۔ اسی وقت اسے اس کے کولہے پر ایک بڑا سا سفیدی اور سرخی ملا چکتہ دکھائی دیا۔ یہ بیڈ سور (Bed Sore) تھا اور وہ جانتی تھی کہ یہ کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اکثر اس نے ایسے مریضوں کو دیکھا تھا جن کے عرصے تک صاحب فراش رہنے کی وجہ سے اور ٹھیک سے صفائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ زخم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہ سڑنا شروع ہو گئے تھے اور ان میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ زیادہ تر یہی زخم ان کی موت کے باعث بنے تھے۔

''کل نہالینا۔'' وہ اس کے جسم کو لحاف سے ڈھکتی ہوئی دھیرے سے بولی۔

باہر تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے اور کمرے کا دروازہ اکثر زور زور سے ہلنے لگتا تھا۔

''ابھی اسی کروٹ سے لیٹے رہنا۔'' اس نے تاکید کی اور لائٹ آف کر کے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ وہ خود بھی کافی کمزور ہو گئی تھی اور جاڑوں بھر اس کی سانس پر زور رہتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی سانس زور زور سے چلنے لگی تھی اور اسے یہ فکر لاحق ہوگئی تھی کہ اگر وہ اسی طرح ایک کروٹ سے پڑا رہا تو بیڈ سور کبھی ٹھیک نہیں ہوسکتا۔

مگر مسئلہ دراصل کچھ اور تھا۔ اس کا پلنگ کمرے کی دیوار سے بالکل سٹا ہوا تھا اور پلنگ سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی لکڑی کی گول میز پڑی ہوئی تھی جس پر اس کے کاغذ، زیادہ تر پرانے اخبار، کتابیں اور قلم پڑے رہتے تھے۔ کمرے کا بلب کچھ اس پوزیشن سے لگا تھا کہ میز کی طرف کروٹ لینے پر ہی وہ پڑھ یا لکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف کروٹ لینے پر دیوار تھی اور خود اس کی پرچھائی روشنی کا راستہ روک لیتی تھی اور وہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتا تھا صرف دیوار کو گھور سکتا تھا اور دیوار کا مٹمیلا پینٹ اور جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا پلاسٹر نہ جانے کون کون سی بے معنی اشکال بنا بنا کر اسے خوف زدہ سا کرتا رہتا اور وہ پھر سے دوسری جانب کروٹ لے لیا کرتا۔ دوسری بات

یہ تھی کہ اسی کروٹ پر اس کا جسم خود کو سب سے زیادہ آرام دہ حالت میں محسوس کرتا تھا اور اسے نیند آ جاتی تھی۔

وہ سویا نہیں تھا۔ جب بیوی بستر پر لیٹ گئی تو اس نے تاریک کمرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنا شروع کر دیا۔ کہیں پر کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ باہر بالکل سناٹا تھا لیکن پھر دور سے پولیس سائرن والی گاڑی کی آواز رات کی دہشت کو بڑھاتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔ آج کل ملک بدترین حالات سے دوچار تھا۔ اس شہر میں بھی کرفیو لگا ہوا تھا۔ رات بھر سی۔ آر۔ پی کے گشت ہوتے رہتے اور پولیس سائرن گونجتے رہتے۔

چھت پر ایک آہٹ سی ہوئی۔ ''شاید بلّی ہوگی۔'' اس نے سوچا۔

کالے رنگ کی ایک جنگلی بلّی کچھ دنوں سے ان سے مانوس ہو گئی تھی۔ دن بھر اس کے کمرے میں پڑی رہتی اور راتوں کو ویران چھتوں اور منڈیروں پر آوارہ گھومتی۔ کبھی کبھی سردی سے پریشان ہو کر یا تھک کر وہ آدھی رات میں ہی نیچے چلی آتی اور کمرے کے بند دروازے پر پنجے مار مار کر اور مسکین آواز میں بول بول کر انہیں جگا دیا کرتی۔ ایسے وقت اس کی بیوی کو اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولنا پڑتا۔ اس وقت بھی بلّی ہی تھی۔ اس نے دروازے پر پنجے مارنے کی آواز سنی۔

''سنو...... آ گئی ہے۔'' اس نے لگ بھگ چیخ کر کہا۔ اکثر وہ اپنے لہجہ، بات اور آواز میں کوئی تال میل برقرار نہیں رکھ پاتا تھا۔ کبھی کبھی جو بات وہ سرگوشی یا دھیمے سے کہنا چاہتا تھا اسی بات کو کہتے وقت اس کا لہجہ غیر معمولی طور پر بلند ہو جاتا تھا۔

''دروازہ کھول دو ...... وہ آ گئی ہے۔'' اس نے دوبارہ بہت زور سے کہا۔ اسے اپنے اوپر بھی جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کیونکہ اچانک وہ آنے والی شے کا نام بھول گیا تھا۔

''ایک آفت ہے...... یہ بلّی تو پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔'' بیوی بڑبڑائی ......لیکن نہ اٹھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ بے زبان جانوروں پر بہت مہربان تھی۔

''کھولو...... دروازہ کھولو۔'' وہ پھر چیخا۔

''خدا کے واسطے دھیرے سے بولا کرو۔''

دروازہ کھولتے ہی کمرے کی تاریک دیواروں پر دو روشن شیشے جیسی آنکھیں بھٹکنے لگیں۔

''لائٹ آن کردو۔'' اس نے کچھ اس انداز اور اشارے سے کہا جو صرف اس کی بیوی ہی سمجھ سکتی تھی۔

''کیوں...... ابھی تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔''

''پڑھوں گا۔'' اس نے جذبات سے عاری لہجہ میں کہا اور پھر میز کی طرف کروٹ لے لی۔

بیوی نے ایک لمحہ کے لیے کچھ سوچا اور پھر لائٹ آن کردی۔ تب اس نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھے جارہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح کسی کی طرف دیکھتا ہے تو دراصل کسی کو بھی نہیں دیکھتا۔ بلّی اس کے پلنگ کے نیچے جابیٹھی تھی۔ بیوی دوبارہ جاکر لیٹ گئی۔

اب وہ کروٹ لیے لیٹا تھا اور اس کی نظریں میز پر رکھے اخباروں پر جم گئی تھیں۔ ایک اخبار میں بڑے بڑے گنبدوں کی تصویریں تھیں۔ گھنے درختوں کے درمیان وہ بالکل خاموش کھڑے تھے اور ان پر جگہ جگہ سے کائی اور خودرو گھاس اُگ آئی تھی۔ کچھ دور پر کسی ندی کے ویران کناروں پر پانی ہلکورے لے رہا تھا۔ تصویر کے ساتھ ہی کوئی سرخی بھی جمی تھی لیکن اخبار اس طرح مڑ گیا تھا کہ سوائے لفظ ''ڈھانچہ'' کے اور کچھ نہیں پڑھا جاسکتا تھا۔

''ڈھانچہ...... یہ بے وقوف ڈھانچے کے بارے میں کیا جانتے ہیں!'' اس نے کمزور اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا مگر اس کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ اور چہرے کا تشنج یہ بتارہا تھا کہ وہ جملہ دراصل بہت زور سے اور لگ بھگ گرج کر کہنا چاہتا تھا۔

''کیا آج تمھیں نیند بالکل نہیں آرہی ہے۔'' بیوی نے اکتا کر کہا۔

''سنو...... میں نے ان بے وقوفوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ مضمون لکھا ہے۔'' اس نے میز پر سے کاغذوں کا ایک پلندہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''بے وجہ کیوں تھک رہے ہو۔ اپنی بیماری کا خیال کرو۔ ہر وقت دماغ کو پراگندہ کیے رہتے ہو۔ تمہارا یہ مضمون ایک ماہ پہلے ہی وہاں سے ناقابلِ اشاعت کی معذرت کے ساتھ واپس آچکا ہے۔'' بیوی نے سمجھانے والے لہجہ میں کہا جس میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل تھا لیکن وہ شاید سب سے زیادہ اسی عنصر سے نفرت کرتا تھا۔

''گدھے ہیں...... ناقابلِ اشاعت...... کیونکہ میں سچ کے سوا اور کچھ بھی نہیں لکھتا...... یہ جاہل جانتے بھی ہیں کہ ڈھانچہ کیا ہوتا ہے...... سنو تم سنو میں نے کیا لکھا ہے۔''

اس کا چہرہ لال ہو گیا اور دھونکنی چلنے لگی۔ وہ اپنی سانس پر قابو پانے کے لیے رک گیا پھر تھوڑا اور آگے پلنگ کی پٹی پر کھسک آیا اور دائیں کہنی کو بستر پر ٹکا کر اپنی ہتھیلی میں چہرہ دبا کر اس پلندے میں سے کچھ پڑھنے لگا۔ ہتھیلی میں چہرہ اس طرح دب گیا تھا کہ اس کا گال اور ہونٹوں کا آدھا حصہ اوپر کان کی طرف کھنچنے لگا تھا جس سے اس کی آواز کچھ اور بدل گئی تھی۔ اس کی بیوی کو یہ آواز غیر معمولی طور پر رحم کے قابل لگی۔

''جہاں تک ڈھانچے کا سوال ہے تو انسانی ڈھانچے میں دو سو چھ ہڈیاں ہوتی ہیں۔ دوسرے جانوروں میں ان کی تعداد مختلف ہو سکتی ہے۔ ڈھانچہ ہی جسم کو حرکت میں لانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی نہیں دراصل ڈھانچہ ہی جسم کو ایک ہیئت بخشتا ہے اور سب سے بڑھ کر تو یہ کہ ان ہڈیوں کے گودے میں ہی خون کے لال ذرّات پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہڈیوں کی تعداد کا سوال ہے تو کھوپڑی میں کل ملا کر چودہ ہڈیاں ہوتی ہیں اور چہرے میں آٹھ مختلف قسم کی ہڈیاں ہوتی ہیں لیکن بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ترتیب اس طرح سے ہے کہ بازو میں کاندھے سے لے کر انگلیوں تک بتیس ہڈیاں......'' اب وہ باقاعدہ انسانی ڈھانچے کی باریک سے باریک تفصیلات بیان کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اسے ترحم سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ یہ مضمون ایک بار پڑھ چکی تھی اور اسے اس میں کوئی بھی ربط یا توازن نظر نہیں آیا تھا۔ آگے چل کر اس مضمون میں رینگنے والے جانوروں سے لے کر پرندوں تک کے ڈھانچے اور ان میں پائی جانے والی ہر طرح کی ہڈیوں کی اقسام کا بیان کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اچانک یہ مضمون اپنا رخ تاریخ کی طرف موڑ لیتا تھا اور مختلف ادوار میں پائے جانے والی طرزِ تعمیر کو بیان کرنے لگتا تھا لیکن اس کے درمیان ہی مضمون میں لسانیات، فلسفہ، زبان اور الفاظ کے بارے میں چند مبہم سے دلائل دیئے جانے لگے۔ اس کو اونگھ سی آنے لگی۔

''جانداروں کے ڈھانچے ہی باقیات یا فاسل کی شکل میں موجود رہ کر زمینی زندگی کی گتھی کو سلجھانے میں مدد دیتے رہے ہیں۔'' وہ پڑھتے پڑھتے رک گیا، سانس پھولنے لگی تھی اور وہ ہاتھ جو کہنی کے بل رکھا ہوا تھا سرد فضا کے باعث سن ہو گیا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے ہاتھ کو چہرے سے ہٹایا۔ ایسا کرنے میں اس کا سر جھٹکے کے ساتھ تکیے پر جا گرا۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ ہاتھ کو خلا میں گردش دینے لگا۔ خون کا دوران واپس آ رہا تھا اس لیے تکلیف دہ سی جھنجھناہٹ کی وجہ سے اس نے جبڑے بھینچ لئے۔ کاغذوں کا پلندہ دوسرے ہاتھ سے نکل کر سینے پر آ گرا تھا۔ اس کی بیوی کروٹ لیے پیر سکوڑے لیٹی تھی اور شاید غنودگی کی حالت میں تھی۔

''ایک زمانہ تھا جب گھونگے، سمندری گھاس، جیلی فش اور سیوار پانی میں تیرتے پھرتے تھے۔ ہڈیوں سے خالی لیکن پھر وہ وقت بھی آیا جب ریڑھ کی ہڈی والے جاندار نمودار ہوئے اور ساری زمین پر چھاگئے۔'' پڑھتے پڑھتے اچانک وہ اس طرح چیخا جیسے کسی سے گفتگو کرتے کرتے اسے بے حد غصہ آگیا ہو۔ اس کی بیوی بری طرح چونک گئی اور بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''کیوں چلا رہے ہو۔ نہ خود چین لوگے نہ لینے دوگے۔'' اس نے بے حد ناگواری سے کہا اور آنکھوں کو ہاتھوں سے مسلنے لگی، لیکن اس نے بیوی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اب وہ مضمون کو کچھ اس طرح پڑھنے لگا جیسے کسی کے کان میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔ اس کی بیوی خاموشی سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر بعد پھر اس کی آواز کچھ بلند ہونے لگی۔

''سادہ ساخت والے نازک جانداروں سے پیچیدہ ساخت والے سخت ہڈی دار جانداروں کے درمیان لاکھوں برس کا طویل سفر تھا مگر ارتقاد کے مسافروں نے اسے طے کر ہی لیا۔''

اس کی آواز پھر کچھ اس طرح دھیمی ہوگئی جیسے اب وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا اس کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح پڑھتے رہنے کے بعد اچانک پھر اس کا لہجہ جوش سے بھر گیا۔ اس کا کمزور سینہ بار بار پھولنے پچکنے لگا۔

''انسانوں اور بندروں میں کوئی خاص فرق نہیں سوائے اس کے بندر صدیوں سے مداری کے ساتھ تماشا دکھارہا ہے اور اس کی تھوتھنی کی مضحکہ خیز بناوٹ سے ہر وقت ایک اداسی خارج ہوتی رہتی ہے جس پر ناسمجھ لوگ اکثر ہنس بھی دیتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ارتقا کے سفر میں انسان سے پیچھے رہ جانے کا دکھ ہو یا اپنی ران کی ہڈی مڑے ہونے کا غم ہو جس کی وجہ سے وہ بے چارہ انسان کی طرح سیدھا ہو کر نہیں چل سکتا۔''

''اچھا خدا کے لیے اب خاموش ہو جاؤ۔ دماغ کو سکون دو۔'' بیوی نے پریشان ہو کر کہا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور زور سے کھنکارا۔ حلق بے حد خشک ہو رہا تھا۔ وہ منہ میں رال پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ صفحہ پلٹتے ہوئے ایک بار پھر اس نے بیوی کی طرف اسی انداز سے دیکھا اور زور زور سے پڑھنے لگا۔

''گنبد پر چڑھے ہوئے ان انسانوں کا سمندر میں تیرتے پھرتے گھونگوں اور درختوں پر بیٹھے بندروں سے کیا رشتہ ہے دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جسے سب سے پہلے حل کرنا لازم ہے۔''

اس کی بیوی نے ایک لمبی سی سانس لی اور لیٹ کر دوسری طرف کروٹ لے لی اور اب جبکہ وہ اس کی شکل نہیں دیکھ رہی تھی صرف آواز سن رہی تھی تو اسے محسوس ہوا کہ یہ آواز ایک شدید قسم کے دکھ اور کرب سے لبریز تھی اور پرچھائیں بن کر کمرے کی دیواروں پر رینگ رہی تھی۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔

بیوی نے پھر اس کی طرف کروٹ لے لی۔

''سنو...... باقی کل سنا دینا۔ اب نیند آ رہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''ڈھانچے کے بارے میں شکوک وشبہات ختم ہونے کے بعد لازمی طور سے تعمیرات اور طرزِ تعمیرات کا مسئلہ صاف ہو جانا چاہئے، تو اس سلسلے میں میرا کہنا ہے کہ......'' وہ پل بھر کو رک گیا۔ باہر تیز ہوا کے دوش پر پولیس کی گاڑی سائرن دیتی ہوئی نکل گئی۔ اس نے کاغذوں کا پلندہ ایک طرف رکھ کر ہاتھ کی مٹھی بار بار کھولنا اور بند کرنا شروع کر دیا۔ اتنی دیر سے کاغذات کو اونچا کر کے تھامے رہنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ درد کرنے لگا تھا۔ اس نے صفحہ پلٹا اور ایک نظر بیوی کی طرف ڈالی پھر مضمون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

بیوی نے مجبور ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب مضمون کو پورا ختم کرنے سے پہلے وہ نہیں سوئے گا۔ پلنگ کے نیچے سے بلّی کے اپنا جسم چاٹنے کی آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک بلّی کے جسم چاٹنے کی صدا اور اس کے مضمون پڑھنے کی آواز ساتھ ساتھ آتی رہیں، پھر صرف اس کی آواز باقی رہ گئی۔

پتہ نہیں کیوں اس کی بیوی کو اب ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے مضمون پڑھنے کی صدا دھیرے دھیرے ایک لوری میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کو نیند پھر سے بوجھل کرنے لگی۔ اسے لگا جیسے کمرے کا بلب بجھ گیا ہو۔

''ہندوستان میں مسلمان گنبد، مینار اور ڈاٹ لائے۔ مسلمانوں کو محرابوں کا علم تھا اس لیے انہیں کھمبوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تعمیرات فطری مظاہر کی طرح ہوتی ہیں۔ چتیہ ہو یا وہار، استوپ ہو یا زرتشی قربان گاہیں، تعمیرات دراصل سرخی، مٹی، چونے اور گارے کے علاوہ

اور کچھ بھی نہیں ہیں۔ تعمیرات بطورِ جُز مٹی کے ایک ایک سالمے میں محفوظ رہتی ہیں۔ کبھی کبھی خود کو ظاہر کرتی ہیں اور مکان و زمان کو کہیں سے گھیرتے ہوئے ویران اور اجاڑ پڑی زمین پر نمودار ہو جاتی ہیں اور کبھی مٹی کی پرتوں میں چھپے ہوئے سالموں میں خود کو معدوم کر لیتی ہیں۔ تعمیرات کی حقیقت مختلف طرزوں اور نقشوں سے ماورا ہے۔ مسئلہ صرف 'ظاہر' ہو جانا ہے۔''
اس نے صفحہ پلٹا۔ اس کی بیوی بے خبر سو رہی تھی اور اس کی سانس کچھ اس طرح چل رہی تھی جیسے وہ جلد ہی بلند خراٹے لینا شروع کر دے گی۔ اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اس بار کچھ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا شروع کر دیا جیسے کسی مجمع کے آگے تقریر کر رہا ہو۔

''ہمیں اشیاء کو ان کے اصل روپ میں دیکھنا چاہئے۔ لفظ کی اضافی حیثیت ہوتی ہے اور صداقت لفظوں یا گفتگو کے ذریعہ بیان نہیں کی جاسکتی اس لیے میں سرکار، قانون اور ماہر عمرانیات یا مورخ کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ اس نکتے کو ہمیشہ مدِ نظر رکھے کہ دنیا کے سارے اختلافات محض زبان و بیان کی غلطیوں اور اشیاء کے باہمی ناموں کے درمیان جڑے ایک رسمی سے تعلق کی بنا پر ہی ہیں۔ علّت و معلول کے درمیان ہمیشہ سے ایک غلط رشتہ قائم ہوتا رہا ہے اور اکثر ہمارے ادراک کو دھوکا دیتا رہا ہے۔''

اچانک اسے اپنے حلق میں عجیب سی کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ اس کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی جسے اس نے بے دلی سے قمیص کی آستین سے پونچھ دیا۔ بیوی کے خراٹے شروع ہو گئے تھے۔

اس بار اس نے قریب قریب مسکراتے ہوئے پڑھنا شروع کر دیا۔

''جہاں تک ہمارے شاعر اور ادیب حضرات کا سوال ہے تو ان کے لیے اس مسماری کے بعد صرف ایک ایسا منظر ہے جو ان کی تخلیقات کا موضوع بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر وہ اس احساس کو پا سکیں کہ...... ساڑھے چار سو سال پرانی مٹی جب بلندی سے زمین پر آ گری ہوگی تو وہاں کیسی بھیانک اور دردناک آواز گونجی ہوگی اور اس مٹی میں پوشیدہ حشرات الارض بے چین و بے گھر ہو کر ایک ایسی ہجرت کی تلاش میں بھٹک رہے ہوں گے جواب ان کا مقصد نہیں۔ اس ندی کے کنارے اور بھی ہیبت ناک اور پُر آسیب ہو گئے ہوں گے۔ یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اب وہاں سورج کے تیور بدل گئے ہوں گے۔ دھوپ کسی اور چال اور انداز سے وہاں بکھرتی ہوگی اور ہوا کے آنے جانے میں بھی اتنا فرق ضرور پڑا ہوگا کہ آس پاس

کے درخت تیزی سے ہلنے لگے ہوں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالکل ہی ٹھہر گئے ہوں۔ اس بارے میں واضح طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

وہ پڑھتے پڑھتے رک گیا۔ ایک دم سے اسے شدید قسم کی سردی لگنا شروع ہو گئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اسے اس حقیقت کا علم ہوا کہ اس کی تحریریں بے ربط اور بے موقع ہیں، دراصل وہی چیز نہیں لکھی جا رہی تھی جسے لکھنے کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ اس کی تحریروں میں آپسی منطقی تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ جو نہیں لکھ سکا تھا 'سچ' تھا۔ لکھتے لکھتے وہ کہیں گم ہو گیا تھا۔ اس مضمون میں اس نے جو بھی لکھا تھا وہ بھی سچ تھا لیکن ایسا سچ جو الفاظ یا زبان سے ماورا نہیں تھا اور اضافی نوعیت کا تھا۔ ساتھ ہی اسے اس بات کا بھی علم ہوا کہ اب ان بے ربط تحریروں میں کوئی ربط تلاش کرنا یا کسی کلی نوعیت کی صداقت کو کھوجنا بالکل بے معنی اور بے سود تھا۔ وہ بھٹک گیا تھا لیکن اس گم ہوئے ربط اور توازن کو دوبارہ حاصل کرنے کے تصور نے ہی اس کے ذہن اور دماغ کو ایک تکلیف دہ احساس سے دوچار کرا دیا۔ ایک شدید قسم کی اذیت ناک اداسی نے اسے جکڑ لیا۔ اسے لگا جیسے اسے بخار چڑھ رہا ہو۔ تب وہ چت ہو کر لیٹ گیا اور کاغذوں کے پلندے کو مایوسی کے ساتھ ایک طرف ڈال دیا۔ نہ جانے کہاں سے نیند آ کر اس کی آنکھوں کو بھاری کرنے لگی۔ بلب کی پیلی پیلی روشنی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ اس نے لحاف سے منھ ڈھک لیا لیکن لحاف کے چھدرے پن میں روشنی کا احساس باقی تھا۔ اس نے نیند سے بوجھل ہوتی ہوئی آنکھوں کو سختی سے بند کر لیا۔

کسی بھی قسم کی روشنی میں جو نیند لی جاتی ہے وہ اس نیند سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو پرسکون اندھیرے میں آتی ہے۔ روشنی میں آئی ہوئی نیند کچھ بے چین اور اکتائی اکتائی سی ہوتی ہے۔ اس نیند میں عجیب بے تکے مگر اداس کر دینے والے منظر بھی شامل ہوتے ہیں۔

اس نے دیکھا وہ اسکول کا بستہ لیے خاموش اپنے آبائی مکان کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

''جاؤ جا کر نیکر قمیص بدل لو اور دیکھو دونوں وقت مل رہے ہیں۔ مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ امتحان میں پاس ہونے کی دعا مانگنا۔'' ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ اس کونے سے نکل کر اس کھنڈر نما مکان کے بہت بڑے مگر ویران سے آنگن میں آ کھڑا ہوگیا۔ امرود کا ایک بڑا گھنا درخت آنگن میں کھڑا تھا جس کے اوپر سے شام پھسلتی چلی جارہی تھی۔ تب ہی قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز آنے لگی۔ اس کی ماں نے اپنے سفید دوپٹے سے سر کو اوڑھ لیا۔ وہ اپنے دل میں ایک عجیب سی پاکیزگی اترتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔

وہ بہت تیز تیز سڑک پر بھاگتا چلا جارہا تھا۔ آگے آگے اس کی سرخ رنگ کی ربڑ کی گیند تھی لیکن پھر یہ گیند اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور اس نے خود کو مجرم سا بنا ہوا ماں کے سامنے کھڑا دیکھا۔

''اب تمہارے اوپر نماز فرض ہے اور تم کو وضو کرنا بھی نہیں آتا۔ چلو بیٹھ کر وضو کرو۔ نیت کرو کہ میں وضو صرف ثواب اور خدا کی رضا مندی حاصل کرنے کی غرض سے کر رہا ہوں۔''

ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں اس کا چہرہ اور ہاتھ بھیگنے لگے۔

''ہاں اب چوتھائی سر کا مسح کرو اور پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھو کر اٹھ جاؤ۔''

''اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِی مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِی مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ.''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اسے لگا جیسے اس کی سانولی رنگت پہلے سے کچھ نکھر آئی ہے۔

''چلو نماز پڑھ لو۔ نماز تو تمہیں یاد ہے نا۔'' تین دروں والے ایک بڑے سے دالان کے نسبتاً صاف گوشہ میں ایک جانماز پڑی تھی۔ دالان کی دیوار پر بڑے بڑے مکڑی کے جالے لٹک رہے تھے۔

''نہیں پہلے مجھے گود میں لو۔'' اس نے ضد کی۔

''اتنے بڑے بچے گود میں نہیں چڑھتے ہیں۔''

''نہ...... پہلے گود میں لو۔'' وہ پھر مچلا۔

دو نرم نرم بازو اس کی طرف لپکے اور اسے گود میں اٹھالیا۔ چاروں طرف روشنی سی ہو گئی۔ ماں کے بوسیدہ سوتی کپڑوں سے ایسی خوشبو آرہی تھی جو باورچی خانے میں داخل ہوتے ہی آتی تھی۔

''میں دیکھتی ہوں تمہارا دل نماز میں بالکل نہیں لگتا۔ اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔ اللہ ناراض ہوتا ہے۔ آخر تمہیں تکلیف کیا ہوتی ہے نماز پڑھنے میں۔'' ماں کی آواز خشمگیں ہے مگر ماں کا چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔

''میر گھٹنے چھل جاتے ہیں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

''کمبخت ...... خدا سے توبہ کر، ابھی توبہ کر ورنہ عذاب پڑے گا۔''

ماں زور سے چلائی اور اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔

اچانک آسمان میں بہت سی لال پیلی پتنگیں اڑنے لگتی ہیں اور وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر گھر سے باہر چلا جاتا ہے لیکن نہ جانے کیسے چلتے چلتے خود کو اپنے محلے کی مسجد میں پاتا ہے اور سب کے ساتھ نماز پڑھنے لگتا ہے۔ نماز پڑھنے میں اس کا دھیان بار بار اپنے پیروں کی طرف چلا جاتا۔ سوکھے ہوئے کالے سے پیر جن پر بھدی سی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور انگوٹھوں کی بدنما بناوٹ...... ٹیڑھے میڑھے سے بڑھے ہوئے ناخن جن میں کالا کالا سا میل بھرا ہوا تھا۔ وہ سجدے میں جانا بھول گیا۔ تمام جماعت سر بہ سجود تھی اور اکیلا پشیمان پشیمان سا اپنے بدنما پیروں کو دیکھے جا رہا تھا۔ آندھی کا سا ایک جھونکا آیا جس نے اسے مسجد سے اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اب وہ سڑک پر گندگی اور کوڑے کے ایک ڈھیر پر گرا پڑا تھا اور اس کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہ تھا۔ وہ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا اور لاکھ کوشش کے باوجود اٹھ نہیں پا رہا تھا جیسے معذور ہو گیا ہو۔ اس کے سامنے مسجد کے تین عظیم الشان گنبد تھے جن سے وقار اور پاکیزگی ٹپک رہی تھی۔ وہ یک ٹک ان گنبدوں کو دیکھنے لگا لیکن تب ہی اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جسم اور چہرے کا تمام گوشت گل گل کر گر رہا ہو۔ اب وہاں وہ نہیں تھا اس کی جگہ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ اب اس میں صرف دانت تھے، ہڈیاں تھیں اور آنکھوں کی جگہ دو غار تھے۔ یہ بہت خوفناک اور بھیانک شکل تھی۔ یہ اس کے اندر سے کون نکل آیا تھا۔ شاید وہ زور سے چیخا تھا مگر آواز اس کے حلق سے باہر نہیں سنائی دی۔ تب اسے سخت پیاس لگی۔ یکا یک یہ منظر بھی بدل گیا اور اس نے خود کو ایک بوسیدہ سی چارپائی پر سفید چادر سے ڈھکا ہوا پایا۔ اس کے دونوں انگوٹھے آپس میں کس کر باندھ دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے وہ سر سے لے کر پیر تک ایک سا نظر آ رہا تھا بالکل سیدھا سیدھا۔ اس کی چارپائی ایک مسجد کے سامنے رکھی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی لکھوری اینٹوں کی بنی مسجد تھی جس کے گنبدوں میں جگہ جگہ سے سوراخ ہو گئے

تھے۔ جگہ جگہ برساتی گھاس پنپ آئی تھی جسے کچھ آوارہ چڑیاں نوچ نوچ کر اپنی چونچوں میں بھر رہی تھیں۔ آس پاس چٹیل میدان تھا۔

وہ خود اس مسجد کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں پر خاموش اور اداس بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے اس کا جنازہ رکھا تھا۔ پھر نہ جانے کہیں سے سفید کپڑوں میں ملبوس اور ٹوپیاں لگائے چند لوگ وہاں آ کر کھڑے ہو گئے۔ تب ان میں سے ایک جو شاید امام تھا میّت کے سینے کے مقابل آ کھڑا ہوا، باقی لوگوں نے صفیں باندھ لیں اور وہ اس کی نمازِ جنازہ ادا کرنے لگے۔ تیسری تکبیر کے بعد دعائے مغفرت پڑھی جانے لگی۔

اب پھر شام ہو رہی تھی۔ پھر دونوں وقت مل رہے تھے۔ سورج مغرب کی ڈھلان میں اتر گیا تھا اور اندھیرا سا پھیلتا جا رہا تھا۔ اسی وقت کہیں دور زور زور سے ملبہ گرنے کی آواز آنے لگی۔ پھر جیسے ایک بھونچال سا آ گیا۔ اب وہ بالکل اکیلا اس ویران اور چٹیل میدان میں پریشان کھڑا تھا۔ اب نہ وہاں مسجد تھی نہ اس کا جنازہ اور نہ وہ لوگ۔ تب ہی کہیں دور سے اذان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ عجیب اداس سی آواز، اذان کی آواز کے ساتھ ہی اسے کوندے کی طرح لپکتا ہوا اپنی ماں کا صاف و شفاف چہرہ نظر آیا اور وہ زور زور سے روتا ہوا اسے ہاتھوں سے تھامنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا ہے...... کیوں بڑ ا رہے ہو۔ ہوشیار ہو جاؤ۔'' اس کی بیوی اس کے حلق سے نکلنے والی دردناک آواز کو سن کر سوتے سے جاگ پڑی۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ ہڑا بڑا کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لحاف اس کے اوپر سے ہٹ کر دور جا گرا تھا اور وہ بری طرح سردی سے کانپ رہا تھا۔

''کیا بات ہے، کیوں اٹھ رہے ہو۔'' بیوی تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے پاس آ گئی۔

''کچھ نہیں ......نماز پڑھوں گا۔'' اس نے بالکل اجنبی نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پچاس سالہ شادی شدہ زندگی میں پہلی بار آج اس نے اپنے شوہر کی یہ نظریں دیکھی تھیں۔ بالکل بیگانی اور حال سے غائب اور کٹی کٹی سی۔ ان آنکھوں میں کچھ ایسا تھا جسے دیکھ کر وہ ڈر گئی۔

''تم نے کبھی زندگی بھر نماز پڑھی ہے؟'' بیوی نے اس کے جسم کو لحاف سے ڈھکتے ہوئے کہا تب ہی اس کو احساس ہوا کہ وہ بخار سے جل رہا تھا۔ ''ارے کس قدر تیز بخار ہے

تمہیں اور تم بے وجہ سردی کھا رہے ہو۔ سر لحاف کے اندر کرلو۔'' بیوی نے اسے سر تک لحاف اوڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نماز پڑھوں گا۔ ابھی اذان ہوئی ہے۔'' وہ لگ بھگ گڑگڑا کر بولا۔

''اذان...... ابھی تو رات ہے۔ اگر دل گھبرا رہا ہو تو تھوڑا سا دودھ گرم کر کے لے آؤں؟'' بیوی نے فکرمند لہجہ میں کہا۔

''میں نماز پڑھوں گا۔'' اس نے اس طرح جواب دیا جیسے بیوی کی بات سن ہی نہیں سکا تھا۔

ایک پل کے لیے بیوی کے دل کو ایک بھیانک اندیشے نے گھیر لیا۔ بخار کی شدت کی وجہ سے یہ آج بالکل ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں جلدی سے صبح ہو جانے کی دعا مانگی۔ اب اسے اس رات سے گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ خود اسے بھی بے حد سردی محسوس ہونے لگی۔ کمرے کی لائٹ آف کر کے وہ اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔

وہ چپ چاپ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ یہ سچ تھا کہ بچپن کو چھوڑ کر اپنی تمام زندگی میں اس نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ مذہب سے اسے کبھی کوئی لگاؤ ہی نہیں رہا تھا۔ بچپن میں بھی جہاں تک اس کو یاد پڑتا تھا جب بھی اس نے نماز پڑھی تھی تو اس کا دھیان نماز میں کم اور اپنے اور جماعت میں کھڑے دوسرے لوگوں سے اپنے پیروں کا موازنہ کرنے میں زیادہ لگا رہتا تھا۔

جب کمرے میں اندھیرا ہو گیا تو اس نے پھر سے لحاف سر سے ہٹا دیا اور تاریکی میں گھورنے لگا۔ بے اختیار اسے اپنی ماں یاد آنے لگی۔ پل بھر کے لیے اس نے خود کو چھوٹا سا بچہ تصور کیا اور بے اختیار دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے اپنے ہاتھ اس طرح پھیلائے جیسے وہ اس کروٹ لیٹی اپنی ماں کے گلے میں حمائل ہو جانا چاہتے ہوں لیکن وہ ہاتھ صرف اندھیرے میں لیٹی دیوار سے ٹکرا کر بستر پر جھول گئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ تمام جسم تیز بخار سے جل رہا تھا لیکن پیر برف کی طرح ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ اس نے بے حد کس کر آنکھیں بند کرلیں اور آنسو اس کی بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں جذب ہونے لگے۔

اب باہر پھر کوئی کتا بھونک رہا تھا۔ اس بار بجائے پولیس کی گاڑی یا سائرن کے اسے دور سے ہواؤں پر بھٹکتی ہوئی کسی ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ہواؤں کی اپنی ایک چھٹی حس ہے جس سے وہ گزرتے ہوئے وقت کو پہچان لیتی ہیں اور اپنے انداز بدل دیتی ہیں۔ باہر چلنے والی ہواؤں کی رفتار پہلے سے کم ہوگئی تھی اور اب وہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہی تھیں۔ تھکی تھکی اور اداس سی۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ رات قریب قریب گزر چکی تھی اور پو پھوٹنے کا وقت زیادہ دور نہیں تھا۔

اچانک وہ پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کہیں دور فجر کی اذان ہو رہی تھی۔

''میں نماز پڑھوں گا۔'' وہ شاید چیخ کر یہ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز ایک سرگوشی سے زیادہ نہ ابھر سکی۔ تب ہی اسے خیال آیا کہ وہ تو پتہ نہیں کب سے ناپاک ہے۔ اسے پہلے غسل کرنا چاہئے۔ اس نے سوچا۔

لحاف کو پیروں سے دور ہٹاتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو پلنگ کی پٹیوں پر جماتے ہوئے وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر کار وہ سیدھا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مدتوں سے اسی جگہ رہنے کا تجربہ اسے راستہ دکھا رہا تھا اور وہ اس اندھیرے میں بھی کمرے کا دروازہ کھول سکتا تھا۔ دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی تیز اور سرد ہوا کا ایک جھونکا اندر چلا آیا۔ اس کا سارا جسم سخت قسم کی سردی سے کانپنے لگا اور اس کے دانت اس بری طرح کٹکٹانے لگے کہ اس کی زبان دانتوں کے درمیان پھنس گئی اور منہ سے خون کی ایک پتلی سی لکیر ہونٹوں اور تھوڑی پر رینگنے لگی۔ اب وہ بغیر سہارے کے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس کا تمام جسم لرز رہا تھا اور کھڑے کھڑے توازن برقرار رکھ پانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ آخر بے حد مجبور اور لاچار ہو کر وہ فرش پر بیٹھ گیا اور چاروں ہاتھ پیروں کے سہارے گھسٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا فرش اس کے ہاتھوں، گھٹنوں اور ایڑیوں کو چبھ رہا تھا۔ مدتوں بعد آج پھر اس کے گھٹنے چھلنے لگے۔ غسل خانہ دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پلنگ کے نیچے بیٹھی بلّی اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کی بیوی رات بھر بے چین رہنے کے بعد اس وقت شاید بے خبر سو رہی تھی۔

وہ اسی طرح غسل خانے میں داخل ہوا۔ دل ہی دل میں اس نے غسل کے تین فرائض دہرائے: تمام بدن پر پانی بہانا۔ منہ بھر کر کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا۔ سب سے

پہلے اسے اپنے تمام بدن پر پانی بہانا تھا۔ اندازے سے ٹھیک ٹونٹی کے نیچے بیٹھ کر اس نے اسے کھول دیا۔ برف جیسے ٹھنڈے پانی کا ایک ریلا اس کے سر سے لے کر پاؤں تک بہنے لگا۔ بخار کی شدت سے جلتے ہوئے بدن میں سے جیسے بھاپ سی اٹھنے لگی۔ اس کا مدتوں سے بیمار اور رعشہ زدہ جسم برفیلے پانی سے شرابور ہو کر بے حس ہونے لگا۔ پھر یونہی بیٹھے بیٹھے اس کا کمزور سر بے جان ہو کر غسل خانے کے فرش پر اس طرح ڈھلک گیا جیسے سجدہ کرنا چاہتا ہو۔

غسل خانے کے فرش پر اب تیز اور بھدے شور کے ساتھ پانی بہہ رہا تھا۔ آسمان کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ باہر بیٹھی ہوئی کالی بلّی نے اوپر کی طرف منہ اٹھایا تھا اور ایک دردناک آواز میں رونے لگی تھی۔

☆☆☆

مذبح کی بھیڑیں

خورشید اکرم

مذبح کو جانے والے اس راستہ پر بھیڑوں کے ریوڑ آتے رہتے ہیں۔ یہاں سے گذرنے والے ریوڑوں میں بھیڑوں کی تعداد کم یا زیادہ ہوسکتی ہے لیکن بھیڑیں ساری ایک ہی ہوتی ہیں۔ پہلی صف کے پیچھے پیچھے ایک دوسرے میں گھُسی گھُسی چابک سے جلدی جلدی چلنے والی انہیں ہانکنے والے بھی سبھی ایک سے ہوتے ہیں جن کی مشترکہ شناخت ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے ہاتھ میں چابک لیے ریوڑ کے آگے پیچھے چلتے ہوئے اسے ہانکتے رہتے ہیں۔

ریوڑ کے ہانکنے والے عام طور پر گڈریا کہلاتے ہیں جن کے بارے میں کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ اپنی بھیڑوں کو جنگل میں چرانے لے جاتے ہیں۔ بھیڑیں دن بھر اپنی مرضی سے چرتی رہتی ہیں اور شام ڈھلنے سے پہلے انہیں ہاک کر باڑہ میں واپس لے آیا جاتا ہے۔ سو انہیں اپنے ہنکائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جس راستہ کا بیان ذکر ہے اس پر ہانکے جانے والی بھیڑیں جنگل کو نہیں مذبح کو لے جائی جاتی ہیں، اور ان کو ہانکنے والے کچھ بھی کہے جاسکتے ہیں مگر گڈریئے نہیں۔

ہانکنے کے کام پر مامور یہ تین چار آدمی بہت دیر سے بھیڑوں کو ہانکے چل رہے ہیں بھیڑوں کو ہانکنا اب ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے کیونکہ یہ بہت دنوں سے اس کام پر معمور ہیں اور بھیڑوں کی فطرت جانتے ہیں۔ ویسے جیسا کہ یہ خود ہی کبھی کہتے ہیں۔ بھیڑوں کی کوئی خاص فطرت نہیں ہوتی ہے۔ اس سے ان کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی فطرت نہیں جس کی وجہ سے انہیں کبھی کچھ زیادہ پریشانی ہوتی ہوا گرچہ ان کے سر پر سینگیں ہوتی ہیں اور بلکہ بعض بعض کی تو کافی بڑی بڑی ہوتی ہیں۔

ہانکنے والوں کے ہاتھوں میں چھوٹی سی ایک چھڑی ہوتی ہے جس کے سرے پر تقریباً دو ہاتھ لمبی تیل پلائی ہوئی مضبوط ستلی بندھی ہوئی ہوتی ہے جسے چابک کہتے ہیں اور جسے ہوا میں

مارنے سے ایک ڈ......شا......پ......کی آواز ہوتی ہے چابک کا استعمال کرنے کی نوبت کبھی کبھی آتی ہے۔ جب کوئی بھیڑ چلتے چلتے رکنے لگتی ہی یا ان کے منشا کے برخلاف ریوڑ سے نکل کر کسی دوسرے راستہ کی طرف مڑنے کی کوشش کرتی ہے تو یہ اس پر ایک آدھ چابک جما دیتے ہیں۔ چابک کی مار سے تلملا کر بھیڑ سیدھے راستہ پر آجاتی ہے اور اس سے دوسرے بھیڑیں بھی بدک جاتی ہیں۔ ایسے وقت میں عام طور سے بے فکری سے چلنے والی بھیڑوں میں ایک طرح کی کھلبلی مچ جاتی ہے اور وہ سب چابک کے خوف سے ایک دوسرے میں گھسی گھسی چلتی ہیں۔ جو بھیڑیں کنارے کی طرف ہوتی ہیں وہ چابک کی مار سے بچنے کے لیے بیچ میں گھس جانا چاہتی ہیں۔ مذبح پہنچنے تک راستہ بھر ان میں آپس میں یہ دھکم پیل چلتی رہتی ہے۔ حالانکہ اطمینان انہیں وہاں بھی نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہ جانتی ہیں کہ ہانکنے والے بیچ میں گھس کر بھی چابک چلا سکتے ہیں۔

یہ بھیڑیں بہت دیر سے چل رہی ہیں اور تھک بھی گئی ہیں لیکن انہیں رکنا نہیں ہے کیونکہ ان کے ہانکنے والے ہاتھ میں چابک لیے مستعدی سے چل رہے ہیں۔

ریوڑ کے بیچ میں چلنے والی ایک بھیڑ نے جو بہت دیر سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کو اور اس کے ساتھیوں کو کہاں ہانک کر لے جایا جا رہا ہے اپنی گردن ذرا اونچی کر کے ریوڑ کے باہر دیکھا تو اسے اپنے آس پاس کی دنیا ویسی نہیں لگی جیسی وہ دیکھتی آئی ہے۔ بہت دیر سے کوئی اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا۔ اس لیے وہ پہلے بیچ سے نکل کر کنارے آئی جہاں چابک پڑنے کا خطرہ ہر وقت بنا رہتا ہے۔ کنارے آکر کچھ دیر چلنے کے بعد اسے بہر حال یہ اندازہ ہو گیا کہ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس پر وہ اکثر چلا کرتی تھی اور اپنے باڑہ میں واپس آجاتی تھی۔ اس نے ایک بار رک کر اپنے اردگرد غور سے دیکھ لینا چاہا۔ اس نے رک کر گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھنے بھر کے اس عمل میں ریوڑ اس سے پانچ سات میٹر آگے نکل گیا۔ ہانکنے والوں میں سے ایک پلٹ کر پیچھے آیا اور ایک چابک سٹاک سے اس کے بدن پر پڑا۔ وہ بلبلا کر رہ گئی اور دوسرا چابک پڑنے سے پہلے ہانکے کے اشارہ پر لپک کر ریوڑ میں شامل ہو گئی۔ اس کا بدن چابک کے مار سے بلبلا رہا تھا لیکن پھر بھی یہ ایک سوال اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی ایک بھیڑ سے پوچھا۔

''یہ ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں''

''جہاں لے جائے جا رہے ہیں''
''مگر...... ہم کہاں لے جائے جا رہے ہیں۔
''جہاں روز لے جائے جاتے ہیں''
''لیکن دیکھو ہم جہاں روز لے جائے جاتے ہیں یہ وہ راستہ نہیں ہے''
''چپ چلتے چلو...... ورنہ ابھی چابک پڑے گا۔
......لیکن...... لیکن یہ ہم پر چابک مارنے والا ہوتا کون ہے''
بھیڑ نے پلٹ کر اس سرکش بھیڑ کو دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کس طرح کے سوال کر رہا ہے اسے لگا یہ پاگل ہوگئی ہے سو اسے چھوڑ کر بیچ میں گھس گئی۔
ذرا دیر پہلے جو چابک کی مار اس کے بدن پر پڑی تھی اس سے ٹیس کی لہر ایک بار پھر اٹھی اور ایک بار پھر اس کے من میں یہ سوال تازہ ہوا کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں۔ اپنے ساتھ چلتے ہوئے ایک دوسری بھیڑ سے اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
''کیا تم نے یہ سوچا ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں''
''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ہم تو اپنے آگے والوں کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں''
''لیکن کیا یہ ہمارے آگے والوں کو کچھ پتہ ہے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں''
''پتہ نہیں ...... اتنا کہہ کر اس بھیڑ نے ایسے چپ سادھ لی جیسے اسے اس طرح کی باتوں سے کوئی سروکار نہ ہو۔
''لیکن کیا ہمارے آگے والوں کو کچھ معلوم ہے کہ ہم کہاں چل رہے ہیں''
اس نے ایک بار پھر کہا
اس بار چپ سادھ لینے والی بھیڑ کی آنکھوں میں پے پہ پے سوال کرنے والی اس بھیڑ کے تئیں شدید بے زاری تھی۔ اس نے اسے غصے سے دیکھا اور اس کے الٹے سیدھے سوالوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے آنکھ بند کر کے ریوڑ کے ساتھ چلنے لگی۔
اس بھیڑ نے جس کے بدن پر ایک چابک زور کا پڑ چکا تھا اور جس کے من میں خدشہ لگا تار ٹھوکے مار رہا تھا ایک بار پھر اپنے اردگرد نظر دوڑائی اپنے آس پاس کی اجنبی اور نامانوس فضا کو دیکھ کر اس کے اندر کھلبلی سی ہوئی۔ اتنی دیر میں پھر ریوڑ آگے نکل گیا تھا۔ ہانکنے والے نے پہچان لیا کہ یہ وہی بھیڑ ہے جو کچھ دیر پہلے بھی ریوڑ سے الگ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی

تھی۔اس لیے اس نے اسے قابو میں کرنے کے لیے اب کی بار اور زور سے چابک مارا۔اتنی زور سے کہ اس کے بلبلانے کی آواز آگے نکل گئے ریوڑ کی ایک ایک بھیڑ نے سنی۔اب کی بار اسے کھدیڑ کر بالکل آگے کر دیا گیا۔

آگے کی بھیڑیں کوئی اس طرح صف بنا کر نہیں چل رہی تھیں کہ جو ابھی آگے ہیں وہ شروع ہی سے آگے تھیں اس کا اندازہ اس بھیڑ کو کچھ دیر تک آگے آگے چلنے کے بعد ہوا لیکن اس وقت صف کے ترتیب سے ہونے یا نہ ہونے اور دو چابک کی مار کی ٹیسوں سے زیادہ وہ سوال اس کے اندر ٹہوکے مار رہا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اس کے من میں آیا تھا۔اس نے اگلی صف میں اپنے ساتھ چلنے والی ایک بھیڑ سے ذرا غصہ سے پوچھا۔

''تم......آگے آگے چل رہی ہو کیا تمہیں پتہ ہے کہ ہم لوگ کہاں لے جائے جا رہے ہیں''

''مجھے کیا پتہ......

''تمہیں اگر پتہ نہیں ہے تو چل کیوں رہی ہو......''

''اس لیے کہ ہم اتنے سارے ایک ساتھ چل رہے ہیں۔اور یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں ہم پیدا ہوئے تھے تو ہم نے اپنے باپ کو اس طرح چلتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی ہم بھی ریوڑ کے ساتھ چلنے لگے تھے۔''

''لیکن تم کیا غور نہیں کرتے کہ یہ وہ راستہ نہیں ہے جس پر ہم اس سے پہلے چلا کرتے تھے۔''

''کیوں ......کیا ہوا اس راستے میں سب کچھ تو ویسا ہی ہے۔نیچے زمین ہے اوپر آسمان ہے اور ہم سب اتنے سارے ساتھ ہیں ہم اسی طرح چلتے رہے ہیں اور ہمارے باپ بھی اسی طرح......

''......ہمارے باپ! ......ہاں ٹھہرو ......کیا تمہیں معلوم ہے کہ اسی طرح ایک بار ہمارے باپ ریوڑ کے ساتھ چلے تھے اور آج تک واپس نہیں آئے۔''

''کیا پتہ ......خیر چھوڑو! ذرا جلدی جلدی چلو'' اس نے چابک کی طرف دیکھا جو ہوا میں لہرایا تھا۔ہانکنے والے رہ رہ کر اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ان کے قدم تیز ہو جاتے چابک ہوا میں لہرایا اور اس سے بھیڑوں کو سمجھ لینا پڑتا کہ انہیں جلدی جلدی چلنا ہے۔

''تمہیں کچھ معلوم نہیں تم کچھ جانتی نہیں اور تم جاننے سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتیں اور یہ پیچھے والے تمہاری دیکھا دیکھی چل رہے ہیں کہ تم آگے ہو اور تمہیں ٹھیک معلوم ہو۔

''میرے پیچھے کیوں ...... میں تو ابھی ذرا پہلے دھکم پیل میں آگے آ گئی۔ اتنی دیر سے تو میں خود پیچھے تھی''

یہ تم جانتی ہو کہ تم پہلے سے پیچھے تھیں لیکن جو پیچھے ہیں وہ سمجھتی ہیں کہ تم اور ہم جو اس وقت آگے آ گئے ہیں، ہمیں صحیح صحیح معلوم ہوگا کہ ہم کہاں ہانکے لیے جا رہے ہیں ...... اور ہمیں تمہیں کچھ نہیں معلوم ...... اور یہ سب اس دھوکہ میں ہیں کہ ہم ......

عجیب ایک سوال اس کے دماغ میں آیا تھا جس کی وجہ سے اس کو دو چابک پڑ چکے تھے اور جس کی ٹیس ابھی تک رہ رہ کر اس کے بدن میں اٹھ رہی تھیں۔ انہیں ٹیسوں نے ایک اور سوال اس کے من میں کھڑا کر دیا کہ پاؤں ان کے ہیں اور اگر وہ اپنے پاؤں سے چل رہی ہیں تو انہیں یہ معلوم کرنے کا حق تو ہے ہی وہ کہاں لے جائے جا رہی ہیں اور اس نے تو صرف یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ سب آج کہاں لے جائے جا رہی ہیں۔ اس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا پھر اسے صرف اتنی سی بات جاننے کے جرم میں کوڑے کیوں پڑے۔ سو چلتے چلتے اس بار اس نے آگے کی ایک بوڑھی بھیڑ سے ایک ساتھ دو سوال پوچھے۔ ایک تو یہی کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں اور دوسرا یہ کہ انہیں جاننے کا حق ہے کہ نہیں کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں۔

بوڑھی بھیڑ نے ترحم آمیز نظروں سے اس بھیڑ کو دیکھا جس کو دو چابک پڑ چکے تھے اور جو اس کے باوجود ایک ساتھ دو سوال کر رہی تھی اسے اس کی ہٹ پر رحم بھی آیا اور خوف بھی چنانچہ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر اپنی رفتار ذرا سست کر کے وہ ریوڑ کے بیچ میں آ گئی۔

ہانکنے والے پوری مستعدی سے ریوڑ ہانک رہے تھے اور بھیڑ ایک دوسرے میں گھُسی گھُسی جلدی جلدی چل رہی تھیں کہ ہانکنے والوں نے دیکھا کہ آگے کی ایک بھیڑ جس کو دو چابک پہلے ہی پڑ چکا تھا، تیزی سے لپکتی ہوئی آگے نکلی اور ریوڑ سے الگ ایک طرف مڑ کر دوڑنے لگی ہانکنے والے نے ایک دوڑ لگائی اور شڑاک سے ایک چابک اس کے بدن پر جما دیا۔ بھیڑ بلبلائی اتنی زور سے کہ ایک بار پھر پورے ریوڑ نے اس کی بلبلاہٹ کی آواز سنی لیکن وہ رکی نہیں، وہ بھاگتی رہی بقیہ بھیڑوں کو دوسرے ہانکنے والوں نے روک لیا۔ وہ تعداد میں اتنی تھیں، اکٹھی تھیں مگر خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں اور ان میں زبردست کھلبلی مچی ہوئی تھی

کہ کسی بات پر انہیں بھی اسی طرح چابک نہ پڑنے لگے۔ ادھر بھاگتی ہوئی بھیڑ کے بدن پر ایک اور چابک ...... اور اس بار چابک کی تلی اس کے بدن کے روئیں میں الجھ گئی جس کو کھینچنے میں اس کے بدن کا رواں ...... چر ...... چر ...... کی آواز کے ساتھ کچھ زمیں پر گرا، کچھ چابک میں لپٹا ہوا چلا آیا بھیڑ کے بدن کے زخمی حصّے سے خون رسنے لگا۔ بھیڑ ادھ مری ہوگئی تھی لیکن اس کے اندر اپنے تحفظ کا احساس شدید تر ہوگیا تھا۔ اب اور بھاگنے کی بجائے اس نے پلٹ کر اپنی سینگوں سے ہانکنے والے پر حملہ کرنا چاہا۔ تھوڑی دیر پہلے جب کہ اسے پہلا چابک پڑا تھا اور جب اس کا بدن اس طرح زخمی نہیں ہوا تھا اسی وقت اگر اس کے اندر اپنے تحفظ کا احساس اسی شدت سے جاگ جاتا اور وہ ہانکنے والے پر اسی طرح لپک پڑتی تو شاید اس وقت کوئی دوسرا ہی منظر قلم بند کیا جاتا۔ فی الوقت ہوا یہ کہ اسے اپنی طرف حملہ کرنے کا پوز بناتا دیکھ کر ہانکنے والے نے تڑاتڑ کئی چابک اسے لگا دیے بلکہ دو تین لاتیں بھی جما دی بھیڑ ایسی ادھ مری ہوگئی تھی کہ بلبلاتے اور غراتے ہوئے زمین پر پڑی رہی۔ اس نے پڑے پڑے پورے ریوڑ پر نظر دوڑائی جہاں ایک طرح کی شانت کھلبلی مچی ہوئی تھی بھیڑوں میں خوف اور اس زخمی بھیڑ کے تئیں انتہائی ہمدردی تھی اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے؟ زخمی بھیڑ اس شدید تکلیف کے باوجود سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے اتنے سیدھے سے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے اسے کیوں مارا گیا اور یہ سوچ کر اس کے من میں کرودھ آرہا تھا، لیکن اب اس کے اندر اتنی تاب نہیں تھی کہ وہ اپنے اوپر چابک چلانے والے کے پیٹ میں اپنی سینگ گھونپ دے۔ اور اب وہ اسی کرودھ اور بے چارگی میں اپنی ان ساتھی بھیڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی جن کے سر پر سینگیں تھیں، جو اپنے پیروں پر کھڑی تھیں، جن کو کوڑے نہیں پڑے تھے اور جن کے اندر اس کے خیال میں یقیناً اتنی تاب تھی کہ وہ چاہیں تو ہانکنے والوں کے پیٹ میں اپنی سینگیں گھونپ دیں۔

ایک اور چابک اس کے بدن پر پڑی اور اس کی آنکھوں کے سامنے بالکل اندھیرا چھانے لگا۔ اس میں چلنے تک کی تاب نہیں رہ گئی تھی مگر اس کے اندر کوئی ایسا ہٹی پیدا ہوگیا تھا جس نے یہ طے کرلیا تھا کہ اسے اب وہاں سے نہیں کھسکنا۔ ہانکنے والے نے اس کے پیٹ میں لات گھسا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ اٹھی بلکہ یوں کہا جائے کہ اٹھی نہیں۔ ریوڑ میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ آخر اسے کیا ہوا ہے؟ کیا اب یہ زندہ بچ پائے گی۔ یہ چھوڑ کر

کہاں بھاگ رہی تھی۔ اور کیوں؟ صرف سوال تھے جو سب ایک دوسرے سے کر رہی تھیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ یہ سوال نہیں تھے یہ تو ان کی حیرت اور خوف تھا جو ان دو ایک سوالوں کی صورت میں ادھر اُدھر رینگ رہا تھا۔ وہ بھیڑیں جن سے زخمی بھیڑ نے اپنے من کے سوال دوہرائے تھے، خاموش تھیں بلکہ اس سوال سے بچنے کے لیے اپنی اپنی آنکھیں مونده کھڑی تھیں۔

ہانکنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ بھیڑ اتنی زخمی ہو چکی ہے کہ اب اس میں چلنے کی تاب نہیں رہی ہے انہوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں۔ ریوڑوں کو ہانکنے کا تجربہ انہیں بتاتا ہے کہ کبھی کسی ریوڑ سے اس طرح کی کوئی سرکش بھیڑ نکل آتی ہے جسے لاکھ مارو وہ اپنی ہٹ پر اڑی رہتی ہے۔ ایسے موقعوں کے لیے انہیں اجازت بلکہ ہدایت تھی کہ ایسے ہٹی اور زخمی بھیڑ کو راستے میں چھوڑ دیں کیونکہ باقی ساری بھیڑوں کا بہ حفاظت مذبح پہنچ جانا زیادہ اہم ہے...... تو انہوں نے آپس میں باتیں کیں اور طے کیا کہ اسے یہیں چھوڑ کر باقی بھیڑوں کو لے کر آگے کوچ کیا جائے ریوڑ میں پہنچنے کے بعد انہوں نے آگے پیچھے اور دائیں سب طرف سے اپنی اپنی پوزیشن سنبھالی اور ان کے چابک ہوا میں لہرائے جس کا اشارہ ریوڑ کی طرف صاف تھا کہ آگے بڑھے۔ رکی ہوئی بھیڑیں جن کے اندر انتہائی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی اور جن کے کانوں میں اپنے ایک زخمی ساتھی کے بلبلانے اور تڑپنے چیخنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی چابک کے اشارہ پر ایک دوسرے میں گھس گھسا کر آگے بڑھنے لگیں۔ ان میں پلٹ کر اپنے اس زخمی ساتھی کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا جو کچھ دیر پہلے تک بخیر وعافیت ان کے ساتھ چل رہی تھی اور اب سرکشی کی سزا میں زخموں سے چور پڑی تھی۔

زخمی بھیڑ نے اپنی دھندلائی آنکھوں سے ان بھیڑوں کو دیکھا کہ پاؤں بدن اور سینگ سلامت تھے مگر چابک سے خائف سہمی سہمی چلے جا رہی تھیں اور سرکش پیروں سے ادھڑی ہوئی ہوائی زمین کا ایک ٹکڑا پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔

راستہ بھر ساری بھیڑیں ایک دوسرے سے پوچھتی رہیں، آخر اسے ہوا کیا تھا؟ وہ کہاں بھاگ رہی تھی اور کیوں، کیا وہ زندہ بچ پائے گی۔

مذبح کے احاطے میں داخل ہونے تک وہ ایک دوسرے سے بار بار سوال پوچھ رہی تھیں۔

تعاقب

رضوان الحق

('کچھ سامان' کے طالب کی نذر، کہ جس کا کھویا ہوا سامان اس طالب کا تعاقب کر رہا ہے)

طالب جے. این. یو. سے تاریخ میں پی. ایچ. ڈی. کر رہا ہے۔ وہ ہاسٹل کی دوسری منزل پر کمرہ نمبر ۲۲۷ میں رہتا ہے۔ اسے یہ کمرہ پی. ایچ. ڈی. میں آنے کے بعد ملا تھا، ایم. فل. تک وہ جس کمرے میں رہتا تھا اس میں دو طالب علموں کو رہنا ہوتا تھا۔ طالب سے قبل جو طالب علم اس کمرے میں رہتا تھا وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور اس کے والدین اسے گھر واپس لے گئے تھے۔ اس کے جانے کے بعد جب یہ کمرہ طالب کو ملا تھا تو اس کے ایک دوست نے منع کیا تھا کہ اس کمرے میں مت جاؤ یہ کمرہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لڑکے کو تو تم نے دیکھا ہی ہے وہ کس طرح پاگل ہو کر گیا ہے۔ سنتے ہیں اس سے قبل جو لڑکا اس کمرے میں رہتا تھا وہ بھی پاگل ہو گیا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مدتوں پہلے ایک طالب علم نے اس کمرے میں خودکشی کر لی تھی اور اس کی روح ابھی تک اس کمرے میں رہتی ہے۔ وہ خودکشی بھی کوئی معمولی خودکشی نہیں تھی، کہتے ہیں کہ اس نے اپنی کلائی کی رگ کاٹ لی تھی اور چپ چاپ جسم کا سارا خون بہہ جانے دیا تھا۔ اس کے خون کے نشان اب تک اس کمرے کی فرش پر موجود ہیں۔ اس کی خودکشی کے بعد خون کے داغوں کو دھونے کی بہت کوشش کی گئی تھی لیکن وہ دھبے چھوٹ نہ سکے تھے۔ اتنا ہی نہیں، اس کمرے میں مغربی دروازے کے اوپر چھت تک ایک شگاف ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ خودکشی کرنے والے اس طالب علم کی روح اسی شگاف سے کمرے میں آتی جاتی ہے۔ اس شگاف کی کئی بار مرمت ہو چکی ہے لیکن کچھ دنوں بعد وہ شگاف پھر ویسے کا ویسا ہو جاتا ہے۔

یہ بات ہاسٹل کے سبھی لوگ حکایت کی طرح جانتے ہیں اور جب تفریحی کیفیت میں ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو سناتے بھی ہیں۔ لیکن عام طور پر لوگ اسے حکایت کے طور پر ہی سنتے سناتے ہیں اسے حقیقت نہیں مانتے ہیں۔ طالب کو جب یہ کمرہ ملا تو مستقل طور پر اس

کمرے میں جانے سے قبل، کمرے کا جائزہ لینے کے لیے وہ اس کمرے میں گیا، کچھ دوست بھی اس کے ساتھ ہو لیے، چونکہ اس سے قبل کا طالب علم پاگل پن کی حالت میں کمرہ چھوڑ گیا تھا اس لیے اس کے والدین اس کی بہت ضروری چیزیں ہی لے گئے تھے اور باقی سارا سامان یوں ہی ادھر ادھر بکھرا پڑا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ طالب کے دوستوں نے کمرے کی حالت دیکھی، پھر خون کے داغ اور دروازے کے اوپر کا شگاف دیکھا، ایک جگہ کتھئی رنگ کا بڑا داغ تھا اور کچھ چھوٹے چھوٹے داغ تھے جیسے کوئی شخص خون ٹپکاتا ہوا باہر گیا ہو۔ اگرچہ ان داغوں کو دیکھ کر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ خون ہی کے داغ ہیں لیکن پورے اعتماد کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ خون کے داغ نہیں ہے۔ یہ بات تو واضح تھی کہ وہ فرش کا رنگ نہ تھا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ فرش کو دھونے کی بہت کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش میں کہیں کہیں سے فرش ہی ٹوٹ گیا تھا۔ کمرے کی یہ حالت دیکھ کر ان لوگوں نے طالب سے یہ کمرہ نہ لینے کی صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''طالب یہ کمرہ مت لو، مجھے تو واقعی ڈر لگ رہا ہے۔''

''تم بھی یار عجیب شے ہو، جے۔ این۔ یو۔ میں پڑھ کر بھی ان سب توہمات میں یقین رکھتے ہو۔''

''نہیں، یقین تو میرا بھی نہیں ہے لیکن اگر کچھ ہو گیا تو؟ بلا وجہ خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ؟ باقی سب باتوں کو اگر جھوٹ بھی مان لیا جائے تو بھی پہلے والے لڑکے کو تو ہم سب نے دیکھا ہی ہے، وہ کس طرح دیوانہ ہو کر گیا تھا۔''

''دیوانہ ہوا تو کسی وجہ سے دیوانہ ہوا ہوگا، کیا دوسرے کمروں کے لڑکے دیوانے نہیں ہوتے ہیں؟ میں تو پچھلے چار سال سے جے۔ این۔ یو۔ میں ہوں یہاں تو ہمیشہ ہی ایک دو لڑکے پاگل ہوتے رہتے ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ رک گیا اور کمرے کا ادھر ادھر سے جائزہ لینے لگا، پھر ظریفانہ لہجے میں بولا۔

''ویسے بھی مجھے تو لگتا ہے کہ یہاں کے نوے فیصد لڑکے کچھ نہ کچھ دیوانے ہوتے ہی ہیں، بس دیوانگی کے درجے میں فرق ہوتا ہے۔ کسی کو دیکھو تو صبح سے گئی رات تک صرف لائبریری میں رہتا ہے۔ سائنس کے طلبہ کو جب بھی دیکھو تو اکثر دن رات لیب میں پڑے رہتے ہیں۔ اوروں کو دیکھو تو ہر وقت بس دنیا اور سماج کو بدلنے کی بات کرتے رہتے ہیں۔

پوری دنیا سے روز بہ روز اشتراکیت ختم ہوتی جارہی ہے لیکن یہاں نہ جانے کتنے لوگ ہیں کہ پوری دنیا میں سوشلسٹ انقلاب لانے کے خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ تو وہ سب کیا بالکل ٹھیک ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے یہ یونیورسٹی دیوانوں ہی کے لیے قائم کی گئی ہے۔''

سب حسب توفیق ہنسے، طالب بھی ہنسنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر رک کر اس نے کہا۔

''لیکن جو بات میں اب کہنے جارہا ہوں تم اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا۔ میرا کہنا ہے کہ دنیا میں جتنے بڑے کارنامے ہوئے ہیں وہ سارے اہلِ جنوں نے ہی انجام دیے ہیں۔ کچھ لوگ ہر کام سے قبل سوچتے ہیں کہ اس میں کتنا فائدہ ہوگا اور کتنا نقصان، یا اس میں کتنا خطرہ ہے اور کتنی راحت؟ اس طرح کے حساب کتاب لگانے والے کبھی کوئی عظیم کام نہیں کر سکتے۔ یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔''

''ہاں تمھاری یہ بات تو بالکل صحیح ہے۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا ''لیکن میں تو صرف اس کمرے کی بات کررہا تھا، کسی عظیم کام کی بات نہیں، ویسے میں یہ نہیں کہتا کہ اس کمرے میں کچھ ہو ہی جائے گا۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ بلا وجہ خطرہ مول لینے سے کیا فائدہ۔''

''نہیں اب تو میں اسی کمرے میں رہوں گا۔''

جب طالب نے اپنے فیصلے کا اعلان کردیا تو اس کے سب دوست یہ کہہ کر چلے گئے کہ تم اپنے بھلے برے کے خود ذمہ دار ہو۔ طالب جب اکیلا رہ گیا۔ تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ فرش اور میز پر بکھری ہوئی کتابوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ سِول سروس کے امتحانات سے متعلق کتابوں کے درمیان ایک بڑا سا بنڈل ملا جو ایک رسالے کا تھا جو ننگی تصویروں کے لیے مشہور تھا۔ طالب نے اس بنڈل کو اٹھا کر حفاظت سے رکھ لیا۔

اب طالب کو اس کمرے میں رہتے ہوئے کئی برس گذر چکے ہیں۔ طالب کو پورا یقین ہے کہ اس کمرے میں خودکشی کرنے والے طالب علم کی روح سے وابستہ سارے قصے بے بنیاد ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے ایک اور طرح کا وہم ہوگیا ہے اسے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس کا تعاقب کررہا ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو پیچھے پیچھے تعاقب کرنے والا شخص بھی چلتا

رہتا ہے اور جب وہ رکتا ہے تو وہ شخص بھی ٹھہر جاتا ہے۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے کہ یہ کون شخص میرا تعاقب کر رہا ہے؟ لیکن وہ اس شخص کو واضح طور پر کبھی نہ دیکھ سکا۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ کوئی ایک شخص اس کا تعاقب کر رہا ہے، کبھی اسے لگتا ہے کہ کئی شخص اس کا تعاقب کر رہے ہیں اور کبھی کبھی اسے یہ بھی محسوس ہوتا کہ تعاقب کرنے والا کوئی انسان نہیں بلکہ کوئی وحشی جانور ہے۔ اور کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ کچھ جان لیوا اشیا یا اسلحہ جیسے بندوق، راکٹ لانچر، ہیلی کوپٹر وغیرہ اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس نے اپنے اس وہم کو کبھی بھی کسی پر ظاہر نہ کیا کہ اگر بتاؤں گا تو لوگ یا تو میرا مذاق اڑائیں گے یا کہیں گے کہ یہ وہی خود کشی کرنے والے کا بھوت ہوگا۔ لیکن اسے پورا یقین ہے کہ کوئی بھوت اس کا تعاقب نہیں کر رہا ہے۔ تعاقب کرنے والی کوئی اور ہی ہستی ہے۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی اسے یہ شک ہو ہی جاتا ہے کہ کہیں اس طالب علم کا بھوت ہی تو میرا تعاقب نہیں کر رہا ہے؟

طالب کے والد نے اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے، اسے جے. این. یو. بھیجا تھا کہ وہ جلد از جلد پڑھ لکھ کر سول سروس کا امتحان دے گا اور آئی. اے. ایس. افسر بن کر لوٹے گا۔ لیکن طالب کا دل مقابلے کے امتحان کی تیاری میں کبھی نہ لگا۔ پھر بھی، والد کی خواہش کے مطابق کچھ برسوں تک وہ تیاری کرتا رہا اور بالآخر ناکام ہو کر اپنے پسندیدہ مضامین پڑھنے لگا۔ آئی. اے. ایس. کی تیاری میں اسے تمام مضامین پڑھنے پڑتے تھے چاہے ان میں اسے دل چسپی ہو یا نہ ہو۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کسی مضمون میں اسے دلچسپی نہیں تھی لیکن مقابلے کے امتحان کی تیاری کی خاطر کوشش کرنے پر اسے جب اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ اب اس مضمون پر مزید مطالعہ اس کی تیاری کے لیے نقصاندہ ثابت ہوگا۔ اس لیے اب اسے دوسرے مضامین پر توجہ دینی چاہیے۔ کچھ دوستوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ ابھی کسی بھی مضمون میں زیادہ سمجھ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس بنیادی چیزوں کو سمجھ کر باقی چیزوں کو رٹ لینا چاہیے، رٹنا مقابلہ جاتی امتحانوں میں زیادہ مفید ہوتا ہے۔

بہر حال ان سب حالات کے باعث وہ امتحان کے آخری موقعے میں بھی ناکام رہا۔ چوں کہ طالب کو جونیر رسرچ فیلوشپ مل رہی تھی، اس لیے گھر سے روپے پیسے لینے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ سول سروس میں ناکام ہونے کے بعد گھر والوں کی دلچسپی طالب میں پہلے ہی کم ہو گئی تھی، پھر ایک دن اخبار کی خبر سے ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا ایک کمیونسٹ

پارٹی کی طالب علموں کی شاخ کا اہم اور ممتاز رکن بن گیا ہے۔ تو ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب پانی سر سے اوپر ہو کر بہہ رہا ہے اور بیٹا پوری طرح سے بگڑ چکا ہے۔ گھر والوں نے گھبرا کر اس کی شادی کرنی چاہی لیکن طالب نے شادی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس طرح گھر والوں سے اس کی کشیدگی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔ اب طالب جب بھی چھٹے چھماہی گھر جاتا تو نہ اس میں پہلے کی طرح جوش و جذبہ ہوتا اور نہ گھر والے ہی اس کا کچھ گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے۔

سول سروس میں ناکامی کے بعد طالب نے تاریخ کا بہت سنجیدگی سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ طالب کے کورس میں عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ پڑھائی جاتی تھی لیکن اسے تمام دنیا کی عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں دلچسپی تھی، اور مسلمانوں کی تاریخ سے تو اسے خاص شغف تھا۔ اسی دوران اس کے کچھ ایسے دوستوں کا سول سروس میں انتخاب ہو گیا۔ جن کا علم اس سے نہ صرف کم تر تھا بلکہ اگر اس نے ان لوگوں کو کچھ موضوعات خاص طور سے تاریخ کے کچھ تصورات نہ پڑھائے یا سمجھائے ہوتے تو ممکن ہے ان کا انتخاب ہی نہ ہوا ہوتا۔ یہ بات اس کے دل میں بار بار ہوک پیدا کرتی تھی۔ لیکن بالآخر اس نے کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھال لیا اور اپنے آپ کو دن رات مطالعہ میں غرق کر دیا، رفتہ رفتہ اس نے تاریخ میں غیر معمولی صلاحیت پیدا کر لی۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ اس نے کئی اور متعلقہ مضامین جیسے سیاسیات، جغرافیہ، معاشیات، سماجیات، تہذیب و ادب وغیرہ میں بھی اچھی خاصی لیاقت حاصل کر لی اور مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اس کے مضامین ایسے جریدے میں شائع ہونے لگے جن میں چھپنے کی حسرت اس کے اکثر پروفیسروں کو بھی تھی۔

اسی دوران وہ ایک ریاست میں اعلیٰ تعلیم بورڈ کے سامنے لکچرر کے انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ وہاں اس نے بڑے فخر کے ساتھ بتایا کہ میرے مضامین فلاں مشہور جریدے میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر انٹرویو بورڈ کے ایک رکن نے پوچھا کہ اس جریدے میں مضمون شائع ہونے سے آپ کو کیا معاوضہ ملتا ہے؟ یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا جواب دوں۔ کچھ تذبذب کے بعد اس نے سیدھا اور صحیح صحیح جواب دے دیا کہ ہر مضمون کے پانچ سو روپئے ملتے ہیں۔ اس پر ان صاحب نے کہا، ''ہاں جے. این. یو. والوں کو اور کوئی کام نہیں۔ پانچ پانچ سو روپے کے لیے مضمون لکھتے رہتے ہیں۔'' بورڈ کے سارے

ارکین یہ سن کر قہقہہ لگانے لگے۔ طالب نے تمام اراکین کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھا۔ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کا کوئی مضمون اس جریدے میں کبھی شائع ہوا ہو۔

انٹرویو سے ناکام لوٹنے کے بعد طالب افسردہ رہنے لگا۔ اب وہ کسی سے بات نہ کرتا، زیادہ تر کمرے میں ہی پڑا رہتا، ایک دن اس کا ایک دوست اس سے ملنے آیا کہ چلو ذرا باہر نکلو، اس طرح پڑے رہنے کا کیا حاصل ہے؟ طالب پھٹ پڑا اور کہنے لگا۔ جب کسی تحریر کی اہمیت کا یہی پیمانہ ٹھہرا کہ اس سے کتنے روپے کی آمدنی ہوتی ہے تو اس وقت ہندستان کے سب سے اچھے لکھنے والے وہی ہیں جو یہ بتاتے پھرتے ہیں کہ چولی کے پیچھے کیا ہے کہ انھیں کو سب سے زیادہ پیسے ملتے ہیں۔

دوست نے یہ کہہ کر اس کو تسلی دی کہ بھئی، انٹرویو بورڈ میں سب لوگ ایک مخصوص سیاسی جماعت کے حمایتی تھے اور وہ لوگ جان بوجھ کر دوسرے لوگوں کو نہ صرف تقرر سے محروم رکھنا چاہتے تھے بلکہ ان کو ذہنی طور پر پریشان بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں پر دھیان مت دو، تمھیں وہاں انٹرویو کے لیے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ صوبہ ہی سب کچھ نہیں ہے۔ دنیا میں ابھی بھی علمی لیاقت کی قدر کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ویسے بھی تمھیں تو اسی یونیورسٹی میں لکچرر بننا ہے۔ کسی دور دراز کے کالج میں بھیج دیتے تو زندگی برباد ہو جاتی۔ میں تو کہتا ہوں جو ہوا اچھا ہی ہوا۔

دوست کے سمجھانے پر طالب کو وقتی طور پر تو کچھ تسلی ہو گئی لیکن اس کی حالت میں کچھ بنیادی تبدیلی نہ ہوئی۔ انٹرویو بورڈ کے اراکین کا وہ قہقہہ اس دن سے اس کے ساتھ لگ گیا تھا اور اب بھی اسے اکثر سنائی دیتا ہے۔ اب تو اسے نہ جانے کتنے لوگ مل جاتے ہیں جو وہ قہقہہ لگاتے رہتے ہیں۔ جیسے وہ قہقہہ فضا میں گھل گیا ہے اور اس کا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ بورڈ کے اراکین کا قہقہہ کہیں بھی، کبھی بھی آکر اسے گھیر لیتا ہے۔ ہاہا...... ہاہا...... پانچ پانچ سو روپے کے لیے مضمون لکھتے رہتے ہیں۔ ہاہا...... ہاہا

ایک دوپہر کا واقعہ ہے کہ طالب سو رہا تھا، جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ دیر تک ویسے ہی پڑا اس خواب کے بارے میں سوچتا رہا جسے دیکھتے میں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اسے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا اور کچھ جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ آج اس نے اس گاؤں کو خواب میں دیکھا

تھا جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی اور زندگی کے ابتدائی سولہ برس گذرے تھے۔ گاؤں چھوڑنے کے بعد ابتدائی کچھ برسوں تک تو وہ پابندی سے وہاں جاتا رہا تھا۔ لیکن پچھلے کوئی دس برسوں میں وہ ایک بار بھی گاؤں نہ گیا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ میں ان سب کو وہاں چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں، میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔ لیکن اب اس کا یہ وہم ٹوٹتا ہوا نظر آ رہا تھا کیوں کہ پچھلے ایک مہینے میں وہ کئی بار اس گاؤں کو خواب میں دیکھ چکا تھا۔

اس بار کے خواب نے تو اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ گھر جس میں اسے بے شمار شفقتیں ملی تھیں، وہ کمرہ جس میں اس نے اب تک کی زندگی کی تقریباً آدھی راتیں گزاری تھیں۔ وہ تالاب جس میں اس نے تیرنا سیکھا تھا اور دوستوں کے ساتھ نہ جانے کون کون سے کھیل کھیلے تھے...... اب تو اسے ان کھیلوں کے نام بھی یاد نہیں رہے تھے...... گاؤں کے بغل سے نکلنے والی وہ ندی جس میں صرف برسات میں پانی آتا تھا، اور جس میں اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ بہاؤ کے ساتھ اور بہاؤ کے خلاف تیرنے کے مقابلے کئے تھے۔ وہ درخت جن کی بلند شاخوں پر چڑھنا اور پھر دیر تک بیٹھے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا، درختوں پر کھیلا جانے والا وہ کھیل ...... بھلا اس کھیل کا نام کیا تھا؟ ...... ہاں یاد آیا، اسے ہیَر کہتے تھے اور وہ ہری بھری فصلوں والے کھیت جن میں وہ شرارتیں کرنے کے بعد گھر سے بھاگ کر پورے پورے دن چھپا رہتا تھا، وہ دوست جواب کئی کئی بچوں کے باپ بن چکے تھے اور بکری چرانے والی وہ لڑکی جو اسے بہت اچھی لگتی تھی...... آج وہ لڑکی برہنہ جسم کمرے میں آ کر اس سے لپٹ گئی تھی......

اس بار کے خواب میں سب ایک ساتھ مل گئے تھے۔ لیکن اس بار کے خواب میں وہ پچھلے خوابوں کی طرح خود چل کر اس گاؤں نہیں گیا تھا بلکہ وہ سب طالب کا تعاقب کرتے کرتے اس کے کمرے میں آ گئے تھے۔ آج اسے معلوم ہوا کہ وہ ان سب کو اپنے طور پر تو وہاں چھوڑ آیا تھا لیکن وہ سب نہ جانے کیسے خوابوں کے راستے چلے آئے ہیں۔ وہ سب میرا تعاقب کر رہے ہیں، سب میرے اندر بسے ہوئے ہیں اور جب چاہتے ہیں باہر نکل آتے ہیں میرا ان پر کوئی اختیار نہیں ہے۔

طالب کے اس کمرے میں دو دروازے ہیں ایک مغربی اور دوسرا مشرقی۔ مشرقی دروازے کے باہر جو منظر ہے اس میں پہاڑ ہیں، جنگل ہیں، جنگلی پھول ہیں۔ جن پر رقص

کرتی ہوئی تتلیاں ہیں، پانی کی جھیلیں ہیں، کچھ چرند پرند ہیں، نیلگوں آسمان ہے، آسمان پر اڑتے ہوئے بادل ہیں اور دور تک پھیلا ہوا سناٹا ہے۔ مغربی دروازے کے باہر جو منظر ہے اس میں روزمرہ کے سامان ہیں، خورد و نوش کی اشیا ہیں، سیاست ہے، تاریخ و تہذیب اور سائنس اور ٹکنالوجی کی نئی سے نئی ایجادیں ہیں۔ طالب نے کہیں پڑھا تھا کہ کبھی مغربی دروازے کا منظر بھی مشرقی دروازے جیسا تھا، لیکن مدت گذری وہاں کے لوگوں نے نقشہ بدل دیا تھا۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف طالب ہی آنے جانے کے لیے ان دروازوں کا استعمال کرتا ہو، بلکہ کچھ چیزیں بھی ان دروازوں سے اس کمرے میں داخل ہوتی ہیں۔ صبح سب سے پہلے مشرقی دروازے سے کچھ پرندوں کی آوازیں داخل ہوتی ہیں، ان میں وہ کبوتر کے ایک جوڑے کی آواز سے سب سے زیادہ آشنا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد مغربی دروازے سے اخبار داخل ہوتا ہے۔ جس کے ساتھ دنیا بھر کے قتل، غارت، مذہبی اور سیاسی نفرت، معاشی ناہمواری، تاریخ کے جبر، کھیل کود، بازار، برہنہ جسم اور ساری ناہموار، ناملائم چیزیں کمرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان سب سے نبرد آزما ہونے سے قبل اس کمرے میں مشرقی دروازے سے زندگی کی تمازت بھری دھوپ بھی داخل ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد مغربی دروازے سے لوگوں کے رفع حاجت کرنے کی آوازوں کے علاوہ کئی اور قسم کے شور کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔

اس کمرے سے وابستہ طالب کے لیے کئی مشغلے ہیں۔ ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ جب اسے حبس محسوس ہوتا ہے وہ کمرے کے دونوں دروازے کھول کر ان کے درمیان آرام کرسی ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ دونوں طرف سے تیز ہوائیں کمرے میں داخل ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ ان کے ٹکرانے سے کمرے میں ایک تیز گونج پیدا ہوتی ہے۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ ان ہواؤں کے درمیان ایک توازن قائم ہو جاتا ہے اور دونوں ہوائیں ایک دوسرے میں گھل مل جاتی ہیں، ایسے میں مشرقی اور مغربی دروازے سے داخل ہونے والی ہواؤں کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے، مشرقی اور مغربی ہوائیں صرف ہوا بن کر رہ جاتی ہیں، نہ مشرقی نہ مغربی۔

مشرقی دروازے سے باہر نکلنے پر کبھی کبھی طالب کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا جسم کمرے میں ہی رہ گیا ہے اور وہ صرف ایک روح بن کر آزاد فضاؤں میں اڑ رہا ہے۔ اسے وہاں جانے

اور گھومنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعتاً وہاں جائے کیوں کہ اس کا ماننا ہے کہ اگر میں سوچتا ہوں کہ اس وقت میں جنگل میں ہوں تو واقعی وہاں موجود ہوتا ہوں۔ وہ اکثر اپنی بالکونی میں کھڑا ہو کر ان جنگلوں اور پہاڑوں پر گھومتا رہتا ہے، وہ کبھی درختوں کی شاخوں پر بیٹھتا ہے، کبھی جھیل میں تیرتا ہے اور کبھی پہاڑوں کی آغوش میں کھیلتا ہے۔ اس نے کچھ درختوں پر اٹاریاں، کچھ پہاڑوں میں گپھائیں اور کچھ جھیلوں میں جزیرے بنا رکھے ہیں۔ یہاں وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا ہے اور فطرت کی گفتگو بہ زبان خاموشی سنتا رہتا ہے۔ وہ جھرنوں کے نغموں، موجوں کی روانی اور چرند پرند کی گفتگو میں اپنے آپ کو شامل محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل نے ان سب سے ایک مطابقت قائم کر لی ہے اور وہ اب ان میں محض ایک سامع یا ناظر کے طور پر نہیں بلکہ چرند و پرند کی طرح اس منظر کا ایک حصہ بن کر شامل ہوتا ہے۔ یہ سب اس کا اپنا ہے، اس میں کوئی بیگانگی نہیں ہے، کوئی مصنوعی پن نہیں ہے۔ وہاں وہ اپنے آپ کو ہوا کی طرح ہلکا محسوس کرتا ہے۔ جب وہ اپنے کمرے میں واپس آتا ہے، تو پھر اپنے آپ کو جسم میں قید اور اس کے بار سے دبا ہوا پاتا ہے۔ اس طرح ایک بار پھر وہ اس خوشی سے اپنے آپ کو محروم پاتا ہے جو اسے جسم کے بوجھ سے نجات پا کر حاصل ہوتی ہے۔

اسی طرح طالب جب مغربی دروازے سے باہر داخل ہوتا ہے تو اسے کبھی یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس کے پاس جسم کے سوا روح جیسی بھی کوئی شے ہے۔ وہ اکثر سوچتا ہے کہ اگر جسم نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا؟ میں جو کچھ کرتا ہوں سب اپنے جسم کے لیے ہی تو کرتا ہوں۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام، اس کے کپڑوں کا انتظام، اسے جگہ جگہ لے جانے، چلنے پھرنے کے لیے سواری کا انتظام، دوسری تمام جسمانی ضرورتوں کی تسکین کے سامان۔ زندگی انھیں چیزوں کے حصول کی جد و جہد بن کر رہ گئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں اپنے سوا دوسروں کے جسموں کے بارے میں سوچتا ہوں، لیکن طالب کو یہ بات کچھ بہت زیادہ پریشان اس لیے نہیں کرتی ہے کیونکہ جب وہ مغربی دروازے سے باہر ہوتا ہے تو اسے کبھی بھی جسم سے پرے یا جسم کے ساتھ روح جیسی کوئی شے محسوس نہیں ہوتی ہے۔

لیکن جب وہ اپنے کمرے میں ہوتا ہے تو اسے جسم اور روح دونوں کا احساس رہتا ہے۔ ایک دن جب وہ تعاقب کرنے والے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں یہ روح اور جسم کا معاملہ تو نہیں ہے، ایسا تو نہیں کہ جب مغرب میں سفر کرتا ہوں تو

روح تعاقب کرتی رہتی ہو اور جب مشرق میں ہوتا ہوں تو جسم تعاقب کرتا رہتا ہو؟ اسے اپنے اس وہم میں تھوڑا جواز تو نظر آیا لیکن یہ وہم بھی شک کی منزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔

طالب کا ایک مشغلہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی میز پر ایک گلوب رکھے ہوئے ہے اور اسے گھما گھما کر وہ ملکوں اور شہروں کو دیکھتا رہتا ہے۔ صبح اخبار میں جن ملکوں کا ذکر ہوتا ہے ان ملکوں کو وہ خاص طور سے سامنے لا کر دیکھتا ہے۔ جب وہ اس ملک کو کچھ دیر تک دیکھتا رہتا ہے تو آپ ہی آپ اس کے جغرافیہ سے تاریخ میں داخل ہو جاتا ہے، ایسے میں اس ملک کی تاریخ کے چند اہم ابواب اس کے ذہن میں روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ اکثر اس ملک کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتا ہے۔

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ جس قوم کا کوئی ماضی نہیں ہوتا، اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات اس کو بہت پریشان کرتی ہے کہ جس ملک کا اخباروں میں سب سے زیادہ ذکر ہوتا ہے اس کی تاریخ سب سے مختصر اور سب سے زیادہ تاریک ہے۔ اس بات میں اسے تاریخ کی ہتک محسوس ہوتی ہے۔

گلوب کے تعلق سے اس کی ایک عادت یہ بھی ہے کہ جب وہ شدید ذہنی انتشار میں ہوتا ہے تو اس گلوب کو بہت تیزی سے گھمانے لگتا ہے۔ پھر کوئی ملک اپنی سرحد کے ساتھ نظر نہیں آتا ہے، تمام سرحدیں مٹ جاتی ہیں اور صرف عالمی جغرافیہ رہ جاتا ہے، اس جغرافیہ میں پہاڑ، جنگل، جھیلیں، چرند پرند، آسمان، آسمان پر اڑتے ہوئے بادل اور دور تک پھیلا ہوا سمندر، سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ یہ گلوب ہمیشہ اسی رفتار سے گھومتا رہے اور تمام سرحدیں ہمیشہ کے لیے مٹ جائیں۔ صرف عالمی جغرافیہ بچے۔ گلوب دیکھتے ہوئے ایک سوال اسے بہت پریشان کرتا ہے کہ دنیا کا تقریباً دو تہائی حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ پھر بھی دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ زندگی کرنے کے لیے ضروری پانی سے کیوں محروم ہے؟

پچھلے کچھ دنوں سے ایسا ہونے لگا ہے کہ طالب جب بھی مغربی دروازے سے باہر جاتا ہے، تو اکثر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ واقعہ پیش آ جاتا ہے جس سے وہ دیر تک پریشان رہتا ہے۔ وہ کچھ چڑچڑا سا ہوتا جا رہا ہے۔ ایک شام وہ اپنے ایک دوست انل شرما سے عہدِ وسطیٰ

کی تاریخ کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ انل یوں تو ترقی پسند خیال کا تھا لیکن تاریخ کے بارے میں اس کا علم بس وہی تھا جو اسے اپنے برہمن گھرانے میں ملا تھا، کسی مستند تاریخ کی کتاب سے نہیں۔ طالب نے انل سے کچھ اس انداز سے بات کی جیسے اس کا اپنا تاریخ کا علم بس یوں ہی سا ہے اور وہ یہ سوچ کر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا کہ دیکھوں عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں انل کے خیالات کیسے ہیں؟ انل دیر تک بولتا رہا۔ اس کی باتیں سن کر کبھی کبھی طالب کو غصہ آتا لیکن وہ کسی طرح اپنے غصہ کو قابو میں کیے رہا، آخر کار جب معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا تو وہ بہانہ بنا کر واپس اپنے کمرے پر چلا آیا۔

طالب کو اس کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی اور اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ آخر کار اس نے غصے میں آ کر میز پر بہت زور سے ہاتھ مارا اور بہ آواز بلند کہنے لگا۔

''اب چنگیز خاں کے مظالم کا حساب بھی ہمیں ہی دینا پڑے گا۔ وہ تو مسلمان تھا ہی نہیں۔ اس کے وارثوں نے اسلام قبول کیا تھا۔''

اس کے ذہن میں انل کا ایک جملہ اور گونجا۔

''تیمور اور نادر شاہ اور کے کارنامے بھی تو تقریباً چنگیز خاں جیسے ہی تھے۔''

''ہاں ہیں تو لیکن ان کے مظالم کے بیشتر شکار مسلمان ہی تھے...... پھر غیر انسانی حرکتیں ہر انسان کی میراث نہیں۔ کسی کی تخصیص نہیں۔''

یہ کہہ کر طالب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کچھ دیر تک رو لینے کے بعد دھیرے دھیرے اس کا غصہ کم ہوا۔ لیکن اس رات طالب نے خواب میں دیکھا کہ کوئی بہت زور دار قہقہہ لگاتا ہوا اس کی طرف فتح مندانہ چلا آ رہا ہے۔ جب وہ شخص قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ یہ انل تھا، ایک عجیب سفاک اور زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے انل نے اعلان کیا۔

''تاریخ کی میری سمجھ پر تمھارے علم سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''سنو، میری بات تو سنو!'' طالب نے پکارا۔ جب انل نے کوئی جواب نہ دیا تو طالب نے چیخ چیخ کر کہا، ''سنتے کیوں نہیں؟ میں وہی ہوں، طالب تمھارا دوست۔''

اس بار چیختے ہی وہ خواب سے بیدار ہو گیا۔ ''پکارو تو بھی خاموشی، چپ رہو تو بھی وہی خاموشی۔'' اس نے افسردہ دلی سے سوچا۔

ایک شام طالب ڈھابے پر چائے پینے گیا۔ اسے کچھ لوگ وہاں مل گئے، جن سے دیر تک دنیا، سماج، سیاست اور تاریخ وغیرہ پر باتیں ہوتی رہیں۔ طالب نے کئی ایسی باتیں کہیں جو حاضرین کو بہت پسند آئیں۔ ایک اجنبی نے طالب کا تعارف پوچھا۔ طالب نے بتایا میں تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر رہا ہوں، تو اس نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا اور کہا، ''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' لیکن جب طالب نے اپنا نام بتایا اجنبی نے عجیب سا منھ بنایا۔ طالب کو یہ رویہ بہت ناگوار گذرا اور وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ راستے بھر اسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ شخص اس کا منھ چڑھا رہا ہو، پہلے تو بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا تھا، پھر نام سن کر ایسا منھ بنایا گویا کونین کی گولی چبا گیا ہو۔ لوگ میری ایک ہی شناخت کیوں دیکھتے ہیں؟ صرف میرے مذہب کی، وہ بھی اپنے بنائے ہوئے مفروضے کے مطابق۔ اس شخص کا منھ چڑانے کا انداز طالب کے ساتھ مستقل طور پر سائے کی طرح ساتھ لگ گیا۔

طالب کو ابھی کمرے میں پہنچے ہوئے کچھ ہی وقت گذرا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ طالب نے دروازہ کھولا، تو اس اجنبی کے سوا وہ تمام لوگ جن کے ساتھ طالب ابھی ڈھابے پر تھا۔ کمرے میں داخل ہوگئے۔ پھر آنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''یار تمھارا مسلمان ہونا اسے برا نہیں لگا تھا بلکہ اسے تو بہت خوشی ہوئی تھی کہ مسلمانوں میں بھی ایسے روشن خیال لوگ موجود ہیں۔''

''لیکن میں اپنی اس شناخت سے نہیں بچ سکتا۔ مجھے اصل تکلیف تو یہی ہے۔ طالب نے جواب دیا۔

''کیا تمھیں لگتا ہے کہ ہم لوگ بھی تمھارے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہیں؟ تم فکر نہ کرو ایک دن ایسا آئے گا جب لوگ اس حقیقت کو سمجھیں گے۔''

ان لوگوں کے جانے کے بعد طالب کے ذہن میں اس واقعے سے متعلق بہت سے سوال گونجتے رہے۔ تو کیا میرا اپنا کوئی وجود نہیں ہے؟ میں محض راشد، انیس..... کا حصہ ہوں اس سے الگ کچھ بھی نہیں؟ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے سوچا میں جتنا تنہا رہوں گا اتنا ہی سوچوں گا اس لیے بہتر ہوگا کہ کچھ دوستوں کے ساتھ کچھ وقت گذارا جائے۔ یہ سوچ کر وہ کمرے سے باہر نکلا اور ایک دو دوستوں کے یہاں گیا ان کے کمرے بند ملے۔ وہ

پھر اپنے کمرے میں واپس آ کر لیٹ گیا اور دیر رات تک حیات و کائنات کے بہت سے مسائل پر سوچتا رہا۔

جب اسے کسی طرح چین نہ ملا تو وہ مشرقی دروازے سے بالکونی میں چلا گیا۔ چاندنی رات تھی، پہاڑ اور جنگل پر دور تک پھیلا ہوا سناٹا تھا۔ ایسی روشنی تھی کہ کچھ کچھ تو نظر آ رہا تھا اور بہت کچھ چھپا ہوا تھا۔ لیکن ان سب کو دیکھنے کے لیے طالب کو کسی مصنوعی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ مشرقی دروازے کے اس منظر کو مصنوعی روشنی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے دیکھنے کے لیے سورج اور چاند کی روشنی کی ضرورت تھی یا اپنے اندر کی، اپنے دل کی روشنی کی ضرورت تھی۔ ویسے اس کا یقین تھا کہ سورج اور چاند کی روشنی بھی ان سب چیزوں کو دیکھنے کے لیے نہیں بنی ہے بلکہ سورج اور چاند کی روشنی بھی پہاڑ اور جنگل کی طرح اس منظر کا ہی ایک حصہ ہے۔ طالب چاندنی رات کے منظر کو دیکھتے دیکھتے وہیں پہنچ گیا۔ کچھ وقت وہ پرندوں سے، پہاڑوں سے اور وادیوں سے باتیں کرتا رہا، پھر لوٹ آیا۔ پہلے بالکونی میں پھر کمرے میں۔ آنے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

اگلے دن وہ دوپہر تک اخبار پڑھتا رہا۔ ایک ایک خبر کو کئی کئی بار پڑھ گیا۔ گویا ان خبروں میں کوئی ایسی معنویت ہو جو کئی بار پڑھنے پر ہی ظاہر ہو سکتی تھی۔ اخبار پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ اچانک چیختے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''بھاگو بھاگو پولیس آ رہی ہے، گولیاں چل رہی ہیں، پولیس ہم سب کو پکڑ لے جائے گی۔''

وہ چیختا ہوا مغربی دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے پڑوسی آواز سن کر اپنے اپنے کمرے سے باہر نکل آئے۔ طالب کا حال دگرگوں دیکھ کر انھوں نے پوچھا۔

''کیا ہوا طالب، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں سب ٹھیک ہے، ایک ڈراؤنا خواب دیکھ لیا تھا، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

وہ کچھ شرمندہ ہو کر اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ اس کے پڑوسی بھی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے۔ انھیں شک ہونے لگا تھا کہ طالب کا دماغ چل گیا ہے، یا وہ بہت جلد حواس باختہ ہو جائے گا۔

رات کے کھانے کے بعد طالب اور بھی بے چینی محسوس کرنے لگا۔ جب کسی طرح سے سکون نہ مل سکا تو مغربی دروازے سے باہر نکلا اور بے وجہ دیر تک تنہا گھومتا رہا۔ تھک جانے کے باوجود اسے سکون نہ مل سکا تو وہ ہاسٹل واپس آ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد وہ پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہاسٹل کے صدر کے کمرے پر پہنچ گیا اور اس کے دروازے پر دستک دی۔ رات کا پچھلا پہر تھا، وہ گہری نیند میں سو رہا تھا۔ اس نے کافی تاخیر سے اونگھتے ہوئے دروازہ کھولا اور خیریت پوچھی تو طالب نے کہا۔

''تم وارڈن کو منع کیوں نہیں کرتے ہو، وہ بلا وجہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔''

''اوں وارڈن... کیا؟.... کیا ہوا؟''

''انھوں نے میرے پیچھے، کچھ لڑکوں کو لگا دیا ہے جو ہر وقت میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں، میں جب اپنے کمرے میں ہوتا ہوں تو بھی وہ جھانکتے رہتے ہیں یا چھپ چھپ کر میری آواز سنتے رہتے ہیں۔''

صدر ابھی بھی نیند کی حالت میں تھا اور طالب کی بات یوں بھی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے طالب سے کہا۔

''نہیں، وارڈن تو بہت اچھا آدمی ہے، سارے لڑکوں کا بہت خیال رکھتا ہے، اور تمھارا تو خاص خیال رکھتا ہے۔''

طالب کو غصہ آ گیا اور اس نے صدر کو جھنجھوڑ کر کہا۔

''تم طالب علموں کے لیڈر ہو یا وارڈن کے ایجنٹ ہو؟ تمھیں طالب علموں نے صدر منتخب کیا ہے یا وارڈن نے؟ لگتا ہے تم بھی وارڈن کی سازش میں شامل ہو۔''

طالب نے جھپٹ کر صدر کا گریبان پکڑ لیا اور چیخا۔

''بتاؤ، وارڈن میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟ اس نے میرے پیچھے لڑکے کیوں لگا رکھے ہیں؟ بتاؤ، فوراً بتاؤ ورنہ میں تمھاری دھنائی کر دوں گا۔ تم سالے خود کو سمجھتے کیا ہو......؟''

صدر کی نیند غائب ہوگئی۔ اس نے معاملے کو فوراً سمجھ لیا اور طالب کی اس حرکت کا برا نہ مانا، اس نے دن کا واقعہ سن رکھا تھا اس لیے طالب کی ذہنی حالت کو سمجھنے میں اسے دقت نہ ہوئی اور وہ خندہ پیشانی سے بولا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے یار، تمھیں وہم ہوا ہے، وارڈن بھلا تمھارے پیچھے کیوں ان لڑکوں کو لگوائیں گے؟''

''اس کام کے لیے ان کو پیسا دیا گیا ہوگا، اور کیا؟ طالب نے بھنا کر کہا۔''

''پیسہ، انھیں اس کام کے لیے کون پیسہ دے گا، اور کیوں؟''

''یونیورسٹی دے رہی ہوگی، حکومت دے رہی ہوگی یا کسی دوسرے ملک سے مل رہا ہوگا۔''

''حکومت کیوں دے گی؟ اس کے پاس ایسے کاموں کے لیے پیسہ نہیں ہوتا ہے، تم خوب جانتے ہو۔''

''تمھیں معلوم نہیں۔ حکومت کا زیادہ تر پیسہ اسی قسم کے کاموں میں جاتا ہے۔''

صدر نے سوچا اس حالت میں اس سے بحث کرنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے اور اس نے بات کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، زمانہ خراب ہے، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اچھا میں اب وارڈن کے بارے میں معلوم کروں گا وہ کیا کیا کرواتا رہتا ہے۔''

''اور ہاں اس پرکاش واجپئی کو بھی سمجھا دینا۔ اسے ہاسٹل سے فوراً نکلوایئے نہیں تو میری موت کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔''

''کون پرکاش واجپئی؟''

''وہی جو کمرہ نمبر ۲۶۰ میں رہتا ہے۔ وہ میرا پیچھا کرتا رہتا ہے، اس کے پاس پستول ہے۔ میں جیسے ہی اس کی طرف دیکھتا ہوں وہ پستول کو اپنی جیب میں چھپا لیتا ہے اور مسکرانے لگتا ہے، لیکن میں جانتا ہوں وہ میرا قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ حکومت کا مخبر ہے۔''

صدر اس لڑکے کو جانتا تھا، وہ اس قسم کا لڑکا نہیں تھا اور اس کا نام بھی پرکاش واجپئی نہیں پرکاش کوشک تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ وہ اکثر جیب میں ہاتھ ڈالے رہتا تھا۔ اس نے پھر بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''اچھا تم اب اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ، میں صبح سب باتیں معلوم کر کے تمھیں بتاؤں گا۔ پرکاش کو بھی میں صحیح کر دوں گا۔ بڑا دادا بنا پھرتا ہے، اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ جاؤ، جاؤ تم آرام سے سو جاؤ۔ سویرے دیکھیں گے۔''

صدر کے یقین دلانے پر طالب اپنے کمرے میں آ کر سونے کی کوشش کرنے لگا اور کچھ دیر میں سو بھی گیا۔ اب اس نے پھر ایک خواب دیکھا۔

دیکھتا کیا ہے میرے دماغ کی تمام پرتیں کھلنے لگی ہیں۔ حافظہ میں جو کچھ بھی ہے وہ دماغ سے نکل نکل کر کمرے میں پھیلتا جا رہا ہے، وہ چیزیں تھوڑی دیر تک کمرے میں اڑتیں ہیں پھر گر پڑتیں ہیں۔ پھر اچانک ساری کتابوں کے اوراق پھڑ پھڑا کر اڑنے لگے اور ان اوراق کی تحریریں مصوّر ہو گئیں۔ پھر وہ تصویریں حقیقی شکل اختیار کر گئیں۔ ایک ایک کر کے شہر اس کے سامنے سے گذرنے لگے۔ اصفہان، شیراز، بغداد، غرناطہ، قرطبہ، قاہرہ، سمرقند، بخارا، دہلی، لاہور، آگرہ۔ بے شمار شہر اور ان شہروں کی تعمیرات، مسجدیں، محل، باغات، کتب خانے، فنونِ لطیفہ، سرائیں، قہوہ خانے، دوکانیں، عالم، صوفی، شعرا لمحے بھر کو کمرے کی فضا میں لہراتے، تیرتے، جھمکتے اور پھر روئی کے گالے کی طرح اس کے اوپر گر پڑتے۔ دھیرے دھیرے وہ ملبے کے نیچے اس طرح دب گیا کہ وہ ہلنے ڈلنے سے بھی قاصر ہو گیا۔ اس نے ملبے کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہاں تو سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا نکل بھاگنا کیا معنی رکھتا تھا۔

وہ اچانک جاگ اٹھا لیکن کچھ دیر تک نیم خوابی کی کیفیت میں پلنگ پر پڑا رہا۔ وہ اپنے آپ کو اب بھی ملبے کے نیچے دبا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے پلنگ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہ گیا تو وہ پوری قوت سے چیخ اٹھا۔

''بچاؤ...... بچاؤ...... ارے بھائی کوئی ہے؟ مجھے بچاؤ......''

اس کے پڑوسی دوڑتے ہوئے مغربی دروازے سے داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ طالب کی زبان غیر معمولی طور پر منھ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے اسے کھینچ نکالا ہو۔ اور حلق سے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ سبھی کھڑکی دروازے بند تھے، کمرے میں حبس بھرا ہوا تھا۔ پڑوسی لڑکوں نے سب سے پہلے دونوں دروازے کھولے۔ باہر پروائی چل رہی تھی۔ جب ہوا آر پار بہنے لگی تو کمرے کا حبس زائل ہو گیا اور طالب جلدی ہی پوری طرح

سے ہوش میں آ گیا۔ پڑوسی لڑکوں نے اس سے پوچھا کہ معاملہ کیا تھا۔ تو اس نے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں۔ کیا میں خواب دیکھ رہا تھا؟ آپ لوگوں کو بے وجہ زحمت ہوئی۔''

لڑکوں کو پھر گمان گذرا کہ طالب اپنی عقل کھو بیٹھنے والا ہے، لیکن جب طالب خود کہہ رہا تھا کہ کوئی بات نہیں اور وہ بظاہر اب بالکل ٹھیک دکھائی دیتا تھا، تو وہ اپنے اپنے کمرے پر چلے گئے۔ اب تک صبح ہو گئی تھی۔

شام کا وقت تھا، طالب کمرے کا مشرقی دروازہ کھولے گہری فکر میں ڈوبا ہوا بیٹھا تھا، مشرقی دروازے کے باہر خاموشی تھی لیکن مغربی دروازے کے باہر آج بہت ہلچل تھی اور بہت تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ اچانک مغربی دروازہ دھڑاکے کے ساتھ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک آندھی سی اندر آ گئی اور اس کے ساتھ کمرے میں بہت سی اجنبی چیزیں داخل ہو گئیں، مشرقی دروازہ کھلا ہوا تھا جس سے مغرب کی کچھ چیزیں مشرقی دروازے کے منظر میں داخل ہو گئیں۔ طالب نے بڑی مشکل سے مغربی دروازہ بند کیا، گرد و غبار اور کوڑا کرکٹ صاف کر کے اس نے ردی کی ٹوکری میں بھرا اور مشرقی دروازے کی بالکونی میں جا کر اسے باہر پھینک دیا۔

وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور اس مشرقی منظر کو دیکھنے لگا، چند لمحوں میں وہ اپنی مرغوب جگہوں پر پہنچ گیا اور مصروف سیر ہوا۔ جب وہ پہلے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں کا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا اور خوف سے کانپنے لگا۔ یہ کیا؟ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ کون سی مخلوق ہے اور کہاں سے آ گئی؟ یہاں کی تو دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ وہ چھپ چھپ کر دوڑتا ہوا اپنے تمام ٹھکانوں تک گیا۔ درختوں کی اٹاریاں، پہاڑوں کی گپھائیں اور جھیل کے جزیرے، ہر جگہ وہی منظر تھا۔ اس نے سوچا یہ عجیب الخلقت مخلوق کہاں سے آ گئی؟ یہ کبوتر یہاں کیوں مرے پڑے ہیں؟ اتنے میں آواز آئی۔

''ڈرو مت۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، اس وادی میں بہت خطرہ تھا۔ اسی لیے ہم لوگ اس وادی کی حفاظت کے لیے آئے ہیں، اب ہم اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت یہاں موجود رہیں گے۔''

لیکن اس کے بعد وہ اس پر حکم چلانے لگے۔ وہ اسے ڈراتے اور دھمکاتے رہے۔ بندوق کے کندوں سے مارتے بھی رہے اور یہ بھی کہتے رہے، ''اب تمھیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اب ہم تمھاری حفاظت کے لیے آ گئے ہیں۔''

بڑی مشکل سے وہ واپس اپنی بالکونی میں پہنچا۔ یہاں رات کافی گذر چکی تھی۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا، لیکن نیند نہ آسکی۔ اسے بار بار مشرقی دروازے کے باہر کا منظر یاد آ جاتا۔ طالب نے بے چین ہو کر سوچا، مشرقی دروازے کا منظر راحت افزا دنیا تھی اب وہ جگہ بھی محفوظ نہیں رہی، اب میں کہاں جاؤں گا؟ یہ سوچ سوچ کر وہ پریشان تھا کہ اچانک مغربی دروازے سے ایک بہت پر اسرار آواز سنائی دی، چھن ...... چھن ...... چھن ...... تھوڑے تھوڑے وقفہ پر وہ آواز مسلسل آتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکل کر دیکھنے لگا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ باہر جانے پر کہیں سے کچھ پتہ نہ چل سکا۔ اسے طالب علم کے بھوت کا خیال آیا۔ لیکن ان توہمات میں اسے اب بھی یقین نہ تھا اس لیے اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر وہ کمرے میں واپس آ کر پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ چھن ...... چھن ...... کی وہ آواز اب اسے اور بھی واضح سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر میں نیند آئی تو طالب کو ایک کابوس نے جکڑ لیا۔

اس نے دیکھا کہ کمرے میں اندھیرا پوری طرح مسلط ہے صرف میز پر رکھے ہوئے گلوب کے ایک حصہ پر کہیں سے روشنی آ رہی ہے، طالب گلوب کو دھیرے دھیرے گھما رہا ہے، اس طرح اس طرح تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ پورے گلوب پر روشنی آ جاتی ہے۔ طالب نے دو تین بار گھما کر گلوب کو چھوڑا تو ہر بار روشنی کے سامنے ایک ہی حصہ آ کر رکا۔ اور وہ حصہ ہندستان کے بالکل پیچھے کا تھا، جس سے ہندستان بار بار بالکل تاریکی میں چلا جا رہا تھا۔ آخر کار اس نے ہندستان کے نقشے کو روشنی کے سامنے لا کر ٹھہرا دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر میں اسے پھر وہی چھن ...... چھن ...... کی آواز سنائی دی، اس نے تھوڑا ادھر ادھر دیکھا، کہیں کوئی نظر نہ آیا، تو طالب واپس گلوب میں دیکھنے لگا۔ اچانک ہندستان کے پیچھے والے حصے سے کچھ لوگ نمودار ہوئے اور فضا میں اڑنے لگے۔ ان کے پاس کوئی بہت چمکدار چیز تھے۔ انھوں نے اس کی روشنی گلوب پر ڈالی، پھر بیشتر ملکوں سے لوگ بے تحاشا نکلے اور فضا میں اڑتے ہوئے گلوب کے پیچھے والے حصے سے آئے لوگوں سے ایک عجیب زبان میں بات کرنے لگے۔ ہندستان والے حصے سے بھی کچھ لوگ وہاں پہنچ کر بات کرنے لگے۔ اس کے

بعد پہلے آنے والوں نے اپنے ملک کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ کرتے ہی وہاں سے بے شمار لوگ نکلے اور سارے ملکوں کی طرف چلے پڑے۔ ان لوگوں کے ساتھ ایک نادیدہ زنجیر تھی، جو یوں تو نظر نہیں آتی تھی، لیکن ان کے چلنے کے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اسے لے کر چل رہے ہیں۔ وہ لوگ جہاں جہاں سے گذرتے تھے وہاں کے لوگوں کو مخاطب کر کے کچھ اعلان کرتے تھے۔ ہندستان پہنچ کر ان میں سے ایک نے اعلان کیا۔

''آپ کا ملک بہت امیر ملک ہے لیکن یہاں کے لوگ بہت غریب ہیں۔ آپ کے یہاں سونا ہے، تیل ہے، کوئلا ہے، پہاڑ ہیں، ندیاں ہیں، زمینیں ہیں، جنگل ہیں اور پانی ہے۔ لیکن اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے ان رہنماؤں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم ان ساری چیزوں کا استعمال کر کے آپ کو امیر بنائیں گے، بس اب آپ لوگ میری اجازت کے بغیر اوپر بتائی گئی چیزوں میں سے کسی کا بھی استعمال نہیں کر سکتے۔''

اس کے بعد ایک دوسرے شخص نے اعلان کیا۔

''آپ کا ملک بہت خطرے میں ہے، ہر طرف دہشت گرد پھیلے ہوئے ہیں۔ ان خطروں سے صرف اور صرف ہم ہی آپ سب کو بچا سکتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم جو کچھ بھی کہیں آپ لوگ وہی کریں۔ چند سر فرے لوگوں کی وجہ سے، ہم پورے ملک کے امن و امان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ اس لیے ہم منکروں کو مناسب سزا دیں۔''

اس کے بعد ایک اور شخص نے اعلان کیا۔

''ہمیں آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق بے حد عزیز ہیں اور یہ زنجیر انھیں چیزوں کی علامت ہے۔ یعنی جو اس زنجیر میں ہے سمجھ لو جمہوری نظام میں ہے، اب آپ سارے لوگ اس زنجیر میں آجائیں۔''

لوگ ایک ایک کر کے زنجیر میں آتے جا رہے تھے۔ کچھ ان کی چمک دمک کے رعب سے، کچھ ڈر سے۔ طالب نے جب زنجیر کی آواز کو غور سے سنا تو یہ وہی ''چھن......چھن......'' کی آواز تھی جو وہ سر شام سے سن رہا تھا اور اس کا تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک شخص نے زنجیر کو ہوا میں لہرا کر طالب کے اوپر پھینکنا چاہی تو طالب جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور چیختا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر پہنچ کر وہ برآمدے میں دور تک نکل گیا اور لگاتار چیختا رہا۔

''سنو، کم بختوں سنو، زنجیر تمھاری تلاش میں ہے۔''

فوراً ہی کثرت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان لوگوں نے آ کر اسے پکڑ لیا اور پوچھا۔

''کون کس کی تلاش میں ہے؟ یہ زنجیر و نجیر کیا لغویات ہے؟ گھبراؤ مت ہم لوگ یہاں ہیں، یہاں کوئی نہیں آ سکتا، تم نے پھر کوئی خواب دیکھا ہے۔ کل تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے چلیں گے۔''

طالب سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔ دوستوں نے اس کا سر اور پیٹھ سہلائی، پانی پلایا۔ جب طالب بالکل ٹھیک لگنے لگا تو اسے اس کے کمرے میں چھوڑ کر وہ لوگ اپنے اپنے کمرے پر واپس چلے گئے۔ رات ختم ہونے والی تھی۔ مشرق میں تھوڑا تھوڑا اجالا ہونے لگا تھا۔ وہ مشرقی دروازے سے باہر نکلا اور بالکونی کے باہر کے منظر پر نظر ڈالی تو اسے خیال آیا کہ اب مشرقی دروازے کی دنیا بھی خالص مشرقی نہیں رہی۔ اسے اچانک خیال آیا کہ زنجیر والے اور جنگل کے لوگ بالکل ایک جیسے تھے۔ یہ سوچتے ہی اسے پھر خوف محسوس ہوا۔ جلدی سے کمرے میں واپس آ کر اس نے خوب مضبوطی سے دونوں دروازے بند کیے اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔

کچھ دن آرام سے گذرے، کوئی برا خواب نہ آیا، نہ ہی مشرقی یا مغربی دروازے کے مناظر سامنے آئے۔ ایک روز وہ کیمپس میں ہی سڑک پر کہیں جا رہا تھا کہ اسے اچانک محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے اور بہت شدید حملہ کرنے والا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ تعاقب کرنے والا شخص جھاڑی میں چھپ گیا ہے۔ طالب بے تحاشا اس جھاڑی کی طرف دوڑا، جھاڑی سڑک کی دوسری جانب تھی۔ وہ بیچ سڑک میں تھا کہ ایک کار تیزی سے آئی اور وہ اس سے ٹکرا گیا، کار والے نے پوری طاقت سے بریک لگائے لیکن پھر بھی اس کا سر بری طرح زخمی ہو گیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ آئی اور ایک پاؤں کار کی پچھلے پہیے کے نیچے آ کر چور چور ہو گیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز یعنی ایمس کے سرجری وارڈ کے ایک پلنگ پر پایا۔ سارا بدن پٹیوں اور پلاسٹر سے ڈھکا ہوا تھا۔ جسم کے مختلف حصوں میں مشینیں اور تار لگے ہوئے تھے۔ اس نے حادثے کی اصل وجہ کسی کو نہیں بتائی۔ دوستوں اور وارڈن سے اس نے جھوٹ بول دیا کہ گھر والوں کو اطلاع کر دی ہے اور وہ

لوگ جلد ہی آ جائیں گے۔ دو مہینے تک وہ ہسپتال میں بستر پر پڑا رہا، اس کے بعد چھٹی ملی اور وہ ہاسٹل واپس آ گیا۔

جس دن وہ ہسپتال سے واپس آیا پورے دن کوئی نہ کوئی کمرے میں رہا، رات میں بھی اس کے دوست دیر تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ ان لوگوں نے کوئی بہت سنجیدہ بات نہ کی۔ بس یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کبھی فلموں کی، کبھی کرکٹ کی، کبھی موسم کی، بیچ بیچ میں کوئی لطیفہ یا مزاحیہ واقعہ بھی سناتے رہے۔ باتوں باتوں میں طالب کو نیند آ گئی۔ اس کے سو جانے کے بعد سارے دوست بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمرے واپس چلے گئے۔

کمرے میں پڑے پڑے کئی دن گذر چکے تھے طالب بری طرح سے ادب چکا تھا، اس نے سوچا چلو آج کھانا یہاں نہ منگوا کر میس میں ہی کھانے چلتا ہوں۔ اسی بہانے تھوڑا گھوم بھی لوں گا۔ اس کی چال نہایت مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ دائیں پیر میں گھٹنے کے اوپر تک پلاسٹر اور ہاتھوں سے زمین تک ٹکی ہوئی بیساکھی تھی، بایاں پیر صحیح تھا اس لیے زیادہ زور اسی پر دیتا تھا، پلاسٹر والا پیر آگے پیچھے بے ترتیب جھولتا رہتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ کبھی ادھر لے جاتا کبھی ادھر، جیسے کوئی اسے مارنے جا رہا ہو اور وہ ہاتھ سے وار روک رہا ہو۔ کبھی کبھی سر اور کندھے اچانک ادھر ادھر کسی بھی طرف جھکا دیتا تھا، جیسے کوئی وہاں بھی مارنے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ بچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چلتے چلتے وہ اچانک رک جاتا اور سر گھما کر دائیں، بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ گرتا پڑتا وہ میس پہنچ گیا۔ کھانے کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بھی وہ اچانک کسی بھی طرف جھک جاتا۔ لوگ اس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ طالب ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے اور اب تو جسمانی طور پر بھی ٹھیک نہیں رہا۔

کھانا کھانے کے بعد کمرہ نمبر ۲۶۰ پر جا کر اس نے دستک دی۔ دروازہ کھلتے ہی طالب نے کہا۔

''میں نے اپنا مذہب بدل لیا ہے اب میں صرف انسان رہ گیا ہوں، نہ ہندو، نہ مسلمان۔ تم اپنے آقا سے کہہ دو کہ اب میرا تعاقب بند کروا دیں۔ ساتھ ہی تمھارے آقا بھی اپنے آقا کے پاس خبر بھیج دیں، جنھوں نے بے شمار فوجی مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجے ہیں۔ انھیں بھی واپس بلا لیا جائے۔ خدا کے واسطے اب میرا تعاقب بند کروا دیجیے۔''

یہ کہہ کر طالب پرکاش کے پیر پکڑ کر رونے لگا۔

پرکاش حیران ہو گیا۔ وہ طالب کی ذہنی حالت سے واقف تھا۔ پھر بھی اسے توقع نہ تھی کہ اس کا یہ حال ہو جائے گا۔ اس کا دل شدید محبت اور ترحم سے بھر گیا۔

''ٹھیک ہے میں ان سب لوگوں سے کہہ دوں گا، اب تم بے فکر ہو کر اپنے کمرے جاؤ، میں سب کو خبر کر دوں گا۔''

پرکاش اسے کمرے پر چھوڑ گیا اور یہ قول بھی دے گیا کہ اب کچھ نہ ہو گا۔ میں سب لوگوں کو خبر کر دوں گا، تم آرام سے سوؤ۔

پرکاش کے جانے کے بعد بعد طالب حسب معمول دو پہر میں سونے کے لیے لیٹ گیا، کچھ دیر بعد نیند بھی آ گئی اور ایک بار پھر وہ ایک دہشت ناک کابوس میں مبتلا ہو گیا۔ طالب نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے، چاروں طرف دبیز اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اندھیرے میں کچھ تصویریں چمکتی ہیں اور لمحے بھر بعد غائب ہو جاتی ہیں۔

سب سے پہلے خودکشی کرنے والا طالب علم ایک قہقہہ مارتا ہے اور کہتا ہے، اب اس کمرے میں تم میرے جاں نشین ہو اور میری کہانی کو آگے بڑھاؤ گے۔ بورڈ کے تمام اراکین قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ تم لوگوں کو پانچ پانچ سو روپے کے لیے مضمون لکھنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ برہنہ جسم لڑکی اس سے لپٹ جاتی ہے۔ پھر صدیوں کا غبار ان دونوں پر گرنے لگتا ہے اور وہ اس کے نیچے دبتا چلا جاتا ہے۔ ایک عجیب مخلوق کے بے شمار لوگ ایک لامتناہی زنجیر لیے ہوئے ہیں۔ وہ آس پاس کے لوگوں کو زیر کر چکے ہیں اور اب وہ طالب کی اور بڑھ رہے ہیں۔ طالب بستر سے اٹھ کر مغرب کی جانب بھاگتا ہے اور مغربی دروازے سے جا ٹکراتا ہے۔ پھر وہ مخالف سمت میں بھاگتا ہے اور مشرقی دروازے سے ٹکراتا ہے۔ ان دروازوں سے ٹکرانے کے بعد اس کے ہوش و حواس درست ہو جاتے ہیں اور وہ بستر پر آ کر دوبارہ لیٹ جاتا ہے۔

ایک شب اس نے خواب میں دیکھا کہ میں پوری طرح سے بیدار ہوں۔ ساری چیزیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ فوجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں، میں انھیں کیوں موقع دوں؟ ان کے ہاتھوں مرنے سے بہتر ہے کہ میں خود سے مر جاؤں۔ اس طرح اس نے خودکشی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے اس نے وہی طریقہ سوچا کہ بلیڈ سے کلائی کی رگ کاٹ دی جائے اور سارا خون بہہ جانے دیا جائے لیکن اس میں ایک خطرہ یہ تھا کہ اگر بیچ میں کوئی کمرے میں آ گیا تو بچا لیا جاؤں گا۔ اس سے بھی زیادہ خطرہ یہ ہے کہ ممکن ہے بچانے کے وقت تک کافی خون بہہ چکا ہو اور میں مستقل طور پر مفلوج ہو کر رہ جاؤں۔ مفلوج کی زندگی تو موت سے بدتر ہے۔ زہر اور پیٹرول یا مٹی کا تیل ملنا ممکن نہیں ہے۔ اول تو میں کہیں آ جا نہیں سکتا اور کوئی دوسرا لا کر دے گا نہیں۔ دوم یہ کہ اگر میں کسی طرح بازار تک پہنچ بھی جاؤں تو ہر وقت لوگ میرا تعاقب کرتے رہتے ہیں، لوگوں کو میری حالت بھی معلوم ہے اور ان کو شک بھی ہوگا کہ میں خودکشی کر سکتا ہوں۔ اس لیے بس ایک ہی راستہ ہے۔ چھت سے کود کر خودکشی کر لوں۔ اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اگر کوئی چھت پر دیکھ بھی لے گا تو یہی سمجھے گا کہ ایسے ہی ٹھنڈی ہوا کے لیے اوپر گیا ہوگا اور اگر کسی کو شک بھی ہو گیا تو اس سے پہلے کہ کوئی میرے قریب آئے میں کود جاؤں گا۔

یہ سوچ کر طالب ہاسٹل کی عمارت کی چھت کی طرف چل پڑا۔ تیسری منزل سے اس نے نیچے کی طرف دیکھا، مرنے کے لیے بہت کافی اونچائی ہے۔ وہ چھت کے ٹھیک بیچ میں جا کر کھڑا ہو گیا کہ اس کے ایک طرف مشرق ہے اور ایک طرف مغرب۔ اس نے دوڑ لگائی اور چھت کی گگر پر پہنچ کر جست کر کے نیچے کود گیا۔

خون میں لت پت طالب کا جسم نیچے پڑا ہوا ہے، لوگ اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگ ایمبولینس کو فون کر رہے ہیں، کچھ کا کہنا ہے کہ اب ایمبولینس کو فون کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہ مر چکا ہے۔ کچھ وارڈین کو بلانے گئے ہیں۔ گرتے وقت وہ بالکل سیدھا سیدھا گرا تھا، پیروں کے بل۔ زمین سے ٹکرانے کے بعد اس کا ایک پیر جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا پیچھے کی طرف گھوم گیا تھا جس سے وہ پوری طرح سے مڑا ہوا اس کے جسم کے نیچے دبا ہوا تھا، دوسرا پیر سامنے چلا گیا تھا، اس کا بدن داہنی طرف تھوڑا جھکا ہوا زمین پر سیدھا گرا تھا۔ داہنا ہاتھ بہت زیادہ مڑا ہوا ہے اور سر بھی داہنی طرف کو تھوڑا جھکا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ پر زخم ہو گئے ہیں اور پورا جسم لہولہان ہو چکا ہے۔

وارڈن نے آ کر بتایا ایمبولینس چل چکی ہے اور پہنچنے والی ہوگی۔ کہ تبھی کسی نے کہا، ''امبولینس آ گئی۔'' سارے لوگ ادھر دیکھنے لگے۔ طالب نے آنکھیں کھول دیں لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔

زندگی اور موت کے بیچ جھولتے ہوئے طالب کے دو دن ایمس میں گذر گئے۔
تیسرے دن ڈاکٹر نے اعلان کیا۔
''طالب مفلوج ہے، لیکن زندہ ہے۔''

انکیوبیٹر

(اپنی بیٹی صحیفہ کے لیے ...... جو دو برس کے سفر میں
اتنا کچھ دے گئی جو پوری زندگی پر بھاری ہے)

— مشرف عالم ذوقی

نرسری

سیمون دبووار (Simone De Beauvoir) نے کہا تھا۔

''عورت پیدا نہیں ہوتی، بنائی جاتی ہے۔''

لیکن، نیل پیدا کہاں ہوئی تھی۔ نیل تو بن رہی تھی۔ نیل تو ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ شاید اسی لئے، پیدا ہوتے ہی وہ ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال بھیج دی گئی تھی۔ اُسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے نہیں دیکھا تھا بلکہ کہنا چاہئے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر، جو آپریشن کے وقت یقیناً پاس پاس لیبر روم میں موجود ہوں گے، یا جیسے ڈاکٹروں نے بھی ہنستے ہوئے کہا ہوگا ...... ''وشواس کیجئے — ہم نے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ ہے اور سانس چل رہی ہے۔''

اور ...... ڈاکٹروں کے مطابق نیل پیدا ہو چکی تھی اور سانس بھی چل رہی تھی ...... اور اب صرف اس کے بچائے جانے یعنی زندہ رکھنے کی کارروائی باقی تھی۔ جس اسپتال میں نیل پیدا ہوئی، وہاں نرسری کا کوئی اچھا انتظام نہیں تھا اس لیے ڈاکٹروں نے ایک چھوٹی سی ایمرجنسی میٹنگ کے بعد نیل کو ایک دوسرے اسپتال میں شفٹ کر دیا تھا۔

نیل اسپتال سے گھر نہیں آئی۔ نیل ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال چلی گئی ...... جس ایمبولنس میں اسے دوسرے اسپتال شفٹ کیا گیا، اس میں نیل کے ساتھ رشتے کے ایک بھائی کو بٹھایا گیا۔ واپسی میں اس بھائی سے پوچھا گیا ......

تم نے اسے دیکھا؟

......نہیں

کیوں؟ تم تو امبولنس میں اس کے پاس بیٹھے ہو گے نا؟

...... ہاں بیٹھا تو پاس ہی تھا، مگر!

......مگر کیا؟

وہ نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے......

بھائی سر کھجا رہا تھا۔ آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

مدر نرسری میں سب کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسپتال کی پانچویں منزل پر یہ نرسری آباد تھی۔ نومولود، ابھی ابھی پیدا ہوئے بچے کی آرام گاہ...... یہ پورا ہال ہی ایئر کنڈیشنڈ تھا...... اندر شیشے کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا...... شیشے کے اس عجیب وغریب ڈزنی لینڈ میں چھوٹے چھوٹے لاتعداد انکیوبیٹر پڑے تھے...... چھوٹے چھوٹے شیشے کے گھروندے ...... ان گھروندوں میں ایسے نومولود بچوں کے لیے ایک نقلی دنیا آباد تھی یعنی جیسی دنیا وہ آنکھیں جھپکاتے ماں کی کوکھ میں دیکھتے یا محسوس کرتے ہوں گے۔ شیشہ کی اس چھوٹی سی دنیا کے اندر کا ٹمپریچر بھی وہی تھا جو وہ ماں کی کوکھ میں محسوس کرتا تھا...... انکیوبیٹر میں آکسیجن کی ٹیوب بھی لگی تھی۔ مگر دور سے، شیشے کے بڑے دروازے سے جھانکنے پر، یہ ڈھیر سارے چھوٹے چھوٹے گھروندے ہی لگتے تھے......

'نیل کہاں ہے؟'

مدر نرسری دکھانے والا ڈاکٹر جوش میں ہاتھ کے اشارے سے کچھ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا......

'وہ...... وہ رہی نا......'

......وہ......موٹا سا بچہ......

'نہیں اس کے پاس والا......'

......اچھا، وہ جو بے بی الٹی پڑی ہے......

'نہیں، اس کے دائیں طرف دیکھئے۔'

......وہ۔ مگر وہ انکیوبیٹر تو......

'خالی ہے' ......ڈاکٹر مسکرا رہا تھا۔ 'وہ بن رہی ہے۔ وہ ہے اور آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'

☆☆☆

واپس اسپتال آکر میں نے اس کی ماں کو یہ مژدہ سنا دیا۔ ماں کو اب ہوش آچکا تھا۔ بیٹی ہونے کی اطلاع ڈاکٹر اسے دے چکے تھے۔ یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ وہ مدر نرسری بھیج دی گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر ماں کی آنکھوں میں تجسس کے دیئے ٹمٹما اُٹھے۔

......تم نے دیکھا۔

ہاں

......کیسی ہے وہ......؟

وہ...... ہے......یعنی کہ......

کس پر گئی ہے......

......گئی نہیں ہے، بن رہی ہے۔ گھبراؤ نہیں، جب تک تمھیں مکمل طور پر گھر جانے کی اجازت ملے گی، وہ بن چکی ہوگی......

''مطلب؟''

......فکر مت کرو۔ وہ بن رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے، ہاں تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا، وہ تمہارے سامنے آکر کھڑی ہو جائے گی۔ وہ خوب زور سے چیخے گی اور تم چہرے کو انتہائی سنجیدہ بنا کر کہو گی......نیل۔ بی ہیو یور سیلف۔

لیکن، ماں شاید اب کچھ بھی سن نہیں رہی تھی۔

ماں ایک لمبی خاموشی میں ڈوب گئی تھی۔

ترپتی مینن کے دو رنگ (ادب اور آرٹ)

ترپتی مینن ...... ایک ایسی خاتون جن کے بارے میں، میں بار بار الگ الگ نظریے گڑھتا تھا اور نظریے کچی مٹی کے گھڑے کی طرح ٹوٹ جاتے تھے......نہیں، مجھے اچھی طرح

یاد نہیں کہ ہماری پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی یا ترپتی مینن میں یاد رکھی جانے والی کون سی ادا یا بات تھی کہ میں نے پہلے پہل اپنی نوٹ بک میں...... پھر آہستہ آہستہ اس کی 'اول جلول' اداؤں کو دل کی گرہ میں باندھ لیا......

'چلو خالی وقت کا ایک سامان تو ہوا......'

پہلی بار میں ہم بہت کم بولے تھے...... مجھے یاد ہے، اس وقت بھی ہمارے مکالمہ کا عنوان عورت تھی۔ وہ ایک ہندی میگزین میں اپنی کہانی چھپوانے آئی تھی۔ میگزین کے ایڈیٹر میرے بزرگ دوست تھے...... آنکھوں پر کالا چشمہ۔ بڑھی ہوئی داڑھی...... نام تھا، رادھیکا رمن۔ رادھیکا جی درویش صفت مُنش ہیں۔ مگر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں بقول رادھیکا جی، کہ 'چٹکی' لینے کی خواہش زور پکڑنے لگتی ہے...... چائے آگئی تھی۔ ترپتی مینن آہستہ آہستہ چائے کی سپ لے رہی تھی۔ دھیان کہیں اور تھا۔ آنچل ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ سانولی بانہیں...... نیم عریاں، آدھی سوئی ہوئی بہار کے قصّے سنا رہی تھی۔ چہرے پر ایک تیکھی مگر بچوں جیسی مسکراہٹ تھی۔ ترپتی بار بار رادھیکا جی کے مذاق کی عادت پر پسری جا رہی تھی۔

عورت میں ہر بار ایک نئی عورت آجاتی ہے...... یہ رادھیکا جی تھے۔

عورت میں ہر بار ایک عورت گُم ہو جاتی ہے...... یہ میں تھا۔

عورت...... آپ لوگ اسے عورت کیوں نہیں رہنے دیتے...... یہ ترپتی تھی۔

☆☆☆

میں نے پہلی بار اداؤں میں ڈوبے اُس کے جسم کا جائزہ لیا۔ اس جسم میں کتنی بہاریں قید ہوں گی۔ چالیس...... چالیس بہاریں۔ مگر ترپتی جانتی تھی، خزاں سے پہلے اس بہار کی کیسے حفاظت کرتی ہے۔ مگر ہر بار نوخیز اداؤں کی گرفت میں اس کا پورا وجود ایک 'جوکر' میں تبدیل ہوا جا رہا تھا۔

''تم اپنی عمر کو نہیں بھولی ہو......'' رادھیکا جی نے پھر چٹکی لی۔

''عمر کو......''

میں آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا......

''میں سمجھی نہیں......'' ترپتی کے سانولے چہرے پر بجلی دوڑ گئی تھی۔

''سب سمجھتی ہو تم۔ گھر سے چلتے ہوئے عمر کو کسی لاک اَپ میں بند کر کے آتی ہو......
پھر واپس آ کر جب عمر کو لاک اَپ سے نکالنے کی کوشش کرتی ہو تو......'' رادھیکا رمن مسکرائے
''...... یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے ترپتی۔ تمہاری جیسی تمام عورتوں کا مسئلہ ہے۔''
''نہیں۔ سر، میرا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''
''اور مینن؟''
''ہم نے لو میرج کی ہے......''
''لو (Love) تم نے کیا تھا یا مینن نے کیا تھا......'' رادھیکا رمن زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے بولے......

نیم عریاں شانے پر اس نے آنچل پھر سے برابر کر دیا تھا...... ''اب ...... اب میں چلوں گی سر۔ کہانی دیکھ لیجئے گا۔''

چہرے پر ناراضگی تھی۔

''ارے بیٹھو......''

''نہیں سر۔ آج آپ کچھ زیادہ ہی مذاق کر رہے ہیں۔''

اس نے کرسی خالی کر دی۔ گولڈن کلر کا بیگ شانہ سے لٹکایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دروازے سے اوجھل ہو گئی......

ترپتی ناراض ہو گئیں...... میرے لیے یہ پہلا اتفاق تھا۔

رادھیکا رمن ہنس رہے تھے...... ''پاگل مت بنو۔ ترپتی کو تم نہیں سمجھو گے...... ہو ہو...... وہ یہی کرتی ہے۔ عادت ہے اس کی...... ہو ہو...... دراصل وہ چاہتی بھی یہی ہے۔''

''کیا۔''

''جو میں نے کیا......'' وہ مسکرا رہے تھے۔

''مطلب؟''

''ارے۔ اس میں حیرانی کی بات کیا ہے۔ اپنشدوں میں کہا گیا ہے۔ ناری کو نہ سمجھو تو بہتر ہے...... ناری سمجھنے کی وستو نہیں ہے۔ رہسیہ ہے، گھور رہسیہ...... ترپتی اسی رہسیہ کا حصہ ہے...... ایسا نہیں کرو تو وہ ناراض ہو جاتی ہے۔ ناراضگی پر کیوں جاتے ہو۔ اس میں پراکرتک سوندریہ کیوں نہیں، دیکھتے۔ ...... اس آیو میں بھی ...... تم نے دیکھا ...... سانولے جسم میں

سارے سمندر کی 'سنہلی'، مچھلیاں ایک ساتھ کہاں جمع ہوتی ہیں ...... ان ساری 'سنہلی' مچھلیوں کو جوڑ کر تر پتی ایک بہت لمبی، سنہلی، مچھلی بن گئی ہے۔''

وہ ہنس رہے تھے ......''اس مچھلی کے پیچھے دوڑو گے ...... بولو ......؟''

☆☆☆

لیکن مجھے زیادہ دور تک دوڑنے کی ضرورت نہیں پڑی ......

یہ تر پتی سے میری دوسری ملاقات تھی۔

وہ کارلٹن آرٹ گیلری میں کھڑی تھی ...... ایک لمحے کو میں نے اس سے چھپنے کی کوشش کی — وہ کسی کو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔

''انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹس سے کمرشیل ڈیزائن کا کورس کیا ہے۔ آرٹ میرا شوق نہیں ہے۔ زندگی ہے، سانسیں ہیں، آئل ان کینوس کے علاوہ آئل آن پلائی وڈ، واٹر کلر پیسٹل، پین اینڈ انک، پلاسٹر آف پیرس، سیمنٹ آن گلاس وغیرہ میڈیمز میں کام کر چکی ہوں۔''

درمیان میں اس کی کھنکدار ہنسی گونجی —

''پچھلی بار فیسٹیول آف ویمن سیریز میں، میں نے بھی اپنی کچھ تصویروں کی نمائش لگائی تھی۔''

میں ایک دم سے چونک گیا تھا ......

موٹے بھدے جسم والی خاتون نے حیرت سے دریافت کیا ......'' آپ ...... یعنی آپ بھی۔''

''کیوں'' تر پتی مسکرائی ہے ......'' آئل ان کینوس۔ کبھی کبھی کینوس پر صرف آئیل بچتا ہے اور عورت آئیل کی طرف پوچھ ڈالی جاتی ہے ...... نہیں؟ ایک کورا کینوس ...... میں نے عورت کے 'رحم' کو دکھانے کی کوشش کی تھی۔''

''رحم ......؟''

''رحم مادر یعنی 'Womb' ...... جہاں نو مہینہ تک بچے کے روپ میں ایک مرد سڑتا ہے۔ پتہ ہے۔ میرے شوہر تک جب اس نمائش کی بات پہنچی تو وہ پانچ مہینے تک مجھ سے غصہ رہے تھے۔ بات چیت کمپلیٹلی بند۔ میں نے بھی کوشش نہیں کی ...... عورت کا ننگا بدن۔ آپ دکھانا ہی

چاہتے ہیں تو وہ جگہ کیوں نہیں دکھاتے جہاں سے سرشٹی، یعنی ایک عورت Creator بنتی ہے۔ رچیتا، مرد کو جننے والی، خالق، اب یہاں دیکھئے نا......

وہ آرٹ کے عریاں فن پاروں کو دکھا رہی تھی۔

''دکھانا ہے تو عورت کو پورا پورا ننگا کرنے سے کیا حاصل۔ بس وہ جگہ دکھا دو جو مرد دیکھنا چاہتا ہے۔''

''مائی گاڈ۔ ترپتی۔ تم میں کتنا دکھ بھرا ہے۔ Leave it یار۔ پینٹنگس دیکھتے ہیں۔''

ترپتی اچانک مڑی تھی...... مڑی اور چونک گئی۔ میری طرف دیکھا۔ مسکرائی۔ ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''آپ؟''

''مجھے نہیں ہونا چاہئے تھا......!''

''نہیں۔ ہونا کیوں نہیں چاہئے تھا۔'' وہ جھینپ رہی تھی...... ''کب آئے؟''

شاید وہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ آپ دیر سے تو نہیں ہیں۔ ہماری بات تو نہیں سن رہے تھے۔ میں نے جھوٹ بولنے ہی میں عافیت سمجھی......

''بس۔ ابھی آیا۔''

''اوہ۔'' ترپتی کو تسلی ملی تھی...... موٹے جسم والی عورت سے پیچھا چھڑاتے ہوئے اب وہ میرے ساتھ پینٹنگس پر اپنی تنقیدی نظر ڈال رہی تھی۔

''اچھی ہیں نا......''

''ہاں''

''دراصل۔'' وہ کہتے کہتے ٹھہری...... ''مجھے موڈس والی پینٹنگس کچھ زیادہ ہی پسند ہیں۔ اینچنگ ورک، فیگر ٹیو ورک اور ریئلسٹک اپیروچ مجھے پسند ہیں۔ ان تصویروں میں امپریشن ازم کے پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''کیوں......'' میں تعجب سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک سانس میں اپنی معلومات کی توپ چھوڑتی چلی گئی۔ وہ کمپوزیشن اچھا ہے۔ فلاں غلط، وہاں کینواس کی سطح کم

گاڑھی ہونی چاہئے تھی، فلاں تصویر میں Base بناتے ہوئے ٹیکسچر دینے کی کوشش کی گئی ہے، ناہموار سطح پر پاورفل اسٹروکس کے ذریعہ رنگوں کا خوبصورت استعمال کیا جانا چاہئے تھا......

''رنگ......'' میں نے ایک لمبی آہ کھینچی تو وہ چونک گئی۔

''زندگی سے رنگ جھڑ جائیں تو......؟''

''آرٹ گیلری سے باہر بھی ملاقات کا ایک راستہ جاتا ہے۔''

وہ اداس ہوگئی تھی...... ''Sorry''

''Sorry کیوں؟''

''تمہارا نمبر ہے؟''

''نمبر۔''

''میں فون کرلوں گی۔''

اس کے جسم میں تھرتھراہٹ تھی...... پرانی ترپتی غائب تھی...... میں ایک نئی ترپتی کو دیکھ رہا تھا جو ڈر رہی تھی...... یا ڈرنے کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

رادھیکا جی کے لفظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ 'ناری گھور رہسیہ ہے۔ ترپتی اس رہسیہ کا حصہ ہے......'

میں نے ترپتی کو نمبر لکھوا دیا......

آرٹ گیلری سے سڑک دو الگ الگ دشاؤں میں مڑ گئی تھی۔

آثار قدیمہ اور ترپتی کا تیسرا رنگ (میوزک)

صحافیوں کے لیے یہ دنیا ایک سیپ کی طرح ہے۔ یہ بات کس نے کہی تھی، یاد نہیں۔ لیکن میں فرصت کے اوقات میں اس بارے میں سوچتا ہوں تو اپنی ذات سیپ کی 'ڈگی' میں بند 'گھونگھے' سے زیادہ نہیں لگتی......بس بھاگتے رہو...... بھاگتے بھاگتے تھک جاؤ تو اپنی چھوٹی سی دنیا میں بند ہو جاؤ اور آپ جانئے ...... فری لانس جرنلسٹ کو کیسے کیسے محاذ پر لڑنا ہوتا ہے......

اس دن طبیعت ناساز تھی لیکن میگزین کی طرف سے 'بھارت سنگاپور اتسو' میں شامل ہو کر اس کی رپورٹ تیار کرنی تھی۔ بانسری کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ بچپن کے دنوں میں ہونٹوں سے لگایا ہو، اب یاد نہیں۔ لیکن ہری پرساد چورسیا میں میری دلچسپی ضرور تھی...... اور یہی دلچسپی مجھے اس

اُتسو میں کھینچ کر لے گئی تھی ...... فکّی آڈیوٹوریم کا مین ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسی نے مجھے ذرا سا دھکا دیا اور تیز تیز اندر کی طرف قدم بڑھائے۔ میں غصہ میں کچھ بولنا چاہتا تھا کہ ٹھہر گیا۔

''ترپتی۔''

☆☆☆

یہ ترپتی سے میری تیسری ملاقات تھی۔ شو شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ میں برابر اس پر نظر رکھے ہوا تھا۔ وہ ہال میں ہو کر بھی ہال میں نہیں تھی۔ کسی چور جیسی، اپنی سیٹ پر دُبکی ہوئی تھی ...... بلی کی طرح سہمی ہوئی۔ آہٹ سے ڈر ڈر جانے والی۔ شو ختم ہونے کے بعد میری نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ گیٹ کے پاس ہی میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''آہ ترپتی۔ یہاں بھی تم۔''

''ہاتھ چھوڑو ......'' اس کے لہجہ میں سختی تھی ...... ''میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ میں خود تم سے ملنے والی تھی۔''

میں نے ہاتھ ہٹالیا ...... ''شو کیسا لگا تمہیں؟''

وہ ابھی بھی کہیں اور تھی۔ بھیڑ سے الگ ہم باہری گیٹ سے دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ نکلنے والی گاڑیوں کا شور انسانی شور سے کہیں زیادہ تھا۔

''بہلانے آئی تھی خود کو۔ مگر بور ...... انڈین اوشن کے اس 'بینڈ' کو دیکھا تم نے ......'' اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی ...... ''فن مر گیا ہے۔ ہم دو سنسکرتیوں کو ملا دینا چاہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ ایک جھوٹا تماشہ، تمہیں لکھنا چاہئے۔ بھارتیہ سُروں کا یہ کیسا میل ہے۔ جاز، ریگے، راک، پاپ اور بھارتیہ سنسکرتی کا بریک فاسٹ ملا دیا۔ مکسچر تیار۔ کلچرل موٹف کو نئے ڈھانچہ میں ڈال دیا اور نیو جنریشن کے سامنے پروس دیا۔ یہی 'فیوزن' ہے ...... سکڑتی سمٹتی دنیا کو، پاگل بنا دینے والی میوزک کمپنیوں کا دیا ہوا ودیشی تحفہ ــــ''

''تمہیں فیوزن سے چڑ کیوں ہے؟''

''آپ اسے ویسے کا ویسا رہنے کیوں نہیں دیتے، جیسا کہ وہ ہے۔ لیکن نہیں۔ بات پروفیشنل منافع کی ہے ــــ کنزیومر ورلڈ کی ہے ــــ بازار کی ہے ــــ آپ وہی تہذیب فروخت کریں گے جس کی ودیشوں میں مانگ ہے۔''

اس کی ہرنی جیسی آنکھیں بھی سہم سہم کر ادھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں ..... ''سنو'' اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھاما......

''مینن ایک ہفتہ کے لیے باہر گئے ہیں — ساؤتھ — کل آسکتے ہو۔''

''کس وقت؟''

''شام کے وقت۔''

تیزی سے آتے ہوئے آٹو کو اس نے ہاتھ دے کر روک لیا تھا..... ''مینن غلطی سے گاڑی کی چابی اپنے ساتھ لے گئے۔ آؤ گے نا؟''

اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا۔ آٹو پر بیٹھی اور آٹو روانہ ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں ایک چھوٹے سے کاغذ کی پرچی تھی جس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ ایڈریس اس نے کب لکھا۔ جب وہ ہال میں تھی یا مجھے دیکھ کر وہ پہلے سے ہی مجھ سے ملنے کا من بنا چکی تھی۔

'ناری گھور رہسیہ ے وستو ہے'...... مسکراتے ہوئے میں نے کاغذ جیب کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

کال بیل کی پہلی آواز پر ہی دروازہ کھل گیا۔ شاید وہ میرے انتظار میں تھی۔ میرے اندر آتے ہی اس نے 'کھٹاک' سے دروازہ بند کر دیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ترپتی کے چہرے پر اب بھی ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''مینن صاحب کب آئیں گے؟''

''پتہ نہیں''

میں نے گھر کی سجاوٹ پر ایک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا...... ''مینن صاحب کرتے کیا ہیں؟''

ترپتی بجھ گئی تھی۔ آہستہ سے بولی۔ ''ان کا تعلق محکمۂ آثار قدیمہ سے ہے۔''

ترپتی مینن کی آواز اس بار برف کی طرح سرد تھی...... ''وہ ہر بار کچھ نہ کچھ برآمد کر لیتے ہیں۔ محنتی اور سخت — صرف اور صرف اپنے کام پر یقین رکھنے والے — لیکن ہر بار...... مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ......''

''جیسے؟''

''کوئی ...... قدیم تہذیب — قدیم شہر......'' ترپتی مینن نے اپنی زلفوں کو جھٹکا دیا — آنچل اُس کے سیاہ جمپر سے پھسل کر گود میں آگرا تھا — لیکن ترپتی نے آنچل کو اٹھانے کی

زحمت نہیں کی۔ اُس کی عریاں باہیں نمایاں تھیں۔ ’صندلی‘ برہنہ بازوؤں کے گوشت آہستہ آہستہ چنگاریاں دینے لگے تھے۔ ترپتی کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

’’وہ باہر کچھ نہ کچھ برآمد کر لیتا ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے۔ وہ آج تک مجھے برآمد نہیں کر پایا۔ اپنی بیوی کو......‘‘

ترپتی نے جیسے اپنے آنسو پوچھے ہوں! دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے جذباتی لہجے پر قابو پالیا تھا۔ ’’ارے میں تو بھول ہی گئی۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’آپ پہلی بار آئے ہیں اور شاید......‘‘ اس کا لہجہ اداس تھا۔

’’مینن صاحب ہوتے تو......‘‘

’’میں ہمت تو کُجا، سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

پتہ نہیں۔ وہ مسکرائی...... ’’پہلے چائے۔ آپ چائے لیں گے یا کافی۔‘‘

’’کچھ بھی چلے گا۔‘‘

☆☆☆

ترپتی کیبن میں گئی تو میں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیوار پر دو خوبصورت بچوں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ کمرے میں ایسا بہت کچھ تھا، جو ترپتی کے ذوق وشوق کی کہانیاں بیان کر رہا تھا— دیوار پر ٹنگی تصویروں میں ایک بچہ کم از کم تیرہ سال کا ہوگا۔ دوسرا دس کے آس پاس۔ ترپتی تو اتنی عمر کی نہیں لگتی۔ کیا پتہ! ساؤتھ کے رتی رواج اور کلچر کے بارے میں ہم ابھی بھی کتنے انجان ہیں۔

ترپتی کافی لے کر آئی تو میں نے دیوار کی تصویر کی طرف اشارہ کیا—

’’میرے بچے ہیں۔‘‘ ترپتی نے سر جھکالیا۔

’’تمہارے یا مینن کے؟‘‘ میری آنکھیں اس کی آنکھوں میں سما گئی تھیں۔

’’مینن کے۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی اتفاقیہ طور پر......‘‘ اس کا گلا بھر آیا تھا......

''تم نے کہا تھا، مینن سے تمہاری لو میرج ہوئی تھی۔''

وہ سامنے بیٹھ گئی۔ کافی آہستہ آہستہ سڑکتی رہی ...... ''ہاں لو میرج کی تھی۔ کسی کسی لمحے کا بوجھ ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔ انہی دنوں مینن کی پتنی کا دیہانت ہوا تھا۔ وہ گھر آئے تھے۔ بابو جی سے ملنے۔ اُن دنوں ...... بزنس میں مسلسل گھاٹے کی وجہ سے سارا گھر پریشان چل رہا تھا۔ بابو جی نے مینن کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی، کہ وہ آثار قدیمہ میں ہیں۔ سامنے بیٹھا ہوا آدمی مجھے ایسا ہی کچھ لگ رہا تھا ...... کسی کھنڈر یا قدیم تہذیب سے نکلا ہوا ...... بس میں آہستہ سے مسکرادی۔''

''پھر سودا ہو گیا ......؟''

''ہاں۔ تم اسے سودا بھی کہہ سکتے ہو ...... گھر والوں کو صرف میری فکر تھی۔ میرا کیا ہوگا۔ میں دودھ سے بالائی کی طرف ہٹادی گئی تو سارا نقصان پورا ہو گیا۔ میں مینن کے ساتھ خوش تھی مگر ......''

کافی کا پیالہ اس نے میز پر رکھ دیا۔ میں نے اسے بغور دیکھا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی نائیٹی پہن رکھی تھی۔ نائیٹی کے 'وی' شیپ سے گولائیوں کی پہاڑی جیسی ڈھلانیں ایک بے حد خوبصورت منظر کی عکاسی کررہی تھیں۔ نیلے پربتوں کے درمیان ایک ہلکی سی کھائی برانگیختہ کرنے والی تھی ...... اس نے نظر جھکالی تھی۔

'تحفہ میں دو بچے ملے تھے۔ ان بچوں کی اپنی زندگی تھی ...... اس زندگی میں، میں نہیں تھی۔ میں ایک نقلی عورت بن کر اس زندگی میں داخل ہونے کی کوشش تو کرتی رہی — شاید مینن کو خوش کرنے کے لئے۔ مگر ...... بچوں نے صاف کہہ دیا۔

''ماں بننے کی جستجو میں دوسری عورت ایک فاحشہ بن جاتی ہے۔ فاحشہ ......''

مجھے وہ لمحہ یاد ہے۔ دن تاریخ یاد ہے ...... چودہ فروری ویلنٹائن ڈے — رات سات بج کر بیس منٹ ...... فاحشہ ...... بچوں کے لفظ چہرے پر آکر جھرّیاں بن گئے — پل میں خوشیوں کے انگور سوکھ کر کشمش ہو گئے — مجھے لگا بچوں نے ریوالور کی تمام گولیاں میرے بدن میں اتار دی ہیں۔ میں چیختی ہوئی غصے سے پلٹی تو وہیں کنارے میز پر — جلتے ہوئے لیمپ کی روشنی میں مینن بہت سے کوڑے کباڑ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا ......

''تم نے سنا'' میں روتی چیختی ہوئی زور سے گرجی تھی۔

''ہاں سنا۔ مگر یہ دیکھو...... یہ......'' اس کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہیں تھی ...... میں سانسوں کے رتھ پر سوار تھی ...... جیسے لکڑی کے 'سانچے' سے — لحاف میں روئی بھرنے والے — روئی دُھنکتے ہیں۔ میں سانسیں 'دھنک' رہی تھی ...... مینن کہہ رہا تھا۔ ''یہ دیکھو......''

میں دیکھ رہی تھی۔ میز پر کباڑ پڑا تھا...... ہاں کباڑ۔ جیسے کبھڑیا گندہ نالا صاف کرنے والے پرانی ٹوٹی پھوٹی اشیاء کو دھو پوچھ کر رکھ لیتے ہیں......

میں سانسیں 'دُھن' رہی تھی ...... ''ان بچوں نے مجھے......''

''رنڈی کہنے سے کوئی رنڈی نہیں ہو جاتا ...... سنا تم نے ......'' اس کا چہرہ تاثر سے عاری تھا۔ میں نے ایک تیز چیخ ماری ...... غصّے میں میز الٹ دی۔ دوسرے ہی لمحے مینن کے لات جوتوں کی زد میں تھی۔ وہ مجھے ویسے ہی دُھن رہا تھا جیسے لحاف میں پرانی روئی بھرنے والے...... وہ مجھ پر سڑی گلی گالیوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ بچے مشینی انداز میں پڑھائی کرنے میں لگے تھے۔

مینن چیخ رہا تھا ...... ''جاہل عورت۔ پتہ ہے تم نے کیا کردیا— تہذیب۔ قدیم تہذیب ...... ارے آرکیا لوجیکل سروے سے ملی تھیں یہ نادر چیزیں — بدقسمت عورت۔ برسوں کی کھوج کے بعد تو یہ خزانہ ملا تھا۔ ہم جس کے لیے مدتوں بھٹکتے رہے ہیں۔ تال سے پاتال تک ...... اسٹوپڈ ...... ڈاٹر آف سوائن۔ بچ ......'' اس نے مجھے دیوار کی طرف ڈھکیلا ...... ''شکل دیکھی ہے...... بچے ٹھیک کہتے ہیں۔ بچے کوئی غلط نہیں کہتے......''

''میں فاحشہ ہوں'' ...... تڑپی، اچانک میرے سامنے آکر تن گئی تھی— اتنے قریب کہ میں سانسوں کی سرگم سننے لگا تھا...... میں فاحشہ ہوں ...... میرے بدن کے 'تاروں' سے روئی کے گولے بکھرتے چلے گئے۔ اس نے نائیٹی ہوا میں اڑا دی ...... میں نے اسے مضبوط بانہوں کے شکنجے میں لے لیا۔

'روئی دھننے والے' کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتی ہوئی ایک دم سے کھوگئی — وہ اٹھی۔ نائٹی پہنی۔ دل کھول کر مسکرائی۔ میرے گالوں کو پکڑ کر زور سے بوسہ لیا۔ آہستہ سے بولی — تھینک یو۔'' واش بیسن پر پانی کے دو چار چھینٹے چہرے پر مارے، پھر مسکراتی ہوئی سامنے آکر بیٹھ گئی......

میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''وہ بچوں کو بھی لے گیا......؟''

''ہاں۔ میرے پاس اکیلے رہنے سے وہ اور بچے دونوں ہی خود کو اِن سکیور فیل کرتے ہیں۔''

''شاید اسی لیے تمہاری آتما بھٹکتی رہتی ہے۔ کبھی میگزین کا دفتر، کبھی آرٹ گیلری، کبھی میوزک ورکشاپ—''

''میں ایک آتر پت آتما ہوں۔'' وہ ہنس رہی تھی ...... ''شاید اسی لیے ماں باپ نے مذاق کے طور پر میرا نام ترپتی رکھ دیا۔''

میں نے کپڑے پہن نہیں لیے تھے— وہ اچانک اٹھی۔ بے اختیار ہو کر ایک بار پھر میرے جسم سے لگ گئی۔ وہ رو رہی تھی۔

''ترپتی ...... ترپتی'' ...... میرے ہاتھ بارش بن گئے تھے ...... اُس کے جسم کے لیے ...... اس کے تھرتھراتے مچلتے جسم کے لئے۔ وہ ہر جگہ برس رہے تھے۔ بوسوں کی بارش کر رہے تھے ...... پھر جیسے بجلی تیزی سے گرجی۔ اسے جیسے غلطی کا احساس ہوا ہو۔ وہ تیزی سے پیچھے ہٹی۔ میری طرف دیکھ کر ہنسی ...... پھر بولی ......

''آخر اسے ایک تہذیب مل گئی جس کی کھوج میں وہ برسوں سے لگا تھا۔ ایک قدیم تہذیب ...... یہ اس ڈراونے ویلنٹائن ڈے کے چوتھے دن بعد کا قصہ ہے۔ مسوری، ہماچل وغیرہ میں برف گری تھی شاید۔ سردی اچانک تیز ہو گئی تھی ...... وہ رات کے 3 بجے آیا۔ میں سو گئی تھی۔ عام طور پر جب میں اکیلے ہوتی ہوں بیڈروم میں— تو برائے نام لباس پہنتی ہوں ...... وہ مجھے اٹھا رہا تھا۔ جانوروں کی طرح......''

''ہوہو......اٹھو......اٹھو۔''

''میں نے سمجھا، ایک جانور پیاسا ہے۔ عام طور پر وہ اسی طرح، ایک بے حس جانور کی طرح اپنی بھوک مٹاتا تھا۔ رات کے تین بجے اُٹھا کر اس نے مجھے صوفہ پر بٹھا دیا۔ وہ خوشی سے جھوم رہا تھا۔ 'جھومر' کی طرح مسکراہٹ اس کے پور پور سے روشنی دے رہے تھی۔

''بولو۔ اُٹھایا کیوں۔ میں گہری نیند میں تھی۔''

''مل گیا۔ یوریکا۔'' اسے میرے لفظوں کی، نیند کی فکر نہیں تھی ...... ''تمہیں یاد ہے......''
وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا— میں نے بتایا تھا نا، 1991ء کے آس پاس جرمن سیاحوں کو آلپس کی پہاڑیوں پر ٹہلتے ہوئے انسانی اعضاء ملے تھے۔ یاد ہے؟ وہ بیسویں صدی کی سب سے عظیم دریافت تھی— سب سے عظیم دریافت۔ گیارہ برس بعد— اس کے ٹھیک گیارہ برس بعد۔ آہ تم یقین نہیں کروگی مگر ہم دنیا بدل دیں گے۔ تاریخ نئے سرے سے لکھی جائے گی۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا— گجرات کے ساحل سے 30 کلومیٹر دور کھمباٹ کی کھاڑی میں ایک عظیم خزانہ ہاتھ آ گیا ہے۔ سونو فوٹو گرافی۔ تمہیں یاد ہے نا، چار دن پہلے......''

''جلتے ہوئے گجرات میں، عظیم خزانہ......''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' ...... میرے لہجہ میں ناگواری تھی ...... ''چار دن پہلے، ویلنٹائن ڈے کے دن جو کچھ ہوا میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی۔''

''بھولنا بھی نہیں چاہئے ......'' میبن کے لہجہ میں کہیں بھی دکھ یا اداسی کی جھلک نہیں تھی۔ 'جھومر' جیسے اندھیرے میں سوئچ کی حرکت سے روشنی کی طرح بکھر گیا تھا ......
''سونو فوٹو گرافی سے نکلی تصویریں جب لیب سے باہر آئیں تو ہمیں اچانک احساس ہوا— سمندر میں 40 میٹر نیچے دفن قدیم ترین تہذیب اچانک رنگین ستاروں کی طرح ہماری قسمت سے جوڑ دی گئی ہے...... ایک قدیم شہر، موہن جداڑو کی طرح رہائشی مکانات— سیڑھیوں کی طرح نیچے اترتے پوکھر— تالاب۔''

''اور سب کچھ گجرات کے ساحلی علاقے میں......''

''میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں دیواروں کا خیال رکھتے ہوئے چیخی۔ ''میں بھی ایک عظیم پوکھر ہوں۔ ایک عظیم تالاب ہوں اور انتہائی قدیم۔ تمہیں اس عظیم پوکھر میں بہتے پانیوں کے اشارے کیوں نہیں ملتے؟''

اس نے میری آواز کو نظر انداز کیا ...... وہ بتا رہا تھا۔ تہذیبیں کہیں جاتی نہیں ہیں۔ وقت کے ڈائنا سور انتہائی خاموشی سے انہیں نگل جاتے ہیں— تہذیبیں 'ممی' سے باہر نکلنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ آہ، تم نہیں جانتی ...... میں کس قدر خوش ہوں۔ سمندر کے گہرے پانی میں 90 کلومیٹر کے دائرے تک، اس قدیم تہذیب کی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں— قدیم شہر— ایک پورا شہر ندی میں سما گیا— سندھو گھاٹی کی تہذیب کی طرح۔ یہ شہر اسی طرح کا ہے جیسے

ہڑپا کے برآمدات میں پایا گیا تھا— مٹی کی بنی ہوئی نالیاں۔ پکی سڑکیں۔ چھوٹے چھوٹے مٹی کے گھر۔ پتھر کے تراشے اوزار۔ گہنے — مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن — جواہرات — ہاتھی کے دانت اور......" وہ مسکرا رہا تھا۔ "سب کچھ یعنی 7500 ق۔م۔ یعنی قبل مسیح کا۔"

"یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہو؟"

وہ آگے بڑھا۔ "میرے جسم پر یوں بھی کپڑے اس وقت برائے نام تھے...... اس نے باقی بچے کپڑے بھی جسم سے الگ کر دیئے...... اس لیے کہ...... "میری آثار قدیمہ...... تمہیں اب انہیں کھنڈروں میں بیٹھانا چاہتا ہوں...... لیکن اس سے پہلے تمہارے ان کھنڈروں پر ریسرچ کرنا چاہتا ہوں...... اس نے ایک بھدّی گالی دی۔ مجھے بستر تک کھینچنا چاہا اور شاید......"

وہ ہانپ رہی تھی...... یہ اس کے ساتھ مسلسل، گزر رہے لمحوں کا جبر تھا کہ میں نے الٹا ہاتھ اس کے گال پر جڑ دیا۔

"کتیا......" وہ ہانپ رہا تھا...... "ایک بہت قدیم تہذیب برآمد کرنے کے بعد مجھے تمہارے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے مجھے دھکا دیا اور خود کو بستر پر سونے کے لیے ڈال دیا— میں زمین کے تنہا گوشہ میں دیر تک اپنے آنسوؤں کا شکار ہوتی رہی......

☆☆☆

"پھر کیا ہوا، اس نے تمہیں ڈیوورس دے دیا؟"

"نہیں۔" وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی...... ایسے لوگوں کو جانتی ہوں۔ جان گئی ہوں۔ ایسے لوگ ڈرپوک ہوتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں بہت دور تک دھوپ اور سایہ دیکھنے والے...... ایسے لوگ قدم قدم پر ان سکیورٹی کے مارے ہوتے ہیں — مینن بھی ایسے ہی جذبہ سے دوچار تھا— میرے بعد......؟ اپنی، جسمانی اور بچوں کی...... تڑپتی مینن میری طرف مڑ گئی تھی۔ تمہیں کیا لگتا ہے ایسے لوگ جیت سکتے ہیں؟ نہیں...... کسی ایک لمحے کا— بولا گیا سچ ان کی اپنی ذات پر بھاری پڑتا ہے۔ دوسرے دن وہ ایک سدھا ہوا بلڈاگ بن گیا تھا— میرے قدموں پر لوٹتا ہوا۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

ترپتی آگے بڑھ کر کھڑکی کے پٹ کھول رہی تھی۔ باہر رات کی سیاہی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ تیز ہوا کے جھونکے کھڑکی کھولتے ہی اندر ہمارے جسموں میں داخل ہو گئے۔

''ہوا تیز چل رہی ہے، نہیں؟''

''ہاں۔''

''باہر کہرے کا احساس چہرے پر کیسا لگتا ہے۔ آں؟ جیسے ایک نم سی ٹھنڈی، روئی آپ کے چہرے پر رکھ دی گئی ہے...... ہے نا؟''

وہ پھر مسکرائی — میں کہاں تھی۔ ہاں، یاد آیا۔ وہ ایک سدھے ہوئے بلڈاگ کی طرح اپنے نتھنے، میرے جسم پر رگڑ رہا تھا۔ کتا — مجھے ابکائی آ رہی تھی۔ تیز نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سیکس کے بخار میں جل رہا تھا۔

''پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ کل رات ...... معاف کر دو ترپتی'' اس کے کھردرے، بن مانس جیسے ہاتھ میرے جسم پر مچل رہے تھے۔ وہ میرے کپڑے کھول رہا تھا۔ میں نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ میمنے کی طرح معصومیت سے، اپنے غصّے کو دبائے اس کے جانور نما پنجوں کا کھیل دیکھتی رہی ...... جب وہ میرے کپڑے اتار چکا اور کسی جنگلی بھیڑیے کی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے تیار تھا — ایک دم اسی وقت، میں کسی جنگلی بلی کی طرح غرائی — دھب سے زمین پر کود دی — غصّے میں اسے پرے ڈھکیلا — کپڑے پہنے اور چلائی۔

''یو، سن آف بلڈی سوائن۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی ......؟''

وہ جل رہا تھا۔ وہ اپنے بدن کی آگ میں جل رہا تھا۔ وہ گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اپنے بھوکے بدن کی دہائیاں دے رہا تھا۔ میں کسی فاتح کی طرح مسکرائی۔ اس بار اسے سیراب کرنے کے لیے میں نے سکندر بادشاہ کی طرح فتح کا سہرا اپنے سر لکھ لیا تھا......

ترپتی نے کھڑکی بند کر دی ...... ''چلو، اس حادثے کو بھی بھول گئی میں ...... بھولنا پڑتا ہے۔'' وہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ میری جانگھوں پر بیٹھ گئی۔

''سنو۔ تمہارے یہاں کون کون ہیں؟''

''ملوگی؟''

''ہاں۔ ملنا چاہوں گی۔''

''میین آ گئے تو؟''

''اب میں اسے ڈرانا چاہتی ہوں ــــ وہ میرے شرٹ کے بٹن سے کھیل رہی تھی۔ کھیلتے کھیلتے خود بولی......

''ایک بیوی ہوگی!''

''ہاں''

''اسے بتاؤ گے کہ تم سے ایک ندی کی لہر ٹکرائی تھی ــــ''

''نہیں''

''ڈرتے ہو۔''

''ڈرنا پڑتا ہے۔ بیویاں صرف ایک سمندر......سمندر کی صرف ایک لہر سے واقف ہوتی ہیں ــــ دوسرے لفظوں میں کہوں تو وہ ساری لہروں پر خود ہی حکومت کرنا چاہتی ہیں۔''

وہ ہنس رہی تھی......''اور کون ہے؟''

''ایک بیٹا''

''کتنے برس کا؟''

''آٹھ برس کا''

''اور......''

میں نے اسے جانگھوں سے پرے کیا۔ شریانوں میں گرم گرم طوفان کی آمد سے خود کو بچانا چاہتا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں۔ اور کون ہے......''

''ایک بیٹی ہے۔ مگر......''

''مگر......؟''

''نہیں۔ وہ ہے نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ بن رہی ہے......بس وہ بن رہی ہے اور ایک دن یقین جانو وہ پوری طرح بن جائے گی۔''

اس نے چونک کر تعجب سے مجھے دیکھا۔

''پہلیاں مت بجھاؤ''

''دراصل ......'' میں نے اپنا جملہ مکمل کیا ...... ''وہ انکیوبیٹر میں ہے اور مسلسل بننے کے عمل میں ہے......''

''کیا مجھے ملواؤ گے؟''

ترپتی نے اپنا بدن ایک بار پھر میرے بدن پر ڈال دیا تھا—

☆☆☆

لفٹ پانچویں فلور پر رک گئی تھی۔ یہ اسپتال کا نرسری وارڈ تھا۔ فلی ایئر کنڈیشنڈ— باہر ایک لمبی راہداری چلی گئی تھی۔ ترپتی نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا— شیشے کے بنے دروازوں سے گزرتے ہوئے ہم 'ماتر توسدن' کے بورڈ کے آگے ٹھہر گئے—

''یہاں جوتے اتارنے ہوں گے۔''

ترپتی کے پاؤں جاپانیوں اور چینی عورتوں کی طرح چھوٹے اور ملائم تھے۔ گیٹ کیپر نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے اندر شیشے کی ایک عجیب سی دنیا تھی۔ ترپتی حیرت سے شیشے کے اس پار دیکھ رہی تھی۔ شیشے کے اس پار بھی شیشے کے کتنے ہی چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے— ایسے ہر گھروندے میں نیلے بلب جل رہے تھے۔

''نیل کہاں ہے؟'' ترپتی کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

وہاں ان گنت انکیوبیٹرس تھے۔ ترپتی کی انگلیاں تیر رہی تھیں۔ وہاں ......''

''نہیں نہیں؟''

''وہ؟''

''وہ بھی نہیں ......''

''اچھا وہ ...... دائیں طرف ......''

''نہیں ......''

''پھر نیل کہاں ہے؟''

''نیل وہ رہی''

''مگر۔ وہ انکیوبیٹر تو خالی ہے ......'' ترپتی چونک گئی تھی۔

''خالی نہیں ہے۔ غور سے دیکھو۔''

''خالی ہے!'' ترپتی کا لہجہ اُداسی سے پُر تھا۔

''ہے نا...... میں نے کہا تھا۔ وہ بن رہی ہے__'' میں نے تر پتی کا ہاتھ زور سے تھام لیا تھا...... یاد ہے ترپتی۔ میں نے کہا تھا، عورت ہر بار بننے کے عمل میں ہوتی ہے۔ ایک بے چین آتما...... ایک یونانی دنت کتھا میں پڑھا تھا__ عورت کی جون میں پرویش سے پہلے، آتما دھرتی کی سو پریکر مائیں پوری کرتی ہے۔ تمہاری آتما بھی بے چین تھی۔ کبھی ساہتیہ، کبھی آرٹ اور کبھی......''

ترپتی میری طرف تیزی سے مڑی۔ ہنستے ہوئی بولی......

''سنو۔ اس انکیوبیٹر میں مینن کو ڈال دوں؟''

''نہیں''

میرا لہجہ نپا تلا تھا...... ''سب سے پہلے ابھی تمہیں اس انکیوبیٹر سے باہر نکلنا ہے۔''

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا...... اس کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا...... لفٹ کے بٹن پر انگلیاں رکھتے ہوئے بھی میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا__

ممکن ہے وہ انکیوبیٹر میں رہ گئی ہو...... یا ممکن ہے شوہر کے آثار قدیمہ میں بھٹک رہی ہو!

مختصر تعارف

ذکیہ مشہدی

تاریخ پیدائش: یکم ستمبر 1946

تعلیم: ایم اے نفسیات

تصانیف: پرائے چہرے، تاریک راہوں کے مسافر (افسانے)

پتہ: A/12، آفیسر فلیٹ، بیلے روڈ، پٹنہ۔ بہار

سلام بن رزاق

تاریخ پیدائش: 15 نومبر 1941 پان ون، رائے گڑھ، مہاراشٹر

تصانیف: ننگی دوپہری کا سپاہی، معبر، کام دھینو (افسانوی مجموعے)

پتہ: 11/9 ایل۔آئی۔جی کالونی، ونوبھاؤ نگر، کرلا (ویسٹ ممبئی)

علی امام نقوی

تاریخ پیدائش: 9 نومبر 1945، ممبئی

تصانیف: نئے مکان کی دیمک، مہابلہ، گھٹتے بڑھتے سائے، موسم عذابوں کا (افسانوی مجموعہ)، بساط، تین بتّی کے راما (ناول)

پتہ: نوح اپارٹمنٹ، 103/54 ینا نگر کاپریٹیو سوسائٹی، میرا روڈ، تھانے۔ مہاراشٹر

شوکت حیات

تاریخ پیدائش: یکم دسمبر 1950

تصانیف: بانگ (زیرِ طبع)
پتہ: ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو۔ پٹنہ۔4

سید محمد اشرف

تاریخ پیدائش: 6 جولائی 1957، سیتاپور (یوپی)
تعلیم: ایم اے (علی گڑھ)
تصانیف: ڈار سے بچھڑے، بادِ صبا کا انتظار (افسانے) نمبر دار کا نیلا (ناول)
پتہ: بڑی سرکار خانقاہ برکاتی، مارہرہ شریف، ضلع ایٹہ۔ یوپی

شموئل احمد

تاریخ پیدائش: 4 مئی 1050
تعلیم: بی۔ ایس سی انجینئرنگ
تصانیف: بگولے، سنگھاردان، (افسانوی مجموعہ)، ندی، مہامارلی (ناول)
پتہ: 301 گرینڈ اپارٹمنٹ، نیو پاٹلی پترا کالونی۔ پٹنہ 13

عبدالصمد

تاریخ پیدائش: 1952 بہار
تعلیم: ایم۔ اے (سیاسیات) پی۔ ایچ۔ ڈی
تصانیف: بارہ رنگوں والا کمرہ، پسِ دیوار (افسانے) مہاتما، دو گز زمین، خوابوں کا سویرا (ناول)
پتہ: 173 پاٹلی پترا کالونی۔ پٹنہ۔13

حسین الحق

تاریخ پیدائش: 1 دسمبر 1949
تعلیم: ایم اے (پی ایچ ڈی)

تصانیف: پس پردۂ شب، صورت حال، گھنے جنگلوں میں، مطلع، سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ (کہانیوں کا مجموعہ)، بولو مت چپ رہو، فرات (ناول)
پتہ: سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا۔ بہار

شفق

تاریخ پیدائش: 1945
تصانیف: بادل، کابوس، کانچ کا بوس، کانچ کا بازی گر (ناول)
پتہ: کبیر گنج، سہسرام۔ بہار

بیگ احساس

تاریخ پیدائش: 1948
تصانیف: حنظل (افسانے)، شور جہاں، کرشن چندر شخصیت اور فن مضامین
پتہ: برائے سب رس، ادبیات اردو، پنج گٹر روڈ، سوما جی گوڑہ، حیدر آباد۔500082، اے پی انڈیا

ترنم ریاض

تاریخ پیدائش: سرینگر کشمیر
تعلیم: ایم۔اے۔ایم۔ایڈ
تصانیف: یہ تنگ زمین، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، یمبرزل (افسانے)، مورتی (ناولٹ)، بیسویں صدی میں خواتین کا ادب (مضامین)
پتہ: C-11 جنگ پورہ ایکسٹنشن، نئی دہلی۔110014

غضنفر

تاریخ پیدائش: 9 مارچ 1953، چورا گو۔ بہار
تصانیف: پانی، کینچلی، کہانی انکل، مم (ناول)

ساجد رشید

تاریخ پیدائش: 11 مارچ 1955، ضلع گونڈا، یوپی
پیشہ: صحافت
تصانیف: رنگوں میں جمی برف، نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، ایک چھوٹا سا جہنم (افسانوی مجموعے)، زندگی نامہ (اخباری کالم)
پتہ: 36/36 آلو پارو بلڈنگ، عمر کھاڑی، کراس لین، ممبئی۔40009

اسرار گاندھی

تاریخ پیدائش:
تصانیف: پرت پرت زندگی، رہائی (افسانوی مجموعہ)
پتہ: J/5 گلاب باڑی کالونی، الٰہ آباد۔3 (یوپی)

طارق چھتاری

تاریخ پیدائش: یکم اکتوبر 1954
پیشہ: ملازمت (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
تصانیف: باغ (افسانے)
پتہ: شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔علی گڑھ

صدیق عالم

تاریخ پیدائش:
تصانیف: چارنک کی کشتی (منظوم ناول)
پتہ:

خالد جاوید

تاریخ پیدائش: 9 مارچ 1973

تعلیم: ایم اے، فلسفہ اور اردو
تصانیف: بُرے موسم میں
پتہ: شعبۂ اردو۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

معین الدین جینا بڑے

تاریخ پیدائش:
تصانیف: تعبیر
پتہ: A-4 نیو اکیڈمک اسٹاف کوارٹرس، 4 یونیورسٹی آف ممبئی، ودیانگری، سانتا کروز (مشرق)، ممبئی400098

رحمان عباس

1990 کے بعد کی افسانوی دنیا کا ایک اہم نام
تصانیف: نخلستان کی دھوپ (ناول)
پتہ: معرفت ساجد رشید، 36/36 آلو پارو بلڈنگ، عمر کھاڑی کراس لین، ممبئی۔400009

نسیم بن آسی

تاریخ پیدائش:
تصانیف: لفظوں کے درمیان (افسانے)
پتہ: کوہ نور جنرل اسٹور، پرمارکٹرہ، مغل سرائے۔232101

رضوان الحق

سن 2000 کے بعد کی نسل کا ایک اہم نام۔ ابھی تک کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں۔
کتھا انعام یافتہ

مشرف عالم ذوقی

تاریخ پیدائش: 24 مارچ 1962

پیشہ: الکٹرانک میڈیا سے وابستگی

تصانیف: نیلام گھر، شہر چپ ہے، ذبح، مسلمان، پو کے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب کی داستان وایا سُنامی، بیان، عقاب کی آنکھیں (ناول)، غلام بخش (ہندی، اردو)، بھوکا ایتھوپیا، منڈی، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، لیبارٹری، صدی کو الوداع کہتے ہوئے، بازار میں ایک رات، فزکس کیمسٹری، الجبرا، امام بخاری کی نیپکین، فرج میں عورت متی روسا لگ رام، شاہی گلدان، مشرف عالم ذوقی کی رومانی کہانیاں (کہانیوں کا مجموعہ)، ایک سڑک ایودھیا، گڈ بائے راجیتی (ڈرامے)، اردو فکشن سنواد کے سات رنگ، اپنا آنگن (تنقیدی مضامین)، سرخ بستی (دو حصے)، وبھاجن کی کہانیاں، فسٹو کی کہانیاں، عصمت چغتائی کی کہانیاں (ترتیب و تہذیب)

پتہ: D-304، تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی۔ 110031

خورشید اکرم

تاریخ پیدائش: 1963

پیشہ: آجکل اُردو کے مدیر

تصانیف: ایک غیر مشروط معافی نامہ، جدید ہندی نظمیں

پتہ: آجکل اردو، سی۔ جی۔ او کمپلیکس۔ نئی دہلی

ابن کنول

تاریخ پیدائش: 1957

پیشہ: درس و تدریس

تصانیف: تیسری دنیا کے لوگ، بند راستے (کہانیوں کا مجموعہ)

پتہ: شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

1970 کے بعد اردو کہانی میں جو نئے موڑ آئے، اسے ترقی پسند تحریک سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ نئے قلمکار اپنی اپنی شناخت کے لیے ادب کی نئی نئی زمینیں تلاش کر رہے تھے۔ یہ وہ عہد تھا، جب اردو میں ایک ساتھ کئی تحریکیں شامل ہوگئی تھیں۔ کوئی ترقی پسندی سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ لوگوں نے نعرہ بلند کیا کہ اب پریم چند کو ریجیکٹ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ کچھ لوگ جدیدیت کے دھارے کی طرف مڑ گئے۔ کچھ روایتی اسلوب پر قائم تھے۔ کچھ اساطیر میں الجھ گئے تو کچھ تجریدی کہانیوں میں نئی کہانیوں کا عکس تلاش کر رہے تھے۔ اس انتخاب میں 1970 کے بعد جو اہم نام ابھر کر سامنے آئے ہیں ان کی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔

اس انتخاب کو مشرف عالم ذوقی نے مرتب کیا ہے۔ ذوقی عہد حاضر کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نیلام گھر، شہر چپ ہے، بیان، بھوکا ایتھوپیا، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، فرج میں عورت، منڈی وغیرہ شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

ISBN 978-81-237-5313-3

قیمت: 110.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا